ترنم ریاض کے
افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ
مرا رخت سفر
ترنم ریاض
یمبرزل
یہ تنگ زمین
ترنم ریاض
زاہد ظفر

ترنم ریاض کے

افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

مرتب

زاہد ظفر

جی۔این۔کے۔پبلی کیشنز

TARANNUM RIYAZ KE AFSANON KA TAJZIYATI MUTALA

Edited by
Zahid Zafar

Year of 1st Edition 2022
ISBN 978-93-91606-64-0
Price Rs. 460.00

نام کتاب	:	ترنم ریاض کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ
مرتب	:	زاہد ظفر
قیمت	:	460 روپے
سنِ اشاعت	:	2022
صفحات	:	365
تعداد	:	500
مطبع	:	جی۔این۔کے۔پرنٹرس، نئی دہلی

Published by
GNK PUBLICATIONS
Head Office : Near Old Bus Stand, Kumar Mohalla
Charari Sharief, Budgam - 191112 (J&K)
E-mail : gnkpublications@gmail.com
www.gnkpublications.com
Mobile : 7006738304

انتساب

جموں کشمیر کے افسانہ نگاروں
کے نام

سوانحی کوائف

نام : زاہد ظفر

ولدیت : ظفر اقبال

پتہ : کیلر شوپیان

تعلیم : ایم اے (اردو) کشمیر یونی ورسٹی

بی۔ایڈ، کشمیر یونی ورسٹی

یو.جی سی نیٹ، سیٹ

پی۔ایچ۔ڈی (جاری)

زیر طبع تصانیف : (۱) عکس میں بیگے لفظ (افسانوی مجموعہ)

(۲) لفظ لفظ (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

(۳) جموں وکشمیر کا نسائی ادب

موبائل/وٹس ایپ : 9906700711

ای میل : zahidzaffar70@gmail.com

کیلر شوپیان : 192303

☆☆

فہرست

مضامین

افسانے اور تجزیے

پیش لفظ

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

جموں وکشمیر کی اردو ادب کی تاریخ جن ادبا اور شعرا کی ادبی خدمات سے روشن نظر آتی ہے، ان میں معروف شاعرہ، فکشن نگار، مترجم اور تنقید نگار ڈاکٹر ترنم ریاض بھی شامل ہیں۔ ایک طرح سے ترنم ریاض کی شاعری اور نثری نگارشات کے معیار نے کشمیر کے اردو ادب کو ایک ایسا معیار عطا کیا کہ اب اس کا ذکر کرنا اردو کی جدید تاریخ کے لئے لازمی بن چکا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ جب قاری ان کی تخلیقات اور مضامین کا مطالعہ کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعی ایک جینوئن تخلیق کار کی تخلیق کا فنی حسن اور اثر آفریں سحر قاری کی سوچ وفکر کو جکڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ان کے شعر وفکشن کا فنی وفکری تخلیقی لمس جمالیاتی رچاؤ سے اسقدر مزین ہوتا ہے کہ قرأت خود بخود کسی فن پارے کو پڑھنے کا اثبات کرتی ہے:

میں بس کر جنگلوں میں طائروں کو سن کے خوش ہوں گی
کہ انسانوں کی آوازیں مجھے اکثر ڈراتی ہیں

شعر کا پیغام تو اپنی ترسیل آسانی سے پیش کر رہا ہے لیکن شعر کی بنت میں تخلیقی پن دیکھنے کی چیز ہے۔ دراصل یہی فن کاری ہوتی ہے جو کسی تخلیق کو فنی جواز عطا کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں کا فنی حسن فن کاری کا عمدہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر ترنم ریاض صاحبہ کی علمی وادبی جہات، تفہیم وتوضیح اور تجزیاتی مکالمہ

باندھنے کا الگ الگ تقاضا کرتی ہیں۔ اس پر کام بھی ہوا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ پیش نظر کتاب ''ترنم ریاض کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' بھی اس سلسلے کی ایک قابل ستائش پہل ہے جو کشمیر کے ہی ایک ہونہار اسکالر زاہد ظفر کی محنت اور صلاحیت کا ثمر ہے۔ قابل تعریف بات یہ بھی ہے کہ خود زاہد ظفر ترنم ریاض کی افسانہ نگاری پر پی۔ایچ۔ڈی کررہا ہے اس لئے انہوں نے کتاب میں شامل افسانوں اور مضامین کے انتخاب میں محققانہ فراست کا عمدہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ چونکہ قرأت کے بعد یہ اطمینان ہوجاتا ہے کہ مشمولات میں معیاری افسانے، مضامین اور تجزیے شامل ہیں، جو کہ کتاب کی معیار بندی میں اضافہ کررہا ہے۔ اس کتاب میں ترنم ریاض کی فکشن نگاری پر چار مضامین کے علاوہ ان کے پندرہ افسانوں کا متن مع تجزیہ بھی شامل ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''کشمیر کی درد آشنا: ترنم ریاض (پروفیسر قدوس جاوید) ''ترنم ریاض کی فکشن نگاری... تخلیقی و ثقافتی جہات'' (ڈاکٹر ریاض توحیدی) ''ترنم ریاض کی ریاضت اور معرفت: ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' (ڈاکٹر عشرت ناہید) '' ترنم ریاض کی افسانوی ریاضت و انفرادیت'' (ڈاکٹر قسیم اختر)..... تجزیے ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم (ڈاکٹر عالیہ کوثر)'' بی بی (رفیع حیدر انجم)'' ''تجربہ گاہ'' (شائستہ بخاری)'' ''آدھے عکس کا چاند'' (ڈاکٹر فریدہ تبسم)'
''ماں صاحب'' (دانش اثری)'' ''چار دن'' (انور ظہیر رہبر)'' ''برآمدہ'' (نیلوفر ناز نحوی)'
''برف گرنے والی ہے'' (زاہد ظفر)'' ''باپ'' (ارشد کسانہ)'' ''پالنا'' (فریدہ نثار انصاری)'
'' اچھی صورت بھی کیا'' (محمد ارمان حسن)'' ''مٹی'' (ڈاکٹر گلزار احمد صدیقی)'' ''تعبیر'' (الیس۔معشوق)'' ''کشتی'' (فیصل کسانہ)'' ''یمبر زل'' (عرفان رشید)۔

جب کسی تخلیق، مضمون، کتاب وغیرہ پر کسی ماہر کی مناسب رائے یا تحریر آتی ہے تو یہ ایک طرح سے اس تخلیق، مضمون یا کتاب کو معیار بخشنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید ایک معروف نقاد ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون ''کشمیر کی درد آشنا: ترنم ریاض'' میں ترنم ریاض کی شخصیت اور ادبی سفر کا عمدہ احاطہ کیا ہے۔ ناول ''برف آشنا پرندے''

کے موضوعاتی کینوس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض نے کشمیر کے مختلف طبقوں کے ان کرداروں کے شعور اور لاشعور میں اتر کر' لامحدود امکانات کے ساتھ جس طرح ان کا Impersonal Narration کیا ہے اس کی بناء پر 'برف آشنا پرندے' کی موضوعی پرواز کشمیر سے شروع تو ہوتی ہے لیکن اس کا آسمان آفاقی ہے۔ اس ناول میں بیانیہ کا ایسا منفرد روپ ملتا ہے جس میں کرداروں کی خارجی زندگی سے کہیں داخلی زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔''

ڈاکٹر عشرت ناہید افسانوی مجموعہ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' کا جائزہ لیتے ہوئے مجموعی طور پر ترنم ریاض کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھنے پر علم ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات آس پاس بکھری زندگی کی چھوٹی بڑی کہانیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔ کہیں وہ عورت کے جنسی استحصال کو موضوع بناتی ہیں تو کہیں بزرگوں کو نظر انداز کرتے معاشرے کو' کہیں نچلے دبے کچلے طبقے کے حالات قلم بند کرتی ہیں تو کہیں نوجوانوں کی نفسیات کو' گھر چہار دیواری سے باہر کی خوبصورتی کے ساتھ سماج کے تمام تر بدصورت مناظر بھی ان کے یہاں جا بجا نظر آتے ہیں جو کہ بدنما داغوں کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔''

اسی طرح ڈاکٹر قسیم اختر اپنے مضمون ''ترنم ریاض کی افسانوی ریاضت وانفرادیت'' میں ترنم ریاض کی فنی ریاضت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...ترنم ریاض کی افسانوی ریاضت نے ان کے لئے تجربات کی راہیں ہموار کردیں۔ تجربات کی جدت اور موضوعات کی ندرت کی بنا پر فن کار اپنی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ ترنم ریاض اس پہلو سے آگاہ تھیں۔

انہوں نے تجرباتی سطحوں پر پھونک کر قدم رکھا اور تہذیبی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے قدم تہذیب اور جدید احساسات کو مدغم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جہاں پرانے معاملات تہذیبی پس منظر میں ابھرتے ہیں، وہیں نئے طور طریقوں سے پیدا شدہ المیہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔"

کتاب کا باقی حصہ ڈاکٹر ترنم ریاض کے منتخب افسانوں اور تجزیوں پر مشتمل ہے۔ جن کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ہر ایک تجزیہ نگار نے منتخب افسانے کا بھرپور جائزہ لینے کی عمدہ کوشش کی ہے، جس سے ایک تو افسانے کے موضوع اور کہانی کی توضیح ہوئی ہے اور دوسرا ان افسانوں کے ساتھ ساتھ ترنم ریاض کی افسانہ نگاری کی فنی خوبیاں بھی اجاگر ہوگئی ہیں۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ تجزیہ کاروں میں سینئر مبصرین و ناقدین کے ساتھ ساتھ نئے اسکالرز اور ادیب بھی شامل ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب ترنم ریاض کی فکشن نگاری خصوصاً افسانہ نگاری کی انفرادیت کو سامنے لانے میں بڑی اہم معلوم ہوتی ہے۔ زاہد ظفر مبارک بادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اتنے معیاری مضامین جمع کر کے کتاب مرتب کی۔ امید ہے کہ وہ تحقیق مکمل کرنے کے بعد ترنم ریاض کی ناول نگاری پر بھی ایک کتاب شائع کریں گے۔ زاہد ظفر ایک محنتی اور باصلاحیت نوجوان ہیں ایک اہم بات یہ بھی کہ وہ صلاح مشورہ کر کے اپنی قابلیت کو نکھارنے کی خوبی رکھتے ہیں۔ کسی بھی موضوع سے متعلق نہ صرف رائے سنتے ہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ مجھے مسرت ہو رہی ہے کہ ہمارے چند نوجوان لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ صحیح ڈگر پر چلتے نظر آتے ہیں، جن میں زاہد ظفر بھی شامل ہیں۔

Cell: 7006544358

اپنی بات

زاہد ظفر

کشمیر کی جن خواتین نے برق رفتاری سے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کی ان میں ترنم ریاض کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ایک ممتاز ناول نگار، کامیاب افسانہ نگار، باوقار شاعرہ اور مترجم ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقیدی اور تحقیقی کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک سچا ادیب وہی کہلاتا ہے جو لوگوں کے دکھ درد کو اپنا مان کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں لفظوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچائے اور ان کے مسائل پر سنجیدگی سے قلم اٹھائے۔ ترنم ریاض نے نہ صرف نسوانی مسائل کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی بلکہ عالمگیر مسائل کو اپنی تحریروں میں اجاگر کیا۔ اسی لیے وہ نہ صرف جموں کشمیر میں بلکہ پوری دنیا میں اپنی شناخت کے نشانات مثبت کیے ہوئے ہیں۔ اگست 2020 میں پہلی بار میں نے ترنم ریاض صاحبہ سے رابطہ کیا جب مجھے اپنے ریسرچ کے لیے ان کی کتابیں درکار تھیں۔ وہ بڑے خلوص اور محبت سے پیش آئیں اور میرے چند سوالات کے جوابات بڑے شفقت آمیز لہجے میں دیے۔ وہ نہ صرف مروت سے پیش آئیں بلکہ اپنی ساری کتابیں مجھے میل کیں۔ ایک ماہ بعد ان کی کال آئی اور انہوں نے اپنی مصروفیت کا حوالہ دیا اور ساتھ ہی پوچھ لیا کہ امید ہے میری کتابیں آپ تک پہنچ گئی ہوں گی۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک مہینہ گزر جانے کے بعد بھی انہیں یہ بات یاد رہی کہ مجھے کسی کو کتابیں دینی تھیں۔ جو شفقت بھرا رویہ انہوں نے

میرے ساتھ روا رکھا میں اس سے از حد متاثر ہوا۔ پھر اکثر ان سے بات ہوتی تھی اور میں
ان سے فون پر ہی ادبی مشورے لیا کرتا تھا۔ وہ جب بات کرتی تھیں تو اندازہ ہوتا تھا کہ
انہیں اپنے مادر وطن سے ہی لگاؤ نہیں ہے بلکہ وہ کشمیریوں سے بھی بہت زیادہ محبت کرتی
ہیں۔ میں نے ان کی شخصیت میں حد درجہ خلوص پایا۔ وہ سراپا محبت کی دیوی تھیں بامروت
اور بے غرض۔

20 مئی 2021 کو جب یہ منحوس خبر کانوں نے سنی کہ ترنم ریاض کا انتقال ہو گیا تو
یقین نہیں ہوا۔ ان کی وفات میرے لیے ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا
صدمہ تھا۔ ترنم ریاض کی رحلت سے جموں و کشمیر کے اردو حلقے میں جو خلا پیدا ہوا وہ پر ہونا
ناممکن ہے۔ اللہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ان کے انتقال کے بعد
میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ ترنم ریاض کو خراج عقیدت پیش کیا جائے اور ان کے
افسانوں پر ایک کتاب مرتب کی جائے۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے
اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر ریاض توحیدی سے بات کی جنھوں نے میرے اس خیال کو
سراہا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ میں نے کام شروع کیا اور کتاب کا
عنوان ''ترنم ریاض کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' رکھا۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں
ہے اس میں میں نے ترنم ریاض کے افسانوں مجموعوں میں سے بہترین افسانوں کا انتخاب
کیا ہے اور ان پر مختلف مصنفین سے تجزیہ لکھوا کر انہیں شامل کتاب کیا ہے۔ پہلے مصنفہ کا
افسانہ شامل کیا اور اس کے فوراً بعد اس پر لکھا گیا تجزیہ۔ یوں قاری کو افسانے کے ساتھ تجزیہ
بھی پڑھنے کو ملے گا تاکہ ان افسانوں کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ اس کتاب میں ترنم ریاض
کے پندرہ افسانوں اور مختلف مصنفین کے پندرہ تجزیئے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ترنم ریاض
کی ادبی خدمات پر چار مضامین بھی شامل کتاب کئے گئے ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر ریاض توحیدی کا شکریہ ادا نہ کروں۔
انہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں نہ صرف اپنا قیمتی وقت دیا بلکہ اپنی انمول آراء سے بھی

مجھے نوازتے رہے۔ میں ان کا مشکور ہوں کہ یہ کام ان کی سرپرستی، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے بغیر ناممکن تھا۔ ساتھ ہی میں اپنے دوست ایس معشوق احمد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے اس کام میں بہت مدد کی۔ اس کے علاوہ میں ان تمام احباب کا بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے میری صدا پر لبیک کہا اور اپنے قیمتی مضامین اور تجزیہ بھیج کر اس کتاب کو رونق بخشی۔ بالخصوص میں پروفیسر سید زین الحق، نور شاہ، وحشی سید، پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر قسیم اختر، عشرت ناہید، انور ظہیر رہبر، رفیع حیدر انجم، نیلوفر نازل نحوی، عالیہ کوثر، ڈاکٹر فریدہ تبسم، دانش اثری، فریدہ نثار انصاری، ڈاکٹر گلزار احمد وانی، محمد ارمان حسن، ارشد کسانہ، فیصل کسانہ، سیدہ شائستہ بخاری، ایس معشوق احمد اور عرفان رشید کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنے ان دوستوں سے معذرت کرتا ہوں جن کے مضامین اور تجزیے کتاب کی طوالت کی وجہ سے شامل نہیں کر پایا۔ خامیاں اور کمیاں بشریت کا تقاضا ہے۔ اس کتاب میں بھی خامیاں اور کمیاں رہ گئی ہوں گی۔ میں اس کا مشکور رہوں گا جو ان کی طرف میرے توجہ دلائے گا۔ ترنم ریاض کی ادبی خدمات کا اس کتاب سے حق ادا نہ ہوگا لیکن مجھے دلی تسکین ہو رہی ہے کہ میں اپنی مربی کے لیے کچھ کر رہا ہوں۔

کشمیر کی درد آشنا: ترنم ریاض

پروفیسر قدوس جاوید

''میرا عظیم وطن، میرا کشمیر، نرم خو، حلیم اور حسین کشمیریوں کی زمین۔ دانشوروں، فنکاروں اور دستکاروں کا خطہ، ریشم و پشم، زعفران زاروں اور مرغزاروں کی سرزمین، پہاڑیوں اور وادیوں کا مسکن، یہ جنتِ بے نظیر، جس کی پانچ ہزار سالہ پرانی تاریخ موجود ہے، جس کی مثال شاید ہی دنیا میں کہیں ملے۔ قدیم ترین زبان و تہذیب کا مرکز کشمیر، رِشیوں، مُنیوں کا کشمیر، شیخ العالم اور لل دید کا کشمیر، شاکیہ منی کی پیش گوئی کا بودھ گہوارہ کشمیر، کشیپ رشی اور پرورسین کا کشمیر، للتا دتیہ اور سوئیہ کا کا کشمیر، اشوک، کنشک، کلہن، اور بڈشاہ کا کشمیر حبہ خاتون کا کشمیر، ارنی مال کا کشمیر۔''

یہ اقتباس، اسی کشمیر کی خاک سے اٹھنے والی ایک غیر معمولی قلم کار خاتون ترنم ریاض کے ناول 'برف آشنا پرندے' سے ماخوذ ہے۔ اس اقتباس کے الفاظ، کشمیر کے تئیں ترنم ریاض کے فخر آمیز عشق اور عقیدت مندی کا مظہر ہی نہیں، اس حقیقت کا اشاریہ بھی ہے کہ 'اٹوٹ انگ' اور 'شہہ رگ' کی دو چکیوں کے بیچ پستی ہوئی کشمیری سائکی، معاشرت، سیاست اور ثقافت کے پاکیزہ منظر نامے کو لہو کی چھینٹوں سے بدنما بنانے کی کیسی کیسی کوششیں اور سازشیں کی گئیں اور صرف 'برف آشنا پرندے' ہی نہیں، کم و بیش ترنم ریاض کی ہر تحریر کسی نہ کسی زاویے سے ان کے وطن عزیز کشمیر کو لازماً مَس کرتی نظر آتی ہے۔

محمد الدین فوق، چراغ حسن حسرت، پریم ناتھ پردیسی اور نور شاہ کے فکشن، اور زینب بی بی محجوب، مہجور، غلام رسول نازکی اور حکیم منظور کے شعری سرمایے کی امین ترنم ریاض کشمیر کے معروف علاقہ 'کرن نگر' میں ایک معزز گھرانے میں (9اگست 1960) کو پیدا ہوئیں۔ اسکول اور کالج کے بعد اول تو انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا اور پھر کشمیر یونیورسٹی سے ہی 'ایجوکیشن' میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ ترنم ریاض کی شادی کشمیر کے مشہور ادیب، پروفیسر ریاض پنجابی سے ہوئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مواقع ملنے کے باوجود ترنم ریاض نے کہیں باضابطہ ملازمت نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب ان کے شوہر مشہور سوشل سائنٹسٹ اور ادیب، J.N.U کے پروفیسر ریاض پنجابی کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر (جنوری 2008، جون 2011) مقرر ہوئے تو کئی شعبوں کی جانب سے آفر کے باوجود ترنم ریاض نے کوئی عہدہ قبول کرنا منظور نہ کیا۔ البتہ وہ کئی یونیورسٹیوں اور باوقار تعلیمی اداروں کے ساتھ 'وزٹنگ فیلو' اور 'گیسٹ پروفیسر' کے بطور وابستہ رہیں۔ 2014 میں انھیں Literary Award SAARC سے نوازا گیا۔ غالباً اس سے قبل اور بعد یہ اعزاز جموں وکشمیر کے کسی اور قلم کار کے حصے میں نہیں آیا۔ ترنم ریاض تا دمِ حیات، وزارت ثقافت (حکومت ہند) کی 'سینئر فیلو' کی حیثیت سے بھی سرگرم رہیں۔ ترنم ریاض نے ہندوستان کے کئی صوبوں کے تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے علاوہ مختلف ممالک میں 'سارک' کے کئی 'لٹریری فیسٹول میں اجلاس کی صدارت کی اور اپنی شعری اور نثری تخلیقات بھی پیش کیں۔ 2005 میں اسلام آباد پاکستان میں منعقدہ 'ورلڈ اردو کانفرنس' میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 2010 میں کراچی پاکستان میں ہونے والے 'امن کی آشا' لٹریری فیسٹول میں بھی ترنم ریاض نے شرکت کی۔ 2011 میں انھوں نے کناڈا میں 'انڈین رائٹرس فیسٹول' میں لیکچر دیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں اپنی شعری تخلیقات سے سامعین کو مسحور کیا۔ مرزا غالب، قرۃ العین حیدر، وارث علوی پر ان کے لیکچرس یادگار مانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی حقوق، تصوف، تانیثیت اور مشترکہ تہذیب کے موضوعات پر ان کے

مضامین خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ترنم ریاض ایک عمدہ شاعرہ بھی تھیں اور کشمیر کی معاصر شاعرات رخسانہ جبیں اور شبنم عشائی کی طرح وہ بھی ملکی اور بین الاقوامی مشاعروں میں مدعو کی جاتی رہیں۔

ترنم ریاض کو ہندوستان، پاکستان اور کناڈا کے علاوہ قطر اور ریاض (سعودی عرب) میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ترنم ریاض کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مثلاً پرانی کتابوں کی خوشبو، بھادوں کے چاند، زیر سبزہ محوِ خواب وغیرہ۔ترنم ریاض کی شاعری کے مزاج اور معیار کا اندازہ ان کی ایک غزل کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

میں درد جاگتی ہوں زخم زخم سوتی ہوں
نہنگ جس کو نِگل جائے ایسا موتی ہوں
وہ میری فکر کے روزن پہ کیل جڑتا ہے
میں آگہی کے تجسس کو خون روتی ہوں
مری دعا میں نہیں معجزوں کی تاثیریں
نصیب کھولنے والی میں کون ہوتی ہوں
شجر کو دیتی ہوں پانی تو آگ اُگلتا ہے
میں فصل خار کی چُننے کو پھول بوتی ہوں
فضا میں پھیل گیا ہے، تری زبان کا زہر
میں سانس لینے کی دُشواریوں پہ روتی ہوں

ترنم ریاض کے ادبی اعمال نامے میں تقریباً بیس تصنیفات شامل ہیں۔ترنم ریاض نے دو ناول لکھے ہیں۔پہلا ناول 'مورتی' کے نام سے 2004 میں شائع ہوا۔جس میں ایک حساس (مجسمہ ساز) عورت کی نفسیاتی کشمکش اور شوہر کے رویے کے سبب 'انا' کی شکستگی کو بڑی سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اگر 'مورتی' کو ابتدائی تانیثی ناولوں میں شمار کیا

جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ترنم ریاض کا دوسرا ناول 'برف آشنا پرندے' پہلی بار 2009 میں شائع ہوا اور اب تک اس ناول کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ترنم ریاض کے مختصر ناولوں کا ایک مجموعہ 2005 میں 'فریبِ خطائے گُل' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں: یہ تنگ زمیں (1998)، ابابیلیں لوٹ آئیں گی (2002)، یمبر زل (2004)، مرا رختِ سفر (2008)

اردو فکشن کے معتبر نقاد وارث علوی نے اپنی کتاب 'گنجفہ بازِ خیال' میں لکھا ہے:

> ''ترنم ریاض ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہیں۔ ترنم ریاض کے یہاں اچھے افسانے اتنی وافر تعداد میں ملتے ہیں کہ ہمواری اور ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ ترنم ریاض کی ایک بڑی خوبی ان کی فن کارانہ شخصیت کی سادگی ہے۔ ان کے یہاں کوئی Pretensions Artistic نہیں، کوئی بلند بانگ دعوے نہیں، کوئی تکنیک کی طراریاں نہیں۔ کہیں نظر نہیں آتا کہ استعارے، علامتیں اور اساطیر مُنہ میں سو کینڈل پاور کا بلب لیے جلوہ افروز ہیں۔ ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے''۔

ترنم ریاض کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی 'اجنبی جزیروں میں' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ترنم ریاض ساہتیہ اکیڈمی، منسٹری آف کلچر اور ادبی سمیناروں کے لیے تنقیدی مضامین بھی لکھتی رہیں۔ ان مضامین کو انھوں نے 'چشمہ نقشِ قدم' کے نام سے ترتیب دیا تھا، لیکن بحیثیت مجموعی میرے خیال میں ترنم ریاض کو ان کے شاہکار کشمیر مرکوز ناول 'برف آشنا پرندے' کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ برف آشنا پرندے، کشمیری سائیکی، سماج اور ثقافت کا رزمیہ ہے۔ اکیسویں صدی میں یوں تو 'نادید' (جوگندر پال)، چاندنی بیگم (قرۃ العین حیدر)، مکان (پیغام آفاقی)، مسلمان (مشرف عالم ذوقی)، اور دویہ بانی (غضنفر) اور برف آشنا پرندے کے بعد یا ساتھ ساتھ جو کئی شاہکار ناول منظرِ عام پر

آئے مثلاً 'اماوس میں خواب' (حسین الحق)، جہاں تیرا ہے یا میرا (عبدالصمد)، فائر ایریا (الیاس احمد گدی)، عندلیب بر شاخ شب (شائستہ فاخری)، کہانی کوئی سناؤ متاشا (صادقہ نواب سحر)، خواب سراب (انیس اشفاق)، ندی (شموئل احمد)، بُلہا کیہ جاناں میں کون' (ذکیہ مشہدی) اور شبیر احمد کے 'ہجور آما' سے لے کر محسن خان کے 'اللہ میاں کا کارخانہ' تک ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ ناول سامنے آئے لیکن ان میں ترنم ریاض کے ناول 'برف آشنا پرندے' کا انفراد و امتیاز یہ ہے کہ اس ناول میں پہلی بار سِکھ دور سے لے کر ڈوگرہ دور تک کے جبر اور صبر کے واقعات کمال فنی و جمالیاتی در و بست کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ تاریخی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی نشیب و فراز اور انتشار و بحران نے کشمیری عوام کی نفسیات، جذبات اور محسوسات پر کس قدر منفی اثرات مرتب کیے ہیں، ترنم ریاض نے اس کی تصویر کشی ناول کے کرداروں، شیبا، پروفیسر دانش، پروفیسر شہاب، نجم خان، سلیم میاں، ثریا بیگم، سیمیں، خدا بخش، سکینہ بیگم اور باب صاحب وغیرہ کے حوالے سے بڑی خوبی سے کی ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر کے مختلف طبقوں کے ان کرداروں کے شعور اور لاشعور میں اتر کر، لامحدود امکانات کے ساتھ جس طرح ان کا Impersonal Narration کیا ہے اس کی بنا پر برف آشنا پرندے کی موضوعی پرواز کشمیر سے شروع تو ہوتی ہے لیکن اس کا آسمان آفاقی ہے۔ اس ناول میں 'بیانیہ' کا ایسا منفرد روپ ملتا ہے جس میں کردار کی خارجی زندگی سے کہیں زیادہ داخلی زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر اور اہل کشمیر کے تئیں استحصالی قوتوں کے Colonial Attitude کے خلاف اہل کشمیر کی احتجاجی سوچ کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''عجب محرومی تھی اس وادی کی معصومیت اور سادگی کی، کہ کوئی دوسرے خطوں سے اور کوئی سمندر پار سے آکر اس کی قسمت کا مالک ہو جاتا تھا۔ افغانوں اور سکھوں نے اگر کوئی کسر چھوڑی تھی تو وہ ڈوگرہ راج میں پوری ہوگئی۔'' (ص 259)

آزادی سے قبل کشمیریوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، ویسے مظالم 'ابو غریب' کے عقوبت خانوں میں امریکیوں نے عراقیوں پر بھی نہ ڈھائے ہوں گے۔اس کا اندازہ 'گلگِت بیگار' کے حوالے سے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''۔۔۔'گلگت' ریاست جموں کشمیر کی آخری سرحد تھا۔۔۔

جہاں بدنصیب کشمیریوں کو (بیگار کے لیے) سالم و ثابت بھیجا جاتا تھا، اور اکثر ان کے جسم کا ایک ٹکڑا یعنی 'سر' واپس آتا تھا، بہت سے سر، لاریوں میں ٹُھنسے ہوئے بے شمار سر۔بچ گئے افراد کی لاشوں کی بجائے اُن کے مجبور و مظلوم وارثوں کے حوالے ان کے عزیزوں کے 'سر' کیے جاتے تھے کہ کوئی کیوں غلام قوم کے لواحقین کی سالم لاشیں ان کے حوالے کرتا اور وہ انھیں صحیح طرح سپردِ خاک کر کے اپنے مجروح سینوں پر جدائی کی سِل رکھ لیتے۔'' (ص261)

برف آشنا پرندے میں ترنم نے کشمیر کی تاریخ نہیں دُہرائی ہے بلکہ تاریخی حقائق کی تہوں کو کھولا ہے اور جو کچھ ہاتھ آیا ہے انھیں گرفت میں لے کر بڑی مہارت کے ساتھ ناول کے اصل موضوع کی طرف لوٹ آئی ہیں۔لیکن ناول کے بیانیہ کو آگے بڑھانے اور اپنے نقطۂ نظر کو مستحکم کرنے کی غرض سے کشمیر کی دلدوز تاریخی جہات کو بھی مزید واضح بھی کرتی گئی ہیں:

''سن انیس سو اکتیس سے لے کر سن چھیالیس تک کشمیر کی عوامی تحریک نہ صرف برِصغیر میں بلکہ عالمی سطح پر بھی تسلیم کر لی گئی تھی۔''

(ص260)

''اس تاریخی حقیقت سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ جب سرحدوں پر قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا، وادی کشمیر پُرسکون تھی، غیر مسلم اقلیتیں، مسلم اکثریت کے حفظ و امان میں شادماں تھی۔پوری وادی میں لوگ

ٹولیاں بنا بنا کر عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہے تھے۔

حملہ آور خبردار، ہم کشمیری ہیں تیار
شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔''

(ص272)

آزادی سے پہلے، پُرکشش نعروں اور وعدوں سے پوری ریاست گونج رہی تھی:

1 ''سرداری عوام کا حق ہے۔ یہ ملک ہمارا ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔'' شیخ محمد عبداللہ۔

(ص269)

2 ''کشمیری اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں''۔ جواہر لعل نہرو۔

(ص270)

3 ''اب جب کہ پورا برِ صغیر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب گیا ہے، مجھے کشمیر سے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ مہاتما گاندھی۔

(ص272)

ترنم ریاض اردو اور ہندی ادبیات کے علاوہ مغربی ادبیات کے بھی جدید ترین تخلیقی رویوں، رجحانات اور نظریات کا گہرا شعور رکھتی تھیں۔ اسی لیے ان کی تخلیقات میں، خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا سماجی یا تنقیدی مضامین، ہر جگہ ان کی فکریات، اظہار و بیان اور اصناف کے فنی و جمالیاتی تقاضوں کے برتاؤ میں اجتہاد اور آزادہ روی کے عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ دراصل ترنم ریاض کے ادبی سفر کا زمانہ 1980 کے آس پاس سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو میں سوسئیر کے نظریہ لسان اور رولاں بارتھ اور دریدا کے ساختیات، پس ساختیات اور ردِ تشکیل وغیرہ نظریات کے زیر اثر جدیدیت کا رجحان مجہول اور مابعد جدید تصور مضبوط و مستحکم ہو رہا تھا۔ عالمی سطح پر تخلیقی اور تنقیدی ادب میں داخلی اور خارجی ہر اعتبار سے اجتہاد اور تجربہ پسندی کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ خاص طور پر گیبریل گارسیا مارکیز کے ناول 'تنہائی کے سو سال' کی مقبولیت، اور روسی ہئیت پسندوں جیکوبسن اور

شکلووسکی کے علاوہ جولیا کرسٹیوا وغیرہ کے، 'ادب میں زبان کی کارکردگی' اور 'ادب کی ادبیت' جیسے نظریات کی مقبولیت کے بعد عالمی سطح پر (تخلیقی اور تنقیدی) ادب میں تعمیری اور انسان دوست بصیرت مندی کو برتنے کا جو رجحان عام ہوا، اردو میں اس کی عمدہ مثالیں قرۃ العین حیدر اور لالی چودھری کے بعد ترنم ریاض کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ اگر 'برف آشنا پرندے' اور ترنم ریاض کی دیگر تخلیقات کی بھی سنجیدہ قرات کی جائے تو ادب عالیہ سے متعلق یہ بات درست معلوم ہوگی کہ کسی بھی فن کار کے فن کے انفراد اور اعتبار کا ایک جواز یہ بھی ہوتا ہے کہ جس معاشرے اور ثقافت کے حوالے سے اس فن کار کا فن پارہ (ناول، افسانہ، نظم یا شعر) لکھا گیا ہے، اس معاشرے کی سائیکی اور ثقافت کی 'تعمیر نو' کے امکانات بھی اس فن پارے میں موجود ہوں۔ اس اعتبار سے بحیثیت مجموعی ترنم ریاض کا فن (فکشن، شاعری اور مضامین) کشمیری سائیکی کا بے باک ترجمان تو ہے ہی، ساتھ ہی فکری اعتبار سے اہلِ کشمیر/ قارئین کو، کشمیر کی 'تعمیر نو' کے امکانات سے رُو برو کرنے کی کامیاب کوشش سے بھی عبارت ہے۔

ترنم ریاض کی فکشن نگاری
تخلیقی وثقافتی جہات

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

ڈاکٹر ترنم ریاض (1963-2021ء) کی شخصی، علمی وادبی جہات بذات خود کئی اصناف اور موضوعات کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرتی ہیں، جن میں ناول نویسی، افسانہ نگاری اور شاعری فوقیت رکھتی ہیں۔ ان سبھی اصناف میں ایک پہلو قدر مشترک نظر آتا ہے، وہ ہے ثقافتی پہلو، اور یہ ثقافتی پہلو نمایاں طور پر کشمیر کی تہذیب وثقافت کی تخلیقی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک طرح سے، ترنم ریاض کی فکشن نگاری کشمیری ثقافت کی افسانوی نمائندگی کرتی ہے۔ (Fictional representation of Kashmiri culture) ۔ یہ ثقافتی نمائندگی، ان کے ناول ''مورتی، برف آشنا پرندے''، ''فریب خطہ گل (ناولٹ)'، افسانوی مجموعوں ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''مرا رخت سفر'' ''یمبر زل'' ''یہ تنگ زمین''، شعری مجموعوں''، ''زیر سبزہ محو خواب''، ''پرانی کتابوں کی خوشبو' اور کتاب ''اجنبی جزیروں میں... سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی مضامین'' میں جگہ جگہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ افسانوں کی بات کریں تو بقول وارث علوی:

''...ان کے (ترنم ریاض) افسانے اپنی خاندانی وجاہت اور

ثقافت، اپنی طبقاتی سوفسطائیت، اپنی راست روش، انسان دوستی اور جذباتی
رویوں کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔''

(رسالہ''جدید ادب۔شمارہ 18 جنوری تا جون 2012 ص:124)

ترنم ریاض صاحبہ کا مشہور زمانہ ناول''برف آشنا پرندے''، کشمیری تہذیب و ثقافت کے تخلیقی بیانیہ کا عمدہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ناول کا نام''برف آشنا پرندے'' ایک ثقافتی استعارے کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ ماحولیاتی تناظر میں برف کشمیر کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے اور جو چیز زندگی کا جزو ہو وہ تہذیب وثقافت کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ پرندے کون ہیں، یہ وہ پرندے ہیں جو برف آشنا ہیں اور برف آشنا ہونے کے باوجود زندگی کے گھمسان رن میں ایسے پھنس چکے ہیں کہ اپنی زمین کی یادوں کا درد بھرا احساس ان کے شعور کا حصہ بن چکا ہے۔اس ناول کی کہانی کا بیشتر حصہ 'شیبا'' کی کردار نگاری کا زائدہ ہے۔ ناول کے تاریخی اور ثقافتی پہلو کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی فرماتے ہیں:

''تاریخی حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ ترنم ریاض نے کشمیریوں
کے لباس، رہن سہن، شادی بیاہ، زیورات، مہمانوازی، کھانے پینے کی
اشیاء، رسم ورواج اور مذہبی عقائد وغیرہ کو بھی بڑی فنکاری سے پیش کیا
ہے۔اس طرح یہ ناول تاریخ وتہذیب کا حسین امتزاج بن جاتا ہے۔''

(رسالہ''ہماری آواز'' فکشن نمبر جلد ۹۔۲۰۲۱ء)

ثقافت کی توضیح میں انسانی زندگی یا کسی خطہ کا ہر پہلو سما جاتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''پاکستانی کلچر'' میں مذہب، عقائد، رسوم ورواج، معاشرت، مادی وسائل و ضروریات وغیرہ یعنی زندگی کے تمام عوامل کو ثقافت کا حصہ گردانتے ہیں۔ترنم ریاض چونکہ کشمیر سے تعلق رکھتی تھیں، اس لئے ان کی تحریروں میں کشمیر کی تہذیب وثقافت کا فطری رس موجود ہے۔ان کی تحریروں میں کشمیر کے فطری مناظر کی عکاسی سے متعلق پروفیسر ریاض پنجابی لکھتے ہیں:

''مصنفہ کا تعلق وادی کشمیر سے ہے۔ وادی کے حسین مرغزاروں، باغات، پھل اور پھول، حسین کوہسار، یہ جھلکیاں ان کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔'' (کتاب: اجنبی جزیروں میں۔ پیش لفظ: ص16)

حقیقت بھی یہی ہے کہ ترنم ریاض کی تخلیقات میں وادی کشمیر کے درد کے ساتھ ساتھ یہاں کے فطری مناظر اور سماجی زندگی کی فنی عکاسی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ (اگر چہ کہیں کہیں ان کے خاندانی جاہ وحشمت کا ذکر بھی کہانیوں میں نمایاں ہے کیونکہ یہ جاگیردارانہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔) جیسے شعری مجموعہ ''زیرِ سبزہ محوِخواب'' کا یہ شعر اور مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' کی ایک غزل کا مطلع دیکھیں:

مختلف ساعتوں میں تجھ کو ہمدم کون رکھے گا
مری وادی ترے زخموں پہ مرہم کون رکھے گا
(ص:6)

گل و لالہ و زعفران اور رستہ
نہ بھولیں گے ہم وہ مکان اور رستہ
(ص:169)

فکشن تخلیق اگر سیاسی وسماجی یا تاریخی وثقافتی عناصر سے مملو ہوگی تو دوران تخلیق تخیل کے ساتھ ساتھ تجربہ ومشاہدہ اور تاریخی وثقافتی حقائق کا مناسب ادراک بھی رکھنا پڑتا ہے تا کہ وہ تخلیق فنی کاریگری کے زیر اثر کسی خطہ یا سماج کی مناسب تخلیقی نمائندگی کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ہوا میں لکھی تحریر ہوا ہی ہو جاتی ہے۔ فکشن اور حقیقت کے تخلیقی اظہار سے متعلق ڈاکٹر فرخ ندیم تنقیدی کتاب ''فکشن، کلامیہ اور ثقافتی مکانیت'' میں ایک اہم بات لکھتے ہیں:

''زندگی کی طرح فکشن کا بھی اپنا ایک جغرافیہ ہوتا ہے۔ اس جغرافیے کی حدود وقیود کا تعین اس کے موضوعات کرتے ہیں۔ فکشن کی وہ

قسم جو سماجی ناول یا افسانہ کہلاتی ہے حقیقت کو تخیل بنانے اور تخیل کو حقیقت بنانے کا فن ہے۔'' (ص:89)

ڈاکٹر ترنم ریاض کے بیشتر افسانوں کا موضوعاتی کینوس کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور سیاست و معاشرت پر پھیلا ہوا ہے اور فن کے دائرے میں یہ افسانے وادی کے رہن سہن، خورد نوش، رسم و رواج اور سیاسی و سماجی صورت حال کی قابل دید تخلیقی منظر کشی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وادی سے باہر کے قارئین بھی یہاں کے رسم و رواج اور رہن سہن سے واقف ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں بھی یہ چیزیں اور یہاں کے فطری مناظر دیکھنے کی امنگ جاگ اٹھتی ہے۔ افسانہ ''یمبر زل'' کا یہ اقتباس دیکھیں، جس میں کشمیر کے ثقافتی لباس ''پھرن'' اور برفیلے موسم میں استعمال ہو رہی روایتی کانگڑی کا ذکر آیا ہے:

''نکی باجی ... یہ الجبیر اُمجھے ضرور فیل کرے گا....'' یوسف نے پھرن کے اندر سے آگ کی بھری کانگڑی باہر نکال کر سبز بوٹوں والے سرخ قالین کے عین درمیان رکھ دی۔''

برسبیل تذکرہ اس بات کی صراحت دلچسپ رہے گی کیونکہ باہر کے کئی احباب نے کئی بار فون پر پوچھا بھی ہے اور گوگل میں بھی ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ ''کانگڑی:...مٹی کی انگیٹھی جسے اکثر کشمیری گلے میں لٹکائے رہتے ہیں۔'' دراصل' کانگڑی کشمیر کے روایتی رہن سہن کا حصہ ہے۔ یہ ایک طرح سے ہتھ انگیٹھی یا روایتی Blower ہوتی ہے جو موسم سرما خصوصاً برف باری کے ایام میں ٹھنڈ کے دوران گرمی پہنچانے کے لئے پھرن (لمبا چوغہ) کے اندر رکھتے ہیں لیکن یہ گلے میں لٹکائی نہیں جاتی بلکہ پھرن کے اندر رکھی جاتی ہے یا چلنے کے دوران ہاتھ میں اٹھائی جاتی ہے جس طرح بیگ وغیرہ ہاتھ میں اٹھایا جاتا ہے۔ افسانہ ''یمبر زل'' (نرگس کا پھول) کا پلاٹ کافی وسیع ہے۔ قریباً تیس سے زائد صفحات پر مشتمل یہ افسانہ تین مرکزی کرداروں 'نکی' 'یاور' اور 'یوسف' کے ذریعے کشمیر کی پُر آشوب صورتحال اور اس کے زیر اثر کشمیری لوگوں کی نفسیاتی' معاشی اور انسانی جان کے زیاں ہونے کی

دلدوز کہانی پیش کرر ہا ہے۔ افسانے کا درجہ ذیل اقتباس اس اندوہناک صورتحال کا جامع احاطہ کرتا ہے:

''ان دنوں حالات اور بکھر گئے تھے۔ وادی اور اداس ہوگئی تھی۔ گھروں میں افراد کم ہو گئے تھے۔ دل رنجیدہ رہا کرتے تھے۔ گھروں سے کام کی خاطر نکلنے والوں کے شام کولوٹنے تک گھر میں رہنے والے وسوسوں میں گھرے رہتے۔'' ایک کشمیری افسانے میں پوشیدہ دردوکرب اورخوف وہراس کو پوری طرح محسوس کرسکتا ہے یا وہ قاری جنہوں نے ایسے حالات سہے ہونگے۔ افسانے میں کشمیر کی بدنصیبی کے تاریخی اشارے بھی موجود ہیں جیسے کشمیر کے خودمختار بادشاہ یوسف شاہ چک کا اکبر بادشاہ کے ہاتھوں دھوکہ کھا کر دیارغیر میں وفات پانا اوراس کی یاد میں ملکہ حبہ خاتون کی دردانگیز شاعری۔ افسانہ دلچسپ کرافٹ کا حامل ہے۔ کہانی نکی، یاور اور یوسف کی پڑھائی سے شروع ہوتی ہے اور پھر کئی برسوں پر محیط ہوکر کشمیر میں جاری کشیدہ صورتحال پر ختم ہو جاتی ہے۔ کہانی میں کہیں پر بھی من گھڑت واقعات نظر نہیں آتے ہیں بلکہ مشاہداتی اور تاریخی بنیاد پر سارے واقعات فطری نوعیت کے لگ رہے ہیں۔ اس طرح افسانہ کشمیر کی سیاسی وسماجی زندگی (Socio-political life of Kashmir) کی متاثر کن فنی عکاسی کرتا ہے۔ اگرچہ افسانے میں نکی اور یوسف کی کردارنگاری کے موڑ کہیں کہیں حقیقت سے بعید معلوم ہوتے ہیں تاہم اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ایسے واقعات ہوئے بھی ہیں۔

مشاہدے سے ظاہر ہے کہ تانیثی موضوعات کی حامل تخلیقات اگر کسی خاتون تخلیق کار کی فکری اور تحریری کاوش ہوگی تو اس میں عورت کے داخلی کرب، نفسیاتی پیچیدگی اور فطری احساس کا تخلیقی رنگ نمایاں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی تخلیقات فکری سطح پر متاثر کن تاثر چھوڑ

جاتی ہیں۔ترنم ریاض کا فسانہ ''ناخدا'' ایک مرد کے ناشائستہ رویہ اوراس کی بیوی کی نفسیاتی پیچیدگی اور داخلی کرب کی فکر انگیز تخلیقی عکاسی کرتا ہے۔افسانے کا پلاٹ خود کلامی تکنیک پر استوار ہوا ہے کیونکہ پوری کہانی مرکزی کردار ''بیوی'' کی خود کلامی میں پیش ہوئی ہے۔تخلیقی سطح پر یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کا شوہر فرسودہ سوچ کا حامل اپنے مرد ہونے کے غرور کی سائکی کا شکار ہوتا ہے اور سمجھتا رہتا ہے کہ عورت کو کبھی رعوب بٹھا کر اور کبھی نظر انداز کر کے تابع رکھنا چاہئے۔لیکن ایک وفا شعار بیوی شوہر کے اس قسم کے رویے سے ذہنی طور پر پریشان ہوتی ہے اور سوچتی رہتی کہ:

''مجھے یقین تھا کہ جب ماں واپس چلی جائیں گی تو میں پھر اکیلی پڑ جاؤں گی۔کمزور' بے بس۔پھر میری وہی بے چارگی ہوگی اور وہی میرے شوہر کا رویہ۔وہی میرا اندھیرے میں گھر کے باہر سیڑھی پر انتظار کرنا اوران کا رات کے دوسرے پہر آنا۔وہی بے قاعدہ زندگی اور وہی بے وقت کا کھانا پینا۔میرا محبت اور آس بھری نظریں لئے ان کے آگے پیچھے گھومنا اور ان کا اکڑ اکڑ کر باتیں کرنا اور میری دس دس باتوں کے جواب میں کبھی ایک بات کر لینا اور کبھی بولنا ہی نہیں۔میرا سراپا مجبور وجود اوران کی غرور سے تنی گردن۔''

افسانے میں مردوں کے اقسام کے تعلق سے تجزیاتی اپروچ بھی اپنایا گیا ہے تاہم افسانے کا انجام فرحت بخش تاثر چھوڑ جاتا ہے جب مجبور وجود (بیوی) کے اندر ہمت اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ شوہر کے رویہ کو بدلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے:

''میں ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی جس پر کئی رنگ آئے اور آخر کار سرخ ہوتا ہوا ان کا چہرہ نارمل ہو گیا اور تحکمانہ انداز بدل کر دوستانہ ہو گیا اور وہ بولے ''آیئے مل کر Tie up کر لیتے ہیں۔''

تخلیقی سطح پر دیکھیں تو افسانہ ''شہر'' منظری اسلوب کی تخلیقی ساخت کا عمدہ افسانہ

ہے۔یہ افسانہ بنیادی طور پر احساس آمیز کیفیت کی کہانی پر تخلیق ہوا ہے جس میں مشترک محسوسات (Common sensibles) کو تخلیق کا روپ دیا گیا ہے اور دوران قرأت قاری معصوم کرداروں (دو چھوٹے بچوں) کے نفسیاتی پیچ وخم 'داخلی درد و کرب اور خارجی قسم کی معصومانہ تگ ودو کے احساس کو دل سے محسوس کرتا ہے۔افسانہ نگار کی ہنرمندی اس وجہ سے بھی قابل ستائش ہے کہ ایک اہم سماجی ایشو کو انہوں نے فنی چابکدستی سے یوں کہانی میں پیش کیا ہے کہ قاری کے سامنے شہری زندگی کی کالونیل تہذیب کے منفی پہلو تخلیقی انداز سے سامنے آتے ہیں۔اس میں تخلیق کا تجزیاتی مشاہدہ بھی شامل ہے اور فنی صنعت گری کی جلوہ گری بھی۔ایک ماں فلیٹ میں مرجاتی ہیں۔اس کے معصوم بچے اس کی موت سے بے خبر اپنی بھوک مٹانے کے لئے اسے جگاتے رہتے ہیں لیکن کئی دن' اس کے چہرے کی صورت تبدیل ہونے تک باہر کی دنیا اسے بے خبر رہتی ہے۔اور بچے کے مسیح کرنے پر بھی کوئی مدد کرنے کے لئے نہیں آتا ہے۔دراصل کالونیل لائف اسٹائل کے جتنے فوائد ہیں اتنے ہی نقصانات بھی ہیں خصوصاً ان کالونیوں کے جہاں پر لوگوں نے سماج سے تنہا زندگی گزارنے کے ماحول کو پروان چڑھا رکھا ہے۔کئی جگہوں پر ایسے واقعات پیش آئے کہ جب فلیٹ میں کسی انسان کے مرنے کی اطلاع کئی دنوں کے بعد کسی ہمسایہ نے پولیس کو دے دی یعنی جب لاش سڑ چکی تھی۔بچے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ وہ دروازے کی اوپری چٹخنی تک کھول نہیں سکتے ہیں۔افسانے میں ماں کی لاش کے سامنے ننھے منے بھائی بہن کی بے کسی اور ان کے نفسیاتی کیفیت کو دلخراش اسلوب میں پیش کیا گیا:

> ''ممی' اس نے ممی کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا مگر ممی بے حس وحرکت پڑی رہیں۔وہ کچھ دیر گم سم سا بیٹھا رہا۔پھر ثوبیہ کے قریب جا کر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔'نہیں رونا ثوبی۔ممی سو رہی ہیں' مگر ثوبی تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔'چپ ہو جا۔' وہ چیخا اور ساتھ ہی دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔''

دراصل اب شہری کالونیوں میں بھی رہن سہن کا روایتی ثقافتی ماحول رفتہ رفتہ دم توڑ رہا ہے اور زندگیاں گھر کی چاردیواری کے اندر سہم کر رہ گئی ہیں۔ چونکہ افسانہ نگار نے دیہات سے لیکر شہر تک کی زندگی کا عملی مشاہدہ کیا ہے اس لئے افسانے میں احساس کا درد سما گیا ہے۔ افسانے کی دل سوز کہانی پڑھ کر اسلم پرویز کا شعر یاد آتا ہے:

سونے پن سے گاؤں کے بھاگے تھے ہم
ڈھونڈ رہے ہیں شہر میں تنہائیاں

باشعور تخلیق کار کی تخلیقات میں نیا پن اس وقت آتا ہے جب وہ نئے حالات اور زندگی کے نئے رنگوں سے اپنی تخلیق کو سجاتا ہے۔ اس تناظر میں ترنم ریاض کے افسانوں پر ارتکاز کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے افسانے مقامی موضوعات سے لیکر عالمی سطح کے موضوعات کے رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ اعلی تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ وہ میڈیا سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دنیا میں ہورہی تبدیلیوں سے بھی باخبر رہتی تھی۔ اس لئے ان کے افسانوں میں نئے دور کی نئی زندگی اور نئے موضوعات کی دلچسپ کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ان میں تہذیبی اقدار، بدلتی انسانی اور سماجی قدروں، نئی نسل کی تکنیکی سوچ اور سیاسی ونسائی مسائل وموضوعات کو دلچسپ اسلوب میں فکشنائز کیا گیا ہے۔ اس تعلق سے کئی افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں جیسے سورج مکھی، یہ تنگ زمین، پورٹریٹ، کانچ کے پردے، کمرشل ایریا، دھندلے آئینے، ٹیڈی بئیر، رنگ، تجربہ گاہ، برف گرنے والی ہے، اچھی صورت بھی کیا وغیرہ۔ فنی، اسلوبیاتی اور تکنیکی سطح پر ان کے افسانے پلاٹ سازی کی چستی، زبان وبیان کے معیاری پن اور موضوعاتی گہرائی کے حامل ہوتے ہیں اور کئی افسانوں میں ڈراما کی تکنیک بھی استعمال ہوئی ہے۔ ان کے ناول یا افسانے فکشن نگاری کے تخلیقی عمل سے مربوط نظر آتے ہیں نہ کہ میکینکی انداز سے واقعاتی بیانیہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ تخلیقی رچاؤ سے مزین ہوتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے صیغہ واحد غائب میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے کئی افسانوں کا اسلوب قرۃ العین حیدر کے اسلوب کی عکاسی کرتا ہے۔ جیسے افسانہ ''ساحلوں کے اس طرف کا ابتدائی حصہ دیکھیں:

''شیری نے اخبار سامنے سے سرکا دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے
لگی۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب اس کے والدین کا اچھے دنوں میں
اتاری گئی ایک تصویر میں اس کے والدین اپنے کوئی پندرہ برس بڑی بیوی
کے کمر میں ہاتھ ڈالے مسکرا رہے تھے...''

ترنم ریاض کے افسانوں کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں کردارنگاری کا فنی اور شخصی خاکہ ماہرانہ بنت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ عام طور مرکزی کردار کا خاکہ دلچسپ انداز سے کھینچتی ہیں جو کہ افسانوی فن کا ایک اہم جزو ہے۔ بطور مثال، افسانہ ''متاع گم گشتہ'' کے کردار رام موہن کنول کا یہ خاکہ دیکھیں:

''ان کی عمر کوئی اڑھتر اناسی کے قریب ہوگی۔ چہرے پر کئی موٹی
پتلی جھریاں اور نچلے تمام دانت غائب۔ آنکھوں کی چمک کے اوپر ایک
بے رنگ سا پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے سے ان کی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی
پتلیاں تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ گردن کی جلد کئی اطراف سے لٹک کر گلے
کے درمیان والی دو مرمری ہڈیوں کے بیچ میں جمع ہو رہی تھی۔ باہر کی طرف
ابھرا ہوا نرخرہ بولتے وقت اوپر نیچے ہلتا اور جب بات کرتے وقت وہ
جانے کیا نگلتے تو ان کی صورت پر عجیب طرح کی مظلومیت چھا جاتی۔''

افسانہ ''یہ تنگ زمین'' کا عنوان معنوی سطح پر مہاجرت یا کسی خطہ کے خراب حالات کی وجہ سے وہاں کے باشندوں کے تناؤ یا کسی انسان کا اپنا وطن مجبوراً چھوڑنا وغیرہ جیسے مسائل و موضوعات کی غمازی کرتا ہے۔ افسانے کے عنوان اور پھر کہانی پر اطلاق کرنے سے لگتا ہے کہ افسانہ اگرچہ اپنا پیغام ترسیل کرنے میں کامیاب ہے کیونکہ اس خطہ کے گن کلچر کے اثرات بچے کے ذہن پر بھی پڑتے ہیں اور وہ گھر میں بھی جنگی قسم کا کھیل کھیلتا ہے تاہم عنوان ''یہ تنگ زمین'' کے معنوی اطلاق کا اثر کہانی میں کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس افسانہ ''یمبرزل'' کا عنوان اپنی اصلی معنویت سے نکل کر کہانی میں علامتی مفہوم کی عمدہ

عکاسی کرتا ہے کیونکہ قبرستان میں گلاب یا نرگس (یمبر زل) کے پودے لگائے جاتے ہیں اور زیادہ تر یہ قبروں کے اوپر یا نزدیک ہی ہوتے ہیں، جس سے دل کو ایک سکون ملتا ہے۔ چونکہ ''نکی'' بھی ''یوسف'' کو نرگس سے تشبیہ دیتی تھی جو کہ بالآخر موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے، اس لئے یمبر زل کا عنوان کہانی کی معنویت کے مناسب ہے۔ کیونکہ کشمیر کے بہت سارے نوجوان یوسف کی طرح یمبر زل ہی بن گئے ہیں اور جن کی بس اب یادیں ان کے گھر والوں کے دلوں میں رہ گئی ہیں۔

ترنم ریاض کی فکشن نگاری اور شاعری کے اختصاصی پہلوؤں اور ان کی تخلیقی امیج پر کئی ناقدین کے مضامین سامنے آئے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیت اور فکشن نگاری کے تعلق سے پروفیسر صغیر افراہیم نے چند برس قبل اپنی تصنیف ''افسانوی ادب کی نئی قرآت'' میں شامل مضمون ''ترنم ریاض کا افسانوی ادب'' میں لکھا تھا:

> ''قرۃ العین حیدر ہمارے افسانوی ادب کو جہاں تک پہنچانا چاہتی تھیں، پہنچا چکیں۔ ان کی غیر موجودگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر کرنا آسان نہیں۔ ایسے میں جن فنکاروں کی طرف نگاہیں جا رہی ہیں ان میں ترنم ریاض سرفہرست ہیں....''

مجموعی طور پر ڈاکٹر ترنم ریاض صاحبہ کی فکشن نگاری کی انفرادیت کی بات کریں تو ان کے افسانے اور ناول، افسانوی اسلوب کی دلکش فنی اور تخلیقی عکاسی کرتے ہیں۔ جن کا مطالعہ قاری کے اندر یہ احساس جگاتا ہے کہ وہ فکشن پڑھ رہا ہے جو کہ کسی بھی افسانہ نگار کی ایک اہم فنی خوبی قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کا موضوعاتی کینوس سماجی مسائل اور وجودی کرب پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں کئی قسم کے تخلیقی رنگ نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی کردار نگاری میں کسی بھی کردار کی تخلیقی ساخت فنی چابکدستی کی ماہرانہ عکاسی کرتی ہے، کیونکہ وہ کردار نہ صرف افسانوی کردار ہونے کا حق ادا کرتے ہیں بلکہ پیامی سطح پر اپنے لب ولہجے اور عمل سے سماجی یا طبقاتی موضوعات و مسائل کی فنی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ☆☆

ترنم ریاض کی ریاضت اور معرفت
ابابیلیں لوٹ آئیں گی

عشرت ناہید
اسسٹنٹ پروفیسر مانو کیمپس، لکھنؤ

اردو فکشن جو کہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی میں پوری طرح خواتین کے قلم کی گرفت میں نمو پا رہا ہے۔ ان خواتین قلم کاروں میں ترنم ریاض ایک ایسا نام رہا ہے جس نے تخلیق کی مختلف جہات کو اپنی مخروطی انگلیوں کی جنبش سے خوبصورتی ہی نہیں عطا کی بلکہ سخت اور تلخ حقائق کو بھی تحریر کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کے بدلتے روپ کی عکاسی کی ہے کہ وہ صرف حسن و عشق کا مجسمہ نہیں جیتی جاگتی زندگی ہے، جس پر حالات جب اثر انداز ہوتے ہیں تو وہ انہیں ضبط نہیں کرتی بلکہ ان آنسوؤں کو حروف کی شکل میں دنیا کو سونپ دینے کی جسارت بھی رکھتی ہے۔

'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' ترنم ریاض کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جو کہ سن دو ہزار میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کا عنوان ہی بہت معنی خیز ہے، ذہن کے دریچوں کو وا کرنے والا ہے، سوالات قائم کرتا نظر آتا ہے نیز قاری کو تاریخ کے اوراق پلٹنے کی دعوت دیتا ہے۔

کہ ابابیلوں کا تعلق تو خدا کے گھر سے رہا ہے ابرہہ نے جب خدا کے گھر کو

ڈھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عبدالمطلب نے خدا سے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بے بسی بیان کر دی تھی کہ میں اور میرے ساتھی تیرے گھر کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ یہ تیرا گھر ہے تیرے حوالے۔ اب تو خود اس کی حفاظت فرما۔ تب خدا نے ابابیلوں کا لشکر بھیج کر ابرہہ کے ناپاک ارادوں کو مسمار کر دیا تھا۔

ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' میں شامل افسانے انسانیت کے سبق کو بھلا دینے والے انسانوں کی داستانیں معلوم ہوتے ہیں، انسان کے انسان پر کیے جانے والے ظلم و جبر اس کے استحصال کے خونچکاں واقعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ تو سوال اٹھتا ہے کہ کیا ترنم ریاض انسان کی انسانیت سوز حرکات کی وجہ سے خدا کی مخلوق سے ہی مایوس ہو چکی ہیں؟ خدا کی تخلیق جسے اس نے خود اشرف المخلوقات کا تاج پہنایا کیا وہ تاج بے نور ہو چکا؟ کیا وہ اپنی عظمت کھو چکا؟ کیا انسانیت کی حفاظت کے لیے ایک بار پھر ابابیلوں کی شکل میں خدائی مدد کی ضرورت ہے کہ وہ آئے اور خدا کی اس مخلوق جسے انسان کہتے ہیں اس کی انسانیت کی انسان دشمن طاقتوں سے حفاظت کرے کیونکہ اب اس روئے زمین پر مظالم کے بال و پر اتنے بڑھ چکے ہیں کہ انہیں تراشنے کے لیے خدائی طاقت درکار ہے۔

ترنم ریاض اس مجموعے کو یہ عنوان دے کر ہمارے ذہن کو ایک امید اور حوصلہ بھی دینا چاہتی ہیں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کے نیست و نابود ہونے کا وقت بھی قریب آجاتا ہے، ہمیں پر امید رہنا چاہیے کہ ابابیلوں کا لشکر ایک بار پھر آئے گا اور ظالموں کا خاتمہ کر دے گا۔

ایک اور بات جو کہ قابل غور ہے اس عنوان کے تحت ابھرتی ہے کہ ابابیل مونث ہے، کیا یہ استعارہ ہے عورت کا؟ کہ اس کائنات میں ہر ظلم اسی پر سے گزر کر اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو کیا وہی اس ظلم کو ختم کرنے کی وجہ بنے گی؟ شاید کہ ایسا ہی ہو۔ وہ ناتواں کیا ایسی کوئی توانائی پا جائے گی کہ ظالم کا وجود ہی مٹا ڈالے گی؟ کیونکہ تمام کائنات کو ہلا ڈالنے والی

توانائی تو اسی کے پاس ہے، اسی کی تڑپ تو زمین کا کلیجہ چیر ڈالتی ہے اور زمین لق ودق صحرا میں پانی اگل دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس مجموعے کے اندرونی صفحات کی طرف بڑھتے ہیں تو عنوان ہی کی طرح ترنم ریاض ایک بار پھر چونکا دیتی ہیں وہ قرآن کی آیت اور اس کا ترجمہ پیش کرتی ہیں جس میں غور وفکر کی دعوت ہے کہ اس خالق نے انسان کو ماں کے پیٹ سے پیدا کر اسے سماعتیں اور بصارتیں عطا کی ہیں جس کا احسان مانتے ہوئے اسے رب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

اس مجموعے کو انہوں نے اپنے محبوب شوہر ریاض پنجابی کو معنون کیا ہے۔ ریاض پنجابی جوان کا عشق ہیں ۔

اس کے بعد کے صفحے پر وہ صوفی شاعر بلھے شاہ کا کلام پیش کر دیتی ہیں کہ عشق حقیقی اور مجازی کے مابین جو باریک سا رمز پنہاں ہے اس تک کوئی صاحب بصیرت ہی رسائی پا سکتا ہے۔ جس طرح ہیر اور رانجھا میں من وتو کا فرق مٹ گیا تھا دونوں ایک دوسرے کی ذات میں موجود دوئی کو بھول چکے تھے، وہ یکتائی وہ محبت کی انتہا اور اس عشق کی تپش کو سمجھ لینا آسان نہیں بلکہ یہ ہر کس وناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔

یہ صوفیانہ انداز دریائے چناب کی یہ عشقیہ داستان اور پھر بلھے شاہ کا عارفانہ کلام قاری کے دل پر دستک دیتا ہے۔ یہ مجموعہ مطالعے سے پہلے ہی یہ احساس کروا دیتا ہے کہ افسانہ نگار وقت کی نباض ہی نہیں صوفیانہ سوچ کی حامل بھی ہیں۔

ترنم ریاض کے افسانوں میں یہ صوفیانہ انداز ان کے قلم سے نکلے حروف کو جاودانی عطا کرتا ہے۔ آگے کے صفحے پر وہ لل عارفہ جو کہ کشمیر کی پہلی خاتون صوفی شاعرہ ہیں جنہیں وہاں کی ثقافت نے اپنی تہذیب سے وابستہ کر کے لل دید کے نام سے پکارا ہے اور جنہیں لل عارفہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی یعنی اسلام کے آغاز کے دور کی شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں عشق حقیقی کی رسائی کی راہگزر کو بڑے پرسوز انداز میں پیش کیا ہے۔

لل دید کہتی ہیں (اردو ترجمہ) پڑھتے پڑھتے میری زبان اور تالو گھس گئے مگر میں تمہارے میعار کے مطابق کام نہ کر سکی، تسبیح پڑھتے پڑھتے میری زبان اور انگلی گھس گئی من کا میل نہ دھل پایا"

ترنم ریاض ان کے اشعار کو پیش کر کے قاری کو تصوف کی ایک نئی دنیا کا باسی بناتی ہوئی چلتی ہیں ان کی یہ فضا بندی متاثر کن ہے۔ وہ تخلیق کار ہیں لیکن اپنے خالق کے سامنے اپنی کم مائیگی کا اعتراف بڑے عاجزانہ انداز میں کرتی ہیں جبکہ وہ جانتی ہیں کہ ان کے اور اصل تخلیق کار کے درمیان کا رشتہ کتنا مضبوط ہے۔ وہ معاون خلق کے طور پر دنیا میں لائی گئی ہیں۔ صناع کار کوئی اور ہے لیکن دنیا میں تخلیق کا وسیلہ (عورت) تو وہ ہیں۔ ذہن کو روشن تو اس کا نور کر رہا لیکن صفحہ قرطاس پر حروف کو شکل تو ان کا قلم دے رہا۔ حروف ساز انہیں جاودانی دینے کے لیے ان کی انگلیوں کی جنبش کا متقاضی ہے۔ حقیقت جاننے کے باوجود بھی تشنگی انہیں معرفت کی راہ پر گامزن کرتی نظر آتی ہے۔ ترنم ریاض تخلیق کے مراحل سے گزرتے ہوئے معرفت کے نجانے کتنے انجان راستوں کی مسافر بنتی ہیں۔ یہ راز انہی کی ذات کا خاصہ بن کر رہ گیا۔ لل دید کے اشعار اور ان کا اردو ترجمہ ان کے آگہی کے روزن تک ہمیں پہنچا دیتا ہے۔

اشعار کی یہ پیش کش ترنم ریاض کی ریاضت اور معرفت مزاجی دونوں کے امتزاج کی گواہی دیتے ہیں۔ ان منازل کا پتہ دیتے ہیں جہاں کا سفر انہیں مقصود تھا۔ وہ ہر کہانی لکھنے کے بعد بھی اس کے نامکمل ہونے کے احساس سے نبرد آزما ہوتی نظر آتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ کبھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں کبھی کوئی کہانی مکمل ہی نہیں ہوئی ہے۔

ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھنے پر علم ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات آس پاس بکھری زندگی کی چھوٹی بڑی کہانیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔ کہیں وہ عورت کے جنسی استحصال کو موضوع بناتی ہیں تو کہیں بزرگوں کو نظر انداز کرتے معاشرے کو، کہیں نچلے دبے کچلے طبقے کے حالات قلم بند کرتی ہیں تو کہیں نوجوانوں کی نفسیات کو، گھر

کی چہار دیواری سے باہر کی خوبصورتی کے ساتھ سماج کے تمام تر بدصورت مناظر بھی ان کے یہاں جابجا نظر آتے ہیں جو کہ بدنما داغوں کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ کہیں شہری زندگی کی گھما گھمی میں تنہائی کا عالم چبھن پیدا کرتا نظر آتا ہے تو کہیں گاؤں کے دلفریب مناظر لبھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ظلم و جبر کی داستانیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کہیں رشتوں کا تقدس پامال ہوتا دکھائی دیتا ہے تو کہیں انجانے رشتوں کی پاکیزگی دل کو چھو لیتی ہے۔ کہیں کرداروں کی ظاہری اور باطنی خوبیاں مرعوب کرتی ہیں تو کبھی ان کے کریہہ اور مکروہ کارنامے انسانیت کو شرمسار کرتے ملتے ہیں۔ غرض سماج کا شیرازہ کس طرح بکھر رہا ہے اس کا درد ان کے افسانوں میں ہر روپ میں نظر آتا ہے۔ ترنم ریاض مقامی حالات پر کہانیاں لکھ کر اپنی مٹی کا قرض اور اپنا فرض بھی ادا کرتی ہیں۔ ان تمام موضوعات کو دیکھتے ہوئے جب ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو نسائی آواز ہی بلند نظر آتی ہے۔ عورت ایک مستقل موضوع کے طور پر موجود ہے جسے وہ پوری جمالیات اور حقیقت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ وجودِ زن سے کائنات کو رنگین کرنے کے لیے ان کے یہاں رومانی فضا بھی ملتی ہے اور سچائیاں بھی کہ دونوں روپ کا امتزاج ہی اصل زندگی ہے۔

اس مجموعے میں شامل ان کا افسانہ ''باپ'' ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جو قاری کو اندر تک جھنجھوڑ دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر تو باہری دنیا کے لوگ گھنونے کھیل کھیلتے ہیں لیکن اس افسانے میں تو باپ ہی حیوان بنا ہوا ہے۔ وہ باپ جس کے ساتھ بیٹیوں کا شفقت، محبت اور محافظ کا رشتہ ہے وہی بھیڑیا بن گیا ہے، ایسے میں سوال اٹھتا ہے کہ آخر بیٹیاں کہاں جائیں؟ کہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں کوئی پناہ گاہ نہیں؟ ایسے ماحول میں ایک بیٹی اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتی ہے۔

اس افسانے باپ ایک شرابی اور ظالم انسان ہے جس نے اپنی بیوی پر زندگی بھر ظلم کیا اور ایک دن اتنا زدوکوب کیا کہ وہ غریب صاحب فراش ہو کر رہ گئی۔ اب اس کی نظر اپنی بیٹیوں پر ہے ماں بے بسی کی مورت بنی سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہے۔ وہ صرف زبان

سے ہی اپنے درد کا اظہار کر پاتی ہے اس کی یہ بے چارگی قاری کو اس کی نفسیات سے واقف ہی نہیں کرواتی بلکہ اس کے درد میں شریک کر لیتی ہے۔ جب وہ بڑی بیٹی کا استحصال کرتا ہے وہ تڑپ اٹھتی ہے اور چیخ پڑتی ہے:

''مر کر بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دوں گی۔۔۔۔ سانپ۔۔۔ اپنے ہی بچوں کو کھاتے ہو۔۔۔ شیطان، درندے۔۔۔ کلیوں کو۔۔۔۔ میری بچیوں پر۔۔۔ میری۔۔۔۔ میری۔۔۔ امی کی سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں ان پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔۔ میں تمہیں کوئی۔۔۔۔۔ سنگسار کیوں نہیں کر دیتا۔۔۔۔''
امی کی آواز ڈوب گئی'' (ابابیلیں لوٹ آئیں گی: ص:۴۷)

ماں اور بیٹیوں کی اس بے بسی کا حل ان کے پاس نہیں ہے۔ کوئی راہ کوئی روزن نہیں ایسے میں منجھلی بیٹی ساحرہ جو آٹھویں درجہ کی طالبہ ہے، دھن کی پکی ذہین اور محنتی بھی ہے، باپ کی مذموم حرکتوں پر اس کا خون کھولتا ہے، اس جبر کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

''میرے۔۔۔ کپڑے دو۔۔۔۔ حرا۔۔۔۔'' وہ غصے سے بھناتا ہوا کھڑا ہو کر ناظمہ سے مخاطب ہوا اور وہ تھرتھراتی ہوئی باپ کے پیچھے چلنے لگی۔

ساحرہ نے دیکھا طاقچے کے اکھڑے ہوئے ہوئے حصے کی اینٹ بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی، اس کے ذرا سا ہلانے سے اس کے ہاتھ میں آ گئی تو اس نے اینٹ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ باپ باورچی خانے سے گزرنے والا تھا''

(ابابیلیں لوٹ آئیں گی: ص:۴۷)

طاقچے کی اینٹ کا ساحرہ کے ہاتھ میں آ جانا اور اس پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کا مضبوط ہو جانا اس بات کی علامت بن جاتا ہے کہ انہیں اپنے مسائل کا حل مل گیا ہے اور

کی چہار دیواری سے باہر کی خوبصورتی کے ساتھ سماج کے تمامتر بدصورت مناظر بھی ان کے یہاں جا بجا نظر آتے ہیں جو کہ بدنما داغوں کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ کہیں شہری زندگی کی گہما گہمی میں تنہائی کا عالم چبھن پیدا کرتا نظر آتا ہے تو کہیں گاؤں کے دلفریب مناظر لبھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ظلم و جبر کی داستانیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کہیں رشتوں کا تقدس پامال ہوتا دکھائی دیتا ہے تو کہیں انجانے رشتوں کی پاکیزگی دل کو چھو لیتی ہے۔ کہیں کرداروں کی ظاہری اور باطنی خوبیاں مرعوب کرتی ہیں تو کبھی ان کے کریہہ اور مکروہ کارنامے انسانیت کو شرمسار کرتے ملتے ہیں۔ غرض سماج کا شیرازہ کس طرح بکھر رہا ہے اس کا درد ان کے افسانوں میں ہر روپ میں نظر آتا ہے۔ ترنم ریاض مقامی حالات پر کہانیاں لکھ کر اپنی مٹی کا قرض اور اپنا فرض بھی ادا کرتی ہیں۔ ان تمام موضوعات کو دیکھتے ہوئے جب ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو نسائی آواز ہی بلند نظر آتی ہے۔ عورت ایک مستقل موضوع کے طور پر موجود ہے جسے وہ پوری جمالیات اور حقیقت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ وجود زن سے کائنات کو رنگین کرنے کے لیے ان کے یہاں رومانی فضا بھی ملتی ہے اور سچائیاں بھی کہ دونوں روپ کا امتزاج ہی اصل زندگی ہے۔

اس مجموعے میں شامل ان کا افسانہ ''باپ'' ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جو قاری کو اندر تک جھنجھوڑ دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر تو باہری دنیا کے لوگ گھنونے کھیل کھیلتے ہیں لیکن اس افسانے میں تو باپ ہی حیوان بنا ہوا ہے۔ وہ باپ جس کے ساتھ بیٹیوں کا شفقت، محبت اور محافظ کا رشتہ ہے وہی بھیڑیا بن گیا ہے، ایسے میں سوال اٹھتا ہے کہ آخر بیٹیاں کہاں جائیں؟ کہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں کوئی پناہ گاہ نہیں؟ ایسے ماحول میں ایک بیٹی اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتی ہے۔

اس افسانے باپ ایک شرابی اور ظالم انسان ہے جس نے اپنی بیوی پر زندگی بھر ظلم کیا اور ایک دن اتنا زدوکوب کیا کہ وہ غریب صاحب فراش ہو کر رہ گئی۔ اب اس کی نظر اپنی بیٹیوں پر ہے ماں بے بسی کی مورت بنی سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہے۔ وہ صرف زبان

سے ہی اپنے درد کا اظہار کر پاتی ہے اس کی یہ بے چارگی قاری کو اس کی نفسیات سے واقف ہی نہیں کرواتی بلکہ اس کے درد میں شریک کر لیتی ہے۔ جب وہ بڑی بیٹی کا استحصال کرتا ہے وہ تڑپ اٹھتی ہے اور چیخ پڑتی ہے:

''مر کر بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دوں گی۔۔۔۔ سانپ۔۔۔
اپنے ہی بچوں کو کھاتے ہو۔۔۔ شیطان، درندے۔۔۔ کلیوں کو۔۔۔۔
میری بچیوں پر۔۔۔ میری۔۔۔۔ میری۔۔۔ امی کی سانسیں بے ترتیب
ہو گئی تھیں ان پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میں
تمہیں۔۔۔۔ میں تمہیں کوئی۔۔۔۔۔ سنگسار کیوں نہیں کر دیتا۔۔۔۔''
امی کی آواز ڈوب گئی'' (ابابیلیں لوٹ آئیں گی: ص: ۴۷)

ماں اور بیٹیوں کی اس بے بسی کا حل ان کے پاس نہیں ہے۔ کوئی راہ کوئی روزن نہیں ایسے میں منجھلی بیٹی ساحرہ جو آٹھویں درجہ کی طالبہ ہے، دھن کی پکی ذہین اور محنتی بھی ہے، باپ کی مذموم حرکتوں پر اس کا خون کھولتا ہے، اس جبر کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

''میرے۔۔۔ کپڑے دو۔۔۔ حرا۔۔۔'' وہ غصے سے بھناتا
ہوا کھڑا ہو کر ناظمہ سے مخاطب ہوا اور وہ تھرتھراتی ہوئی باپ کے پیچھے
چلنے لگی۔
ساحرہ نے دیکھا طاقچے کے اکھڑے ہوئے ہوئے حصے کی اینٹ
بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی، اس کے ذرا سا ہلانے سے اس کے ہاتھ میں آ گئی تو
اس نے اینٹ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ باپ
باورچی خانے سے گزرنے والا تھا''

(ابابیلیں لوٹ آئیں گی: ص: ۴۷)

طاقچے کی اینٹ کا ساحرہ کے ہاتھ میں آ جانا اور اس پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کا مضبوط ہو جانا اس بات کی علامت بن جاتا ہے کہ انہیں اپنے مسائل کا حل مل گیا ہے اور

یہ بھی کہ عورت کو اپنے مسائل کا حل خود ڈھونڈنا ہوگا، اسے خود ابابیل بن جانا ہوگا ورنہ وہ اپنے دشمنوں سے پسپا ہوتی رہے گی۔

اس طرح اس افسانے میں جہاں ایک طرف بے بسی ہے ناظمہ کی شکل میں تو وہیں عورت کی طاقت اور قوت ساحرہ کے کردار میں نظر آتی ہے جو عورت کے بدلتے روپ کی غماز بھی ہے۔

''بابل'' بے میل شادی اور لڑکیوں کے ان کہے دکھوں کو بیان کرتا درد بھرا افسانہ ہے جس کا اختتام دھیرے سے قاری کے من میں سوال پیدا کرتا ہے کہ ایسی شادیاں لڑکیوں کے خوابوں کو توڑ دیتی ہوں گی، وہ کیسے اس طرح کے رشتوں کو نبھاتی ہوں گی؟

انجان رشتوں کی ڈور کیسے ایک دوسرے کے ساتھ بندھتی ہے، کیسی مضبوط ہوتی ہے اسے بیان کرتے ہوئے دو افسانے اماں اور پھول ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات تو الگ ہیں لیکن پھر بھی ایک مماثلت ہے وہ ہے ہمدردی اور ممتا کے جذبے کی۔ افسانہ 'اماں' آج کے بدلتے معاشرے میں بزرگوں کے لیے احترام ومحبت کے مفقود ہوتے جذبے کی کہانی ہے کہ کس طرح آج بزرگوں کو خاندان میں غیر اہم کردار کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ ان کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا گھر کے افراد کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ اماں جن کا ایک بھرا پرا خاندان ہے لیکن وہ تنہا ہیں۔ کسی کو ان کے کہیں چلے جانے اور دیر رات تک گھر لوٹ کر نہ آنے پر بھی کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ افسانہ نگار افسانے کے آخر میں ان کے درد کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''اندر اماں چپ چاپ سوئی تھیں۔ نرم گرم قالین پر۔ باہر بارش تیزی سے برستی جا رہی تھی۔ اماں کو لینے کوئی بھی نہیں آیا تھا شاید اس لیے کہ اگر کسی کو آنا ہوتا تو وہ گھر سے نکلا ہی کیوں کرتیں؟''
>
> (ابابیلیں لوٹ آئیں گی: ص: ۷۲)

اختتامیہ جملہ قاری کے سامنے پوری صورتحال واضح کر دیتا ہے۔

ترنم ریاض کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے۔ کشمیر کا ذکر آتے ہی ''فردوس برروئے زمیں است'' کا تصور ذہن میں آتا ہے لیکن دوسرے ہی پل اس وادی کے چناروں سے اٹھتے شعلے دل کو اداس کر دیتے ہیں۔ ایسے میں اس خطے سے تعلق رکھنے والی ادیبہ وہاں کے درد سے کیسے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ ترنم ریاض نے بھی اپنے افسانوں میں وہاں کی خوبصورتی کو اور وہاں کے لوگوں کی زندگی کی تلخ سچائیوں کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ کشمیر کے جلتے سلگتے حالات کو موضوع بناتے وقت ان کا قلم وہاں کے تلخ اور نا قابل برداشت دلسوز واقعات کو بیان کرتے ہوئے سفاک سا ہو جاتا ہے جو کہ ایک فطری عمل ہے جس کا تقاضا وہاں کی سرزمین ہر فنکار سے کرتی ہے۔ ترنم ریاض پوری ایمانداری کے ساتھ اس واجب قرض کو ادا کرتی ہیں۔ 'مٹی' افسانہ جس میں وہ وہاں کے سیاسی، سماجی ماحول ہی کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ روح کو لرزا دینے واقعات و حالات بھی بڑی جرات کے ساتھ لکھ ڈالتی ہیں۔ کشمیر جہاں نا مساعد حالات کے باوجود نوجوان ایک خواب جنوں لے کر چلتے ہیں لیکن حالات ان کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں اور انہیں لق و دق صحرا میں بھٹکنے میں مجبور کر دیتے ہیں۔ وہاں کے لوگ کس طرح کی اذیت ناک زندگی جی رہے ہیں اس افسانے میں حقیقت نگاری عروج پر ہے اس لیے یہ افسانہ قاری کو کردار کے ساتھ درد کے صحرا میں لے جاتا ہے۔ مرکزی کردار ہلال احمد ایک ہونہار ذہین طالبعلم ہے جو کالج میں انجینیرنگ کی پڑھائی کر رہا ہے، پورے خاندان کی امیدوں کا مرکز ہے۔ ایک دن کالج سے لوٹنے کے کچھ دیر بعد ہی تلاشی کے لیے اعلان ہونے لگتا ہے تمام لوگ جس حالت میں ہوتے ہیں فوراً باہر نکل کر میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ وردی پوش ایک کے بعد ایک گھر میں گھس کر تلاشی کے نام پر لوٹ مار کرتے ہیں۔

''اندر گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی، تلاشیاں لینے والے ایک گھر کبھی دوسرے گھر میں آ جا رہے تھے۔ ایک وردی پوش جب ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جانے والا تھا تو اس کی پتلون کی پچھلی جیب میں سونے کی چین جھانک رہی تھی وہ جلدی میں شاید اسے

اچھی طرح ٹھونس نہیں پایا تھا۔

میری۔۔۔۔میری۔۔۔بچی کی ہے۔۔۔اس کی شادی کے لیے۔'' ہلال احمد کا ہمسایہ غلام حسن زور سے بولا اور بھاگ کر وردی پوش کے پاس پہنچ گیا۔لڑکی باپ کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور کچھ دوری پر رک گئی۔

''خاموش بڈھے۔۔۔دیش دروہی۔'' طاقت نے بوڑھی کمزور ٹانگوں پر تندرست لات ماری بوڑھا لڑکھڑایا، گرا اور اس کا پاؤں پکڑ لیا۔

خدا کے لیے میری۔۔۔

'چھوڑ حرام خور۔۔مفت کا کھا کھا کر طاقت آ گئی ہے۔راشن پر سبسڈی ملتی ہے ہم کو ہی آنکھ دکھاتا ہے۔''

مجمع میں سے ہلال احمد کا باپ اس ظلم کے خلاف بول پڑتا ہے نیتجتاً اسی وقت اس کی آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔ظلم کی روح کو لرزا دینے والی یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔

> '' کہتے ہیں کہ اس رات وردی والے آدھی رات کو پھر آئے تھے۔۔۔غلام حسن اس دن سے خون تھوکتا ہے اور اس کی بیٹی اس رات سے بول نہیں سکتی، جب بھی نظر آتی ہے کسی کونے میں دبکی یا دیوار سے چپکی ہوئی۔کسی کے بلانے پر ایسے چونکتی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو''۔
>
> (ص:۷۸)

یہ واقعات ہلال احمد کی زندگی بدل کر رکھ دیتے ہیں اور اسے ایک اندھیری دنیا کا واسی بنا دیتے ہیں ۔

> ''وہ ماں کی باہوں کا حلقہ توڑ کر نکل آیا کچھ قدم چل کر ٹھہر گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ لمحوں کے لیے پتھر کے بت کی طرح جامد و ساکت آنکھیں پھیلائے ماں کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

جانے اسے کدھر جانا تھا۔''   (ابابیلیں لوٹ آئیں گی:ص: ۷۸)

وادی کے ایسے ہی سلگتے موضوع پر لکھا افسانہ 'برف گرنے والی ہے' جس میں بھی نوجوان غربت سے تنگ آکر اندھیری گلیوں کا راستہ ہی منتخب کرتا ہے۔ یہ راستہ اختیار کرنا ان کی کیسی مجبوری ہے وہ ان چند جملوں سے واضح ہو جاتی ہے۔

''جب تک جان ہے تب تک بھوک لگے گی ناماں۔ تمہیں لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے۔ میں جلدی آؤں گا۔ تم فکر مت کرنا۔ جب میں آؤں گا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤں گا، اور مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا۔ اچھا بابا۔۔ خدا حافظ'' جاوید احمد نے تیزی سے باہر نکل کر کواڑ بند کر دیئے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا بائیں جانب کی گلی میں مڑ گیا۔

''ارے بیٹا سنو تو۔'' حاجرہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی مگر شدید دھند میں جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا البتہ کہرے سے نم راستے پر پھٹے تلے والے جوتوں کے گھسیٹے جانے کی سماعت سے دور ہوتی ہوئی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی۔''

(ابابیلیں لوٹ آئیں گی:ص: ۱۸۵)

ان جملوں میں مصنفہ نے وادی کے کرب کو جس دلدوز انداز میں پیش کر دیا ہے وہ قاری کے دل کو تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہ صرف وہاں کی غربت کو بتاتی ہیں بلکہ نوجوانوں کے لیے ان سخت ترین حالات میں کونسا راستہ بچا ہے وہ بھی واضح کر دیتی ہیں۔ ایک دھند ہے جس میں کچھ بھی صاف نہیں ہے، مستقبل کے نشان نہیں۔ ایک راستہ ہے جہاں سے غربت سفر کرتی ہے وہ ٹیڑھا میڑھا ہے جس پر قدم غیر متوازن ہیں۔

وادی کے نوجوانوں کی زندگیوں کا یوں برباد ہو جانے پر ایسا لگتا ہے جیسے یہ دلفریب قدرتی مناظر، وادئی جنت نشاں چنار کے یہ درخت سب بدل گئے ہیں۔ وادی کی جنت کے معنی اب جنت کے نہیں رہے سکون و راحت نہیں، چنار کے درخت اب شعلہ نشان

بن چکے ہیں ،نسلوں کو جلانے لگے ہیں برف پوش پہاڑوں نے وادی کو سیراب کرنے کے بجائے برف کے تودوں میں اپنے ہی لوگوں کو دفن کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔
ترنم ریاض کے یہ افسانے بھی مجموعے کے عنوان سے مطابقت رکھتے ہیں اور ابابیلوں کی آمد کے شدت سے منتظر نظر آتے ہیں۔

افسانہ کیا اچھی صورت بھی' معصوم بچوں کو اغوا کر اپاہج بنا کر بھیک منگوانے والے گروہ کا پردہ فاش کرتی ہے۔ مظلوم راہل کی یہ کہانی بڑی دردانگیز ہے جس کے پیر میں زخم ہے اور زہر جسم میں پھیل گیا ہے اسے ایک سوشل ورکر کے ذریعے رہائی تو مل جاتی ہے لیکن ماں سے ملنے سے پہلے ہی اس کا دم بھی آخر ہو چکا ہوتا ہے۔
''شیرنی'' ایک ایسی لڑکی کا افسانہ ہے جو بہت بہادر ہے کسی جانور سے نہیں ڈرتی بلکہ بہادری سے ان پر وار کر کے ختم کر دیتی ہے ،وہ اپنے مویشیوں کی حفاظت کے لیے راتوں میں درندوں کو تلاش کر مار دیتی ہے لیکن وہ ایک دن بہت بری طرح ڈر جاتی ہے وہ کس چیز سے ڈر گئی کا تجسس قاری کے ذہن میں افسانے کے ابتدائی جملوں سے پیدا ہوتا ہے جو افسانے کے اختتام پر ختم ہوتا ہے۔

> ''میں ڈر گئی ۔۔۔بی بی ۔۔۔۔جی ۔۔۔'' نجمہ نے گھبراتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔سانس پھولا ہوا تھا اور خوف زدہ پھٹی آنکھوں ناک کچھ اس طرح سکڑی ہوئی تھی کہ ناک سے ملی ہوئی ایک لکیر سیدھی پیشانی کے درمیان تک جا رہی تھی۔'' (افسانہ کی ابتدا ص:۱۸۶)

> ادھر اوپر ایک پاؤں ادھر کو لٹکائے ایک مونچھ والا لڑکا بیٹھا تھا جی ۔۔۔میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب ۔۔۔دیوار پر چڑھا ہوا۔۔۔۔۔میں ڈر گئی۔۔۔ (افسانہ کا اختتام ص:۱۹۱)

یہ افسانہ قاری کو سوال بنا دیتا ہے جس کا جواب آخری سطروں میں ملتا تو ہے لیکن

سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس دور میں درندوں سے نہ ڈرنے والی لڑکی انسان سے ڈر گئی یعنی انسان درندوں سے بھی بڑا درندہ۔ 'شہر' افسانہ ان کا نمائندہ افسانہ ہے جس میں شہری زندگی کی چکا چوند کے پردے میں چھپی تنہائی کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور سے فلیٹ کلچر میں لوگ کس طرح ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے ہیں چاہے ان کے درمیان صرف ایک اینٹ کی دیوار ہو لیکن وہ سیمنٹ ریت اور اینٹ سے بنی ہونے کے باوجود آہنی دیوار ثابت ہوتی ہے جس میں کسی قسم کے روزن کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کے پار دیکھنا کسی کو گوارا نہیں ہوتا ایسے میں ایک عورت کا اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ وہاں رہنا اور پھر مر جانا، بچوں کا دروازے کی چٹخنی تک ہاتھ بھی نہ پہنچ پانا، بڑے ہی دلدوز انداز میں لکھا گیا افسانہ ہے جو گاؤں کے خلوص اور شہر کی بے مہر زندگی کو ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ترنم ریاض کے اس مجموعے میں شامل دیگر افسانے، ایجاد کی ماں، پھول، متاع گم گشتہ، آبلوں پر حنا، برآمدہ وغیرہ ان کی بہترین پلاٹ سازی، جذبات نگاری بطور خاص جزئیات نگاری کی وجہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

ترنم ریاض کے ذہن و دل کو ارد گرد اور دور و پاس رونما ہونے والے مسائل و واقعات جھنجھوڑتے ہیں وہ نہ صرف انہیں دیکھتی سنتی اور مشاہدہ کرتی ہیں بلکہ ان میں ڈوب جاتی ہیں۔ کرداروں میں اتر جاتی ہیں۔ وہ دریائے جہلم کے کنارے سے ہی اس کی گہرائی ناپ لینے کی قائل نہیں بلکہ اس گہرائی میں اتر کر کردار کے الم کو محسوس کرتی ہیں پھر الفاظ کا پیرہن عطا کر اسے کائناتی غم بنا دیتی ہیں۔ واقعات کو آفاقیت عطا کرنا ان کا ہنر خاص ہے اور یہی ہنر انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

ترنم ریاض کی افسانوی ریاضت وانفرادیت

ڈاکٹر قسیم اختر
اسسٹنٹ پروفیسر، ڈی.ایس.کالج کٹیہار (بہار)

ترنم ریاض نے نہ صرف خواتین تخلیق کاروں میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے بلکہ انھوں نے نوّے کی دہائی کے بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں میں اپنا دبدبہ قائم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانوی آواز مرد اور عورت تخلیق کاروں کے درمیان بہ آسانی سنی جاسکتی ہے۔ان کی انفرادیت کی کئی وجوہات ہیں۔اول، یہ کہ انھوں نے تواتر سے افسانے لکھے۔تقریباً نصف درجن ان کے افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔گویا ترنم ریاض کی افسانوی ریاضت نے ان کے لیے تجربات کی راہیں ہموار کردیں۔ تجربات کی جدت اور موضوعات کی ندرت کی بنا پر فن کار اپنی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ترنم ریاض اس پہلو سے آگاہ تھیں۔انھوں نے تجرباتی سطحوں پر پھونک پھونک قدم رکھا اور تہذیبی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے قدیم تہذیب اور جدید احساسات کو مدغم کردیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جہاں پرانے معاملات تہذیبی پس منظر میں ابھرتے ہیں، وہیں نئے طور طریقوں سے پیدا شدہ المیہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔کیوں کہ ترنم ریاض نے کشمیری معاملات کے اظہار کے ساتھ ساتھ شہری رویوں کو ترجیحی بنیاد پر اپنے فکشن میں شامل کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ

موجودہ عہد کے افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض خصوصی مسائل برتنے کی وجہ سے اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے اکیسویں صدی کی برق رفتار ترقیوں اور گم ہوتی پرانی تہذیبوں سے اپنا بیانیہ خلق کیا ہے۔ ان کے بیانیے میں شہری مسائل نے اپنا وافر حصہ طے کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترنم کے افسانوں میں کشمیر کا دیہی پس منظر اور کشمیر سے باہر کا شہر، مکمل آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صارفیت کے زیر اثر پیدا ہونے والے خیالات بھی ان کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں۔ ترنم ریاض نے صارفیت اور مادیت سے شادی کے نظام کو بھی جوڑا ہے۔ گویا آج شادی بیاہ میں مادیت پرستی ایک توانا عنصر بن کر سامنے آتا ہے۔ اس توانائی میں سماج کا مکمل نقشہ تتر بتر نظر آتا ہے۔ ذیل میں ہم ترنم ریاض کے چند افسانوں کے فکری، فنی، لسانی اور موضوعاتی سروکار کا تجزیہ کریں گے، تاکہ ان کی انفرادیت سامنے آسکے۔

ترنم ریاض کا ایک افسانہ ''مائیں'' ہے جس میں انھوں نے ممتا کی پیکر تراشی کی ہے کہ ماں کے اندر جو ترحم کا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ بڑھتی عمر کے ساتھ کم نہیں ہوتا ہے۔ ماں ہمیشہ ماں ہی رہتی ہیں۔ بچوں کی شادی بھی ہوجائے تو بھی ماں کے سامنے بچہ بچہ ہی رہتا ہے۔ ترنم بنیادی طور پر اس افسانے میں دو ماؤں کو پیش کر کے معاشرتی طور پر ہمیں گدگدایا ہے۔ ایک ماں ہے، دوسری ان کی بیٹی ہے۔ بیٹی کی شادی ہوگئی ہے اور بیٹی کے پاس بھی بچے ہیں۔ گرمی سے بے حال ہونے والی بیٹی کے لیے ماں پریشان ہوجاتی ہیں اور بیٹی اپنے بچوں کے لیے پریشان رہتی ہے۔ جب بیٹی اپنی ماں کی کیفیت دیکھتی ہے کہ وہ کس طرح پریشان ہے تب بیٹی کے اندر ماں کی محبت جاگ جاتی ہے۔ اس افسانے میں ترنم ریاض نے کوئی فلسفہ پیش نہیں کیا بلکہ سادگی سے ایک کہانی پیش کی ہے اور افسانے کے کردار جذبۂ ترحم کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو ترنم ریاض گہرائی میں اترتی ہیں اور کرداروں پر غور وفکر کرنے کے بعد کہانی بنتی ہے۔ گویا وہ آپ بیتی میں جگ بیتی کے عناصر پیوست کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ترنم ریاض نے تخیلات یا پھر دور از کار تشبیہات کے

سہارے اپنی کہانیوں کو ماورائی کیفیتوں سے دوچار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ انھوں نے عام فہم لفظوں اور عام واقعات میں غیر معمولی فکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں تفہیم کے لحاظ سے بھی آسان ہوتی ہیں اور لفظی ساخت کے لحاظ سے بھی۔

ترنم ریاض کے مذکورہ افسانے میں سماجی رویہ، پرانی قدریں، ممتا کی کیفیتیں، عورتوں کی نفسیات اور بچوں کی پرورش کے معاملات کو انتہائی شان دار طریقے سے پیش کر دیا گیا ہے۔ کہانی پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترنم ریاض نے کوئی کہانی نہیں پیش کی ہے بلکہ اپنے نجی واقعے کو تخلیقی پیراہن عطا کیا ہے۔ کیوں کہ ترنم ریاض ہندوستانی قدروں کی پرستار تھیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں اور تقریروں میں ہمیشہ ہندوستانی تہذیب کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ایسے خیال کو پیش کیا جس سے سماج میں طمانیت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ گویا وہ سماج میں اترتی ہیں اور سماجی مسائل پر توجہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد حالات کا تجزیہ کرتی ہیں۔ ''مائیں'' افسانہ سے ایک اقتباس دیکھیں:

> ''آیئے اس چارپائی پر لیٹ جایئے۔ میں نے دیوار کے ساتھ چارپائی جلدی سے بچھائی۔ آیئے۔ میں تو بھول ہی گئی''۔ امی چارپائی پر لیٹ گئیں تو میں نے ایک اطمینان بھری نظر ان پر ڈالی۔ لیکن مجھے اپنے حلق میں کچھ اٹکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر پل بھر کے بعد میں نیچے کو چل دی''۔ (۱)

مذکورہ اقتباس میں دیکھیں کیسے ترنم ریاض نے جذبات اور ممتا کو تصادم آشنا بنا دیا ہے۔ بیٹی پہلے اپنے بچوں کو سکون پہنچانے میں مصروف تھیں اور اسے ماں کا خیال نہیں تھا، مگر جب اس کو ماں کا خیال آیا اور ماں کی کیفیت دیکھی تو ماں کی خدمت میں لگ گئی۔ ماں کی حالت تھوڑی بحال ہوئی تو وہ پھر اپنے بچوں کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔ اس طرح دیکھیں تو ترنم ریاض نے اس افسانے میں دونسلوں کے جذبات اور ممتا کو اچھی طرح پیش کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترنم ریاض نے محسوسات کی بنیاد پر کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ تجربات کو کہانی کا پیراہن عطا کیا ہے۔

ترنم ریاض کی دوسری کہانی ''بابل'' ہے۔اس کہانی میں انھوں نے غیر برابری کی شادی کو انتہائی شاندار طریقے سے پیش کیا ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس میں مادیت کا زور نظر آتا ہے تو زیادہ مناسب بات ہوگی۔ کیوں کہ ماں باپ بھی ایسی شادیوں کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ بچیوں سے کہیں زیادہ ماں باپ بیٹی کی شادی میں مادیت کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ترنم ریاض نے گویا اس کہانی میں غیر برابری کی شادی کو نشانۂ تنقید بنایا ہے اور پرسکون انداز میں مادیت پرست والدین کو نشانۂ تنقید بنایا ہے۔اس لیے انھوں نے اس افسانے کو غیر برابری کے مرکز پر لا کر چھوڑ دیا ہے:

> ''بہر حال چشمے والا آدمی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پلیٹ فارم سے لے جانے لگا۔اس نے لڑکی کا سر دوسرے ہاتھ سے اپنے اس شانے پر ٹکا دیا تھا جہاں لڑکی کے والد نے پہلے سے ایک شال رکھا ہوا تھا۔... اوہ...تو وہ اس کا جیٹھ نہیں شوہر تھا۔ مجھے سینے کے اندر اپنا دم قید ہوا محسوس ہونے لگا۔لڑکی سوگوار سی چل رہی تھی۔دونوں دیوار سے کچھ فاصلے پر ہنستے ہوئے آرہے تھے۔''(۲)

مذکورہ اقتباس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح ترنم ریاض نے غیر برابری کی شادی کو نشانۂ تنقید بنایا ہے۔اس افسانے میں ترنم ریاض نے درد بھرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ اکیسویں صدی میں مسلم سماج کی لڑکیاں کس قدر بے دست و بازو ہیں کہ انھیں شادی کے معاملے میں بھی پسند اور ناپسند کا اختیار نہیں ہے۔ترنم نے یقیناً موجودہ عہد کی ایسی کہانی میں درد بھر کر سماج کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ترنم نے افلاطونی خیالات اور ملکوتی انداز سے سروکار نہیں رکھا ہے، بلکہ ان کے موضوعات سوال بن جاتے ہیں اور سماج سے سوال کرتے ہیں کہ ایسے حالات میں ایک لڑکی کی کیا قدر و قیمت ہے۔گویا ترنم ریاض زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ اُس عہد کی لڑکیاں بہتر تھیں، جب انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔انھیں ایک دفعہ ہی ختم کر دیا جاتا تھا،مگر آج تو غیر برابری کی شادی سے

ایک لڑکی ہزار دفعہ مرتی ہے۔ ترنم ریاض نے اسی خیال کو مرکزی نکتہ عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترنم ریاض اپنی کہانی میں ایک سوال بن جاتی ہیں اور سماج سے بار بار پوچھتی ہے۔

''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''میں شامل افسانہ''شہر'' ایک انتہائی کامیاب افسانہ ہے اور ترنم ریاض کے تخیل کی بے مثال کہانی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اس افسانے میں شہری معاملات کی علتوں اور پریشانیوں کو انتہائی شان دار رخ دیا ہے۔ اس کہانی میں ترنم ریاض نے شہر کی خوفناکی کو ایک الگ زبان دی ہے۔ شہری زندگی میں لوگوں سے لاتعلقی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ لوگ اپنی غرض سے ہی مطلب رکھتے ہیں۔ افسانے سے پہلے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ممی''اس نے ممی کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا مگر ممی بے حس و حرکت پڑی رہیں۔ وہ کچھ دیر گم سم سا بیٹھا رہا۔ پھر ثوبیہ کے قریب جا کر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھے۔
>
> ''نہیں رونا ثوبی''ممی سو رہی ہیں، مگر ثوبی تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔
>
> ''چپ ہو جا''۔ وہ چیخا اور ساتھ ہی ڈھاریں مار مار کر رونے لگا۔''
> جانے کب تک دونوں بہن بھائی روتے رہے مگر امی نے چپ ہی کرایا نہ کچھ بولیں۔''(۳)

اس افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک ماں اپنے دو بچوں کے ساتھ نئے شہر میں آئی ہیں۔ وہ برسر روزگار ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بچے ہیں۔ بند فلیٹ میں ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ دونوں بچے اس قابل نہیں ہیں کہ موت کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔ اس لیے وہ بچے ماں ماں چیختے ہیں، چلاتے ہیں کہ ماں ان کو کچھ کھانے پینے کو دیں، مگر ماں کی موت واقع ہو گئی ہے۔ جب ماں کی بو ادھر ادھر پھیلتی ہے تو ماں کی موت کا پتا چلتا ہے۔

ترنم ریاض کی یہ کہانی ان کی اکثر کہانیوں پر بھاری ہے۔ کیوں کہ انھوں نے نہ

صرف شہری مزاج کا تجزیہ کیا، بلکہ خوفنا کی کے ساتھ آنے والے زمانے کی پیشین گوئی بھی کردی کہ آئندہ فلیٹوں کی کیا صورت حال ہوگی۔ دیہی تہذیب میں لاکھ خود غرضیاں ہوں، تاہم دیہات میں یک گونہ محبت ومؤدت احساس ہوتا ہے۔ اپنائیت ہوتی ہے۔ انسان ایک دوسرے کے درد میں شریک ہوتا ہے، تاہم شہر نے انسانوں سے انسانیت چھین لینے کی قسمیں کھالیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترنم ریاض نے شہر کے مسائل کا جس انداز سے تذکرہ کیا، اس کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے شہری مزاج سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ کرلیا ہے اور امکانی مسائل پر افسانہ بننے کی کوشش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترنم ریاض نے لکھنے سے زیادہ سوچنے پر وقت خرچ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کی فضا خوفنا کی اور امکانی مسائل سے لبریز ہے۔

کامیاب تخلیق دراصل وہی ہوتی ہے جو اپنی حس کی بنیاد پر آئندہ کے حالات کی جھلکیاں دکھادے۔ ترنم ریاض کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے حالات سے پیدہ شدہ معاملات سے مستقبل میں برآمد ہونے والی خطرنا کی کا اندازہ کرلیا ہے اور اپنے قاری کو زمانے کی سنگلاخی سے باخبر کردیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ترنم نے شہری مسائل پر گہرائی سے غور وفکر کیا ہے اور کشمیر کے دیہات اور وہاں کے نازک حالات کی عکاسی کی ہے۔ رہی بات زبان وبیان کی تو یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ناولوں سے کہیں زیادہ افسانوں میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ ان کے افسانوں کی زبان میں جو سلاست ہے وہ ان کے ناولوں میں نظر نہیں آتی ہے۔ ان کے اسلوب کے بارے میں وارث علوی لکھتے ہیں:

> ''ان کے اسلوب میں شاعرانہ ہتھ کنڈوں کا استعمال نہیں۔ وہ سازینہ بھی نہیں جو کھنکتے لفظوں کے جل ترنگ سے پیدا ہوتا ہے۔ رومانی تخیل کی وہ فضا آفرینی بھی نہیں جس میں مدھر میٹھے لفظوں کی رِم جھم برسات ہوتی ہے۔ ایسی کوئی چیز ترنم ریاض کے یہاں نہیں، غنائیت ہے گو ہم نہیں

جانتے ہیں کہ اس کا سر چشمہ کہاں ہے۔" (۴)

سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اسلوب کو ثقیل کرنے یا پھر لفظی طور پر دھونس جمانے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ فطری انداز سے انھوں نے اپنے افسانوں کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے اسلوب کا فطری پن ایک بڑی نعمت ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ہر جگہ کہانی کے تقاضے کے مطابق زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

ترنم ریاض نے مکالمے کے ذریعے غیر ضروری طور پر کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ کہانی کی فنی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ ترنم ریاض یقیناً اپنی معاصرین عورتوں میں حد درجہ نمایاں ہیں۔ ان کی افسانوی فضا میں ہمارا سماج اس قدر رچا بسا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے معاملات کو انگیز کرنے لگ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ترنم ریاض نے اپنی کہانیاں کتابوں سے اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ انھوں نے اپنی نظر سے واقعے کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اور دیکھے ہوئے واقعات میں اپنا نظریہ شامل کر دیا ہے۔ اس طرح ان کی کہانیاں تجربات اور مشاہدات کے تصادمات سے سامنے آتی ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ان کے افسانوں کے متعلق لکھا ہے:

"ترنم ریاض کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ کسک ہے جسے ایک ٹیس کی طرح ان فسانوں کے بطن میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان افسانوں کا ماحول اور سارا سیاق بے حد خاموش آگیں ہے، لیکن اسی خامشی کے اندر جو بلا کا شعور برپا ہے، اسے ان کا قاری بہت جلد محسوس کر لیتا ہے۔ ترنم ریاض میں چیزوں کو ان کے اندر اتر کر دیکھنے کی جو صلاحیت ہے وہ ایک افسانہ نگار کے لیے بڑی نیک فال ثابت ہوتی ہے۔" (۵)

قاری کو متاثر کرنے میں افسانے کی زبان اور موضوع اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ترنم ریاض کے یہاں موضوعات کی جدت ہے بلکہ یوں کہیں کہ پرانے موضوعات کو باندھنے کا نیا انداز انھیں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوع میں خوفنا کی پیدا ہو جاتی

ہے۔ کیوں کہ ہمارا موجودہ معاشرہ ایک خوفناک معاشرہ ہے۔ اس معاشرے کی سچی تصویر کھینچنے کے لیے خوفناکی کا سہارا لیناضروری ہے۔ الغرض ترنم ریاض نے شہری معاملات سے جونتائج اخذ کیے ہیں اور نتائج کو جو تخلیقی رنگ عطا کیا ہے، وہ انتہائی خوب ہے۔ کیوں کہ انھوں نے تہہ داری میں اتر کر مسائل کو انگیز کیا ہے اور اس انگیزی سے ان کے افسانوں میں اثر پذیری پیدا ہوگئی ہے۔

☆☆

حواشی :

(۱) ترنم ریاض، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، 2002، ص 137۔

(۲) ترنم ریاض، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، 2002، ص 108۔

(۳) ترنم ریاض، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، 2002، ص 167

(۴) وارث علوی، گنجفہ باز خیال، موروڈن پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007، ص 123۔

(۵) ماخوذ فلیپ، ابابیلیں لوٹ آگئیں گی۔

☆☆☆

ہم تو ڈوبے ہیں صنم

''ہوسکتا ہے یہ میری آخری خواہش ہو.... تم سے .... کچھ........ میں آخری بار مانگ رہاں ہوں شاید۔'' شاہد نے نادیہ کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''مجھے..... ڈر لگ رہا ہے...... ایسا مت کہو.....'' نادیہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''کس بات سے......؟ میری خواہش سے......یا میرے اندیشے سے۔''

شاید مسلسل اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔نادیہ نے پلٹ کر اُس کے چہرے پر نظر ودوڑائیں ۔شاید کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ جیسے شک ، طلب، التجا اور نہ جانے کیا کیا ایک ہی جگہ جمع ہوں۔

نادیہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور گلوکوز کی نلی میں شاہد کے جسم میں داخل ہونے والے پانی کی رفتار دھیمی کردی۔

''سردی لگ رہی تھی نا.....؟'' اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاتھ ..... تمھیں کیسے.....؟؟'' اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا ہی تھا کہ نرس اندر داخل ہوئی۔

''وقت ختم ہوگیا ہے....... اب مریض کو آرام کرنے دیجیے۔''

آج شاید کیسی باتیں کررہا ہے.....گھر پر ثمرین بھی اکیلی ہے۔نادیہ سوچنے لگی۔

''بابا کیسے ہیں امّی ؟'' کل نادیہ کے ہسپتال سے لٹنے پر اُس کی گیارہ سالہ بچی ثمرین نے پوچھا تھا۔

''اب شاہد بہتر ہیں کچھ۔''

نادیہ نے پرس مسہری کی طرف اچھال دیا تھا اور کرسی پر نیم دراز ہوگئی تھی۔

''پانی لاؤں امّی ؟'' ثمرین ماں کے قریب چلی گئی تو اُس نے ثمرین کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''نہیں بیٹا۔تم بس میرے سینے لگ جاؤ۔''

نادیہ نے اُس کا سر اپنی چھاتی سے لگالیا۔تو اس نے اپنی دبلی پتلی باہیں اپنی امی کی کمر کے گرد ڈال دیں۔

''بابا اچھے ہو جائیں گے تو...... تو...... پھر پہلے ک طرح...... آپ سے لڑیں گے..... آپ کو ماریں گے.....''

ثمرین فرش پر بیٹھ گئی اور اپنا سر ماں کے زانو پر رکھ دیا۔

''نہیں بیٹا....... ایسا کچھ نہیں ہوگا.......''

''بابا بچیں گے نا.......''

''ہاں....... اللہ میاں سے دعا کرو....... وہ رحیم ہے۔کارساز ہے۔'' نادیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

نادیہ نے شاہد کو چاہا تھا۔عیش و آرام ٹھکرا کر اس کی متوسط زندگی اپنائی تھی...... اُسے محبت کے علاوہ اور کچھ نہ چاہئے تھا

مگر اُسے جلد ہی علم ہو گیا کہ شاہد گھر گرہستی کا کچھ ایسا شوقین نہیں ہے۔جانے کتنی دوستیں تھیں اس کی۔راتوں کو تک غائب رہا کرتا وہ۔

گھر میں تناؤ تھا۔

نادیہ نے اُس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔وہ بات کرتا تو جواب دے دیتی۔

شاہد اکثر غصے میں نظر آتا۔
کوئی چار ایک برس پہلے کی بات ہے۔
اُن دنوں نادیہ دوسری بار امید سے تھی۔
ثمرین اپنی ماں کے پیٹ پر کان دھرے لیٹی تھی۔
''بھیّا کی شکل کیسی ہوگی امی؟'' وہ ماں کے ابھرے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔
''تمہارے جیسی..... پیاری پیاری سی۔''
''بابا جیسی تو نہیں ہوگی نا۔'' اُس کے لہجے میں ہلکی سے تشویش تھی۔
''ہوسکتا ہے..... تمہارے بابا کی شکل بھی تو اچھی ہے۔'' نادیہ سیلنگ کی طرف دیکھتی رہی۔
''مگر اگر وہ بابا کی طرح غصّہ کرے گا.... تو.... تو؟''
ثمرین پریشان سی ہو کر بولی۔
''نہیں بیٹا.... وہ تو چھوٹا سا مُنّا ہوگا.... وہ کیوں غصہ کرے گا.... اپنی ننھی سی باجی کو بہت پیار کرے .... بہت عزت کرے گا تمہاری۔''
نادیہ نے انگلی کے پوروں سے ثمرین کا رخسار چھوا۔
''امّی؟''
''جی!''
''صرف بھائی ہی بہن کی عزت کرتا ہے....یا.... اور کوئی..... بھی؟...... کیا بابا آپ کی عزت کرتے ہیں؟''
''ہاں...... شاید......''
''پھر آپ کو بری بری باتیں کیوں کہتے ہیں......؟''
''وہ...... شاید...... اُن کی عادت...... ہے۔''

''یہ تو گندی عادت ہے...... اُن کو دادی جان نے بتایا نہیں؟''
''کیا معلوم...... وہ تو بہت پہلے اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں۔''
''ہم بھیا کو بہت اچھی باتیں سکھائیں گے۔''
''انشاءاللہ۔''
''اُسے بابا جیسا نہیں بننے دیں گے۔'' ثمرین نے آنکھیں موندھی ہی تھیں کہ اُس کی سماعت کے قریب ہی ایک دھماکہ ہوا۔
''کیا پٹی پڑھا رہی ہو بیٹی کو؟'' یہ آواز شاہد کی تھی۔
وہ دونوں مارے گھبراہٹ کے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔
ثمرین سہم کر ماں سے لگ گئی۔ نادیہ متعجب سی شاہد کو دیکھنے لگی۔
''کیا سکھا رہ ہو اسے۔؟'' شاہد پاس جا کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ نادیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''میں پوچھتا ہوں کیا سکھا رہی تھیں اسے تم۔'' اُس نے نادیہ کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجھوڑے تو ثمرین جلدی سے مسہری سے اُتر کر دیوار سے لگ گئی اور سہمی سی دونوں کو دیکھنے لگی۔
''امی۔'' شاید کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پکارا بھی تھا۔
نادیہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے ایک جھٹکے سے شاہد کے ہاتھوں کو اپنے شانوں سے ہٹایا اور مسہری سے اُتری۔ ابھی اُس نے پاؤ فرش پر رکھے ہی تھے کہ شاہد نے پوری طاقت سے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ چیخ مار کر منھ کے بل مسہری پر گر پڑی۔ اُس نے گھٹنے مسہری کے کنارے سے ہوتے ہوئے زمین سے الگ گئے۔ ثمرین ہچکیاں لے کر روتی ہوئی، باپ کی جانب خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ماں کی طرف بڑھی تو شاہد کمرے سے باہر نکل گیا۔
''امّی...... امّی......'' اُس نے ماں کا چہرہ اپنی طرف موڑا تو دیکھا کہ امی کی

ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ لپک کر غسل خانے سے تولیہ لے آئی اور ماں کی ناک اور چہرہ صاف کرنے لگی۔ ماں کے گال پر انگلیوں کے سرخ نشان آبلوں کی مانند اُبھر آئے تھے۔

''ثمرین۔'' نادیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور زور سے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا اور بلک بلک کر روتی ہوئی فرش پر آ گئی۔ ثمرین بے بسی سے روتی ہوئی ماں کو دیکھتی رہی اور اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھتی رہی۔ ماں کی ناک سے خون بہنا بند ہو گیا تھا...... مگر یہ کیا؟...... ماں کے پیروں کے پاس اتنا خون......؟

''امی، کیا ہوا...... پیر میں بھی چوٹ...... کیسے لگی ہے..... دکھایئے..... میں پٹّی کرتی ہوں۔'' ثمرین ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اُس کی اشکبار آنکھوں میں دیکھتی ہوئی اپنے جواب کا انتظار کرتی رہی مگر امی درد سے کراہتی رہی اور ہچکیاں لیتی رہی۔

ثمرین کچھ نہیں سمجھی تھی.... حیرت سے امّی کے پچکے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر چپ چاپ سوچوں میں گم ہو جاتی...... ایک بار امی سے پوچھا تھا تو امّی بہت غمزدہ ہو گئی تھیں...... دوبارہ اُس نے امی سے کبھی نہیں پوچھا۔

چھ ماہ کا حمل ضائع ہونے سے نادیہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ دوبارہ ماں ہو جانے کی امید بھی جاتی رہی۔ پیٹ کے اندر Infection بھی ہو گیا تھا جس کے لیے اُسے مہینوں Antibiotics کھانا پڑے تھے۔ کوئی سال بعد وہ پوری طرح صحت یاب ہو گئی مگر پھر بھی جسم میں خون کی کمی قائم رہی۔

گھر کا ماحول آسیب زدہ سا ہو گیا تھا۔

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔

نادیہ کے اس درجہ تکلیف اُٹھانے کے باوجود بھی شاہد کا برتاؤ نہیں بدلا تھا۔ برسوں سے وہ مستقل طور پر ثمرین کے کمرے میں ہی رہ رہی تھی۔ ادھر ہمیشہ سے اپنی صحت پر فخر کرنے والے شاہد کو اچانک بخار نے آ لیا۔ بخار بھی ایسا کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں، پیٹ میں رہ رہ کر درد اُٹھتا تھا۔ گولیاں وغیرہ آزمائی گئیں۔ فیملی ڈاکٹر کا نسخہ بھی کارگر نہ ہوا تو اُس

نے خون کی جانچ کا مشورہ دیا۔ ان دونوں شاہد نسبتاً کم غصہ کرتا تھا۔ گھر میں تناؤ کچھ کم تو ہو گیا تھا مگر نادیہ کو ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ جیسے وہ جان بوجھ کر چپ رہتا ہو۔ وہ کبھی کبھی نادیہ کو بغور دیکھتا اور دیکھتا چلا جاتا۔

نادیہ کسی فرض سے نہیں چوکتی، اس کی خدمت میں لگی رہتی۔ کبھی شوربہ تیار کر رہی ہے، کبھی پھولوں کا رس نکال رہی ہے۔ بار بار ثمرین کو شاہد کے پاس روانہ کرتی کہ اسے کچھ ضرورت تو نہیں ہے۔ اُس کے کمرے میں مسلسل Room Freshner چھڑکتی رہتی۔

اصل میں شاید کو برسوں سے پائیریا کا عارضہ تھا۔ اُس کے مسوڑھوں سے خون رستا تھا۔ کبھی زیادہ کبھی کم۔ اُسے بار بار کُلّی کرنا پڑتی تھی ورنہ اُس کے سانس سے کچھ زیادہ بدبو آنے لگتی۔ بستر پر پڑے رہنے سے سارے کمرے میں تعفن پھیلا رہتا تھا جس سے نادیہ کو ابکائیاں سی آتیں مگر وہ چپ چاپ سب برداشت کرتی۔ حالانکہ وہ اس تعفن کا خود کو کبھی بھی عادی نہیں کر پائی تھی اور اُسے برداشت کرنے کا وہ مجبور مرحلہ جس سے بچنا اُس کے لیے ناممکن ہو جاتا تھا، ہمیشہ سوہانِ رُوح ثابت ہوا تھا کہ رِشتے کا یہ تقاضا نادیہ کے احساسِ مظلومیت کو پاتال کی قید جیسا بے دست و پا معلوم ہوتا تھا۔ ادھر کچھ برسوں سے الگ کمرے میں رہنے سے اسے اس بدبو سے نجات حاصل ہوئی تھی مگر شاہد کی بیماری کے دنوں میں وہ نہایت مستعدی سے اس کی تیمارداری منہمک تھی۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

خون کی جانچ کے نتیجے کے روز ڈاکٹر نے نادیہ کو فون کر کے تجربہ گاہ بلایا تھا۔ اور اکیلے آنے کی تاکید کی تھی۔

شاہد HIV Positive تھا۔ مگر وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوا اور دوسری جگہ سے خون کی جانچ کروائی گئی۔ نتیجہ وہی تھا۔

پھر اُس کا باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔ انجکشن، دوائیں، ہمدردی، خدمت، سب کچھ میسر تھا اُسے۔ مگر ان چیزوں سے اُسے سکون ملنا ناممکن تھا۔ وہ اب چڑچڑا بھی ہو گیا تھا۔ جب سے نادیہ کے خون کی جانچ صحیح نکلی تھی، شاہد کا رویہ ایسا ہو گیا تھا جیسے اس کی

بیماری کے لیے نادیہ ہی ذمہ دار ہو۔

ملنے والوں کو معلوم ہوا تو کنارہ کش ہو گئے۔ شاہد اب کبھی گھر میں ہوا کرتا کبھی ہسپتال میں۔ نادیہ ہر وقت اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔

کئی مہینوں سے لگاتار ہسپتال میں رہنے کے بعد آج مدّت بعد ڈاکٹر نے اسے گھر لوٹنے کی اجازت دی تھی۔

''تم کیا تیمارداری کا ڈھونگ رچاتی ہو.... انتظار میں ہوگی کہ میں مروں اور تم جلد سے جلد دوسری شادی کرو۔'' ایک دن نادیہ کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے شاہد نے کہا۔

''مگر یاد رکھنا.... تم سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ سب جانتے ہیں کہ تم دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔ بانجھ ہو تم بانجھ .... سمجھیں؟'' اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور نادیہ اُسے پل بھر دیکھتے رہنے کے بعد کسی کام میں مشغول ہو گئی۔

''ہاں کوئی بوڑھا، لنگڑا لولہا ہو تو بات دوسری ہے...... کب کر رہی ہو شادی......؟''

وہ حلقوں میں دھنسی آنکھوں کو پھیلا کر بولا... نادیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''بولو....'' وہ غصے سے چیخا۔

''کیا کہہ رہے ہو.... اپنے حواس کھو چکے ہو کیا۔'' اُس نے تڑپ کر کہا۔

''سبھی عورتیں ایسا ہی کہتی ہیں.... مگر ادھر شوہر کی آنکھ بند ہوئی، اُدھر وہ نیا خاوند تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئیں۔''

نادیہ منہ پھیر کر چپکے چپکے رو دی۔

اُس روز وہ شاہد کو معائنے کے لیے ہسپتال لے گئی تو ڈاکٹروں نے اسے دوبارہ داخل کر لیا۔ جانے اُس روز ڈاکٹر نے نادیہ سے کیا کہا کہ دوپہر میں کچھ دیر کے لیے جب وہ گھر آئی تو ثمرین کو گلے سے لپٹائے کتنی ہی دیر وہ گم سم بیٹھی رہی۔

ہسپتال پہنچی تو ڈاکٹر، شاہد کو درد سے نجات کے لیے انجکشن لگا چکا تھا۔ شاہد

بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ نادیہ نے اس کا چہرہ گیلے تولیے سے صاف کیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے بالوں میں کنگھا کیا۔ آج سے پہلے نادیہ کا چہرہ کبھی اتنا بجھا ہوا نہیں تھا۔ آج وہ پتھر کا متحرک بت معلوم ہو رہی تھی۔

شاہد ہوش میں آیا تو نادیہ نے اُسے جوس کے گلاس کے ساتھ دوا کی ٹکیا بھی دی۔

''زہر تو نہیں دے رہی ہو کہ تمہاری جان کا عذاب ختم ہو۔'' شاہد دوا کی طرف دیکھ کر طنزیہ بولا۔ نادیہ نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی منھ پھیرا...... چپ چپ سی اُسے دیکھتی رہی۔ شاہد کا چہرہ آج سفید پڑ گیا تھا، چہرے کی تقریباً تمام ہڈّیاں ابھری ہوئی تھیں۔

''اس طرح گھور کیا رہی ہو؟.... کیا میں بدستور لگ رہا ہوں.... یا نیم مردہ نظر آ رہا ہوں۔'' وہ غصے سے بولا۔

''نہیں.... ایسا کچھ نہیں.... ایک گلاس اور دوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''نہیں۔'' وہ برجستہ بولا اور بغور اُسے دیکھتا رہا۔

دوسری صبح جب نادیہ آئی تو وہ خاموش اُسے دیکھتا رہا۔

''میرے قریب آؤ...... '' اُس نے آہستہ سے کہا۔

نادیہ اُسے چونک کر دیکھنے لگی۔

''گھبراؤ نہیں...... میں کچھ نہیں کہہ رہا...... '' وہ کچھ نرمی سے بولا۔ نادیہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

''میں تمہارا چہرہ چھونا چاہتا ہوں..... چھونے سے انفکشن نہیں ہوتا۔'' نقاہت کے مارے اُس نے سر پلنگ سے ٹکا دیا۔ اُس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا آنکھیں مندھ رہی تھیں۔ ''ہو سکتا ہے یہ میری آخری خواہش ہو...... تم سے میں .... آخری مرتبہ کچھ مانگ رہا ہوں شاید۔'' شاہد نے آنکھیں کھول کر نادیہ کی طرف ملتجیانہ دیکھ کر کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے.... ایسا مت کہو.... نادیہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''کس بات سے....؟ میری خواہش سے یا میرے اندیشے سے۔'' وہ مسلسل

اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ نادیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شاہد کے چہرے پر کچھ طلب، کچھ التجا، کچھ حسرت، کچھ محرومی اور جانے کون کون سے جذبات ایک ساتھ نظر آ رہا تھا۔

نرس نے وقت ختم ہونے کا اعلان کیا تو وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اور شاہد کو دیکھتی رہی۔ وہ اب ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نادیہ نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا تو شاہد کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی بائیں طرف کی پہلی داڑھ پر خون لگا ہوا تھا۔

نادیہ کے چہرے پر عجب محرومی بھری یاسیت چھائی ہوئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی تو شاہد دھیرے دھیرے اس کی طرف جھکا اور اپنے دونوں کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کے رُخسار تھام کر اُس کے چہرے پر جھک گیا۔ نادیہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی.... شاہد نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے اپنے ہاتھوں کی گرفت اس کے چہرے پر مضبوط کر دی۔ وہ اُس کے لب کو دانت سے کاٹنے کی کوشش میں جب زور سے دباتا چلا گیا تو نادیہ نے چیخ کر ایک جھٹکے سے خود کو اُس کی گرفت سے آزاد کرالیا۔

اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اگر اُس کا ہونٹ ایک ذرا سا بھی زخمی ہو جاتا تو.... تو شاہد کے مسوڑھوں کا...... خون...... اُس نے زندگی میں پہلی بار شاہد کی طرف حقارت سے دیکھ کر زمین پر تھوک دیا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم

ڈاکٹر عالیہ کوثر علی شاہ خان

اصناف نثر میں افسانہ سب سے معتبر صنف ہے اردو ادب کی صد سالہ تاریخ میں افسانے کی مقبولیت اولیت کا درجہ رکھتی ہے، پریم چند سے آج تک اس صنف کو کئی تحریکات و رجحانات نے متاثر کیا بدلتے زمانے کا عکس اس میں بخوبی نظر آتا ہے، معاملات زمانہ کی تصویر کشی شاعری کی طرح افسانے میں زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔

آزادی کے بعد ادب کی دنیا میں کئی انقلابات رونما ہونے موضوعات بدلے خیالات بدلے ایسے جواہر سامنے آئے جنہوں نے اس صنف کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا، ملک کے ہر گوشے میں افسانہ نگاری پر طبع آزمائی ہوتی رہی ہے جب بات ہو کشمیر کی تو اس وادی بے نظیر نے کئی ادیب شاعر فلسفی دئے ہیں۔ ان میں کہنہ مشق شاعرہ فعال افسانہ نگار اور ناول نگار ترنم ریاض کی ریاضتیں بلاشبہ جدید اردو افسانے میں ایک رجحان کا نام ہے۔

وہ ماہر زبان دان تھیں انھیں اردو، انگریزی، کشمیری اور ہندی زبان پر دسترس حاصل تھی، کہانی کے روایتی سانچے کو توڑ کر نئے انداز میں کہانی کو پیش کرنے میں انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انکے افسانوں کا کینوس کافی وسیع ہے ان کی تخلیقات حساس ذہن سماجی و سیاسی رجحانات پر گہری نظر، قومی و بین الاقوامی پر آشوب حالات کا علم اور انکے پر تجسّس ذہن کی عکاس ہیں۔

نسائی شعور نسائی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ مرد اساس معاشرے کے جبر و استحصال کے خلاف احتجاج بلند کرتی ہیں۔ تانیثی لحاظ سے انکے تمام افسانے عصری معاشرے کے ترجمان ہیں۔

یمبر زل،، ترنم ریاض کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یمبر زل ایک علامت ہے ایک استعارہ ہے۔ کشمیری زبان کا لفظ ہے جسے اردو میں نرگس کے مترادف مانا جاتا ہے۔ نرگس خوشی اور غم کی علامت ہے۔ اس افسانوی مجموعہ کا آٹھواں افسانہ ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم'' آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بلاشبہ ترنم ریاض کے زرخیز تخیل وسعت مطالعہ حساس نظر کا آئینہ ہے۔

''ہوسکتا ہے یہ میری آخری خواہش ہو تم سے۔۔ کچھ میں آخری بار مانگ رہا ہوں شاید۔۔''

شاہد نے نادیہ کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔۔ ایسا مت کہو''

نادیہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

درج بالا مکالمے ہم تو ڈوبے ہیں صنم کی ابتدائی سطور ہیں۔ بظاہر ان میں دو محبت کرنے والوں کی محبت وانسیت کا اظہار نظر آتا ہے۔ شاہد کی آخری خواہش اور نادیہ کا گھبرا جانا قاری کو کسی محبت بھری داستان کا احساس دلاتے ہیں۔ دلچسپی اور تجسّس کو ابھارتے ہیں۔

اگلی چند سطور میں شوہر کا ایک ٹک بیوی کو طلب اور التجا کی نظر سے دیکھنا اور نرس کی آمد کئی سوال کھڑا کرتی ہیں۔ آیندہ سطور میں کئی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں کہ شاہد ایڈز جیسے موذی مرض کا شکار ہے اور بغرض علاج ہسپتال میں داخل ہے۔ نادیہ کی خاموشی اور اس کی گیارہ سالہ بچی کے معصوم سوال شاہد نادیہ کی زندگی کے کئی راز افشاء کرتے ہیں۔

''بابا اچھے ہوجائیں گے تو۔۔۔ تو پھر پہلے کی طرح آپ سے لڑیں گے آپ کو ماریں گے۔۔۔''

شاہد کی شخصیت کا گھناؤنا روپ بچی کے اس سوال میں پوشیدہ ہے۔ دراصل اس سوال کا تعلق اس حادثے سے ہے جب چار برس قبل نادیہ دوسری دفعہ امید سے تھی اور ثمرین کے اندیشوں کے تسلی بخش جواب دے رہی تھی کے آنے والا بھیابابا کی طرح غصہ ور نہ ہوگا اس معمولی بات کو مسئلہ بنا کر شاہد نادیہ کو اس زور کا تھپڑ رسید کرتا ہے کہ وہ اپنے ہونے والے بچے سے محروم ہوجاتی ہے۔ نا صرف چھ ماہ کا حمل ضائع ہوجاتا ہے بلکہ اس حادثہ کی وجہ سے پیٹ میں اندرونی انفکشن ہوجاتا ہے جس کی وجہ سیوہ مستقبل میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ یہ حادثہ انکے رشتے میں دوریاں بڑھانے کا باعث بن گیا ہے۔ وقت گزرتا رہا بیتے برسوں میں شاہد کی غیر ذمہ دارانہ شخصیت نے نادیہ کو یہ احساس دلا دیا کہ وہ ایک بے پرواہ گھر گرہستی سے انجان شخص ہے۔ وہ وقتی لگاؤ تھا جس نے نادیہ سے شادی پر مجبور کردیا تھا اس کی باہری یاریاں بے راہ روی اور عیش کوشی سے نالاں ہوتے ہوئے بھی وہ شاہد کا ہر طرح سے خیال رکھتی ان تمام زیادتیوں کے باوجود شاہد کے تئیں اس کا پیار کم نہ ہوسکا۔

شاہد کی بے حسی اور نادیہ کی وفا شعاری اس افسانے کا مرکز ہے۔ جو کہانی کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ کہانی میں حقیقی موڑ اس وقت آتا ہے جب اپنی صحت پر نازاں شاہد کو بخار رہنے لگتا ہے۔ پیٹ میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہے۔ دوائیاں اور علاج ناکام ثابت ہوتے ہیں اور اس کی صحت دن بہ دن کمزور ہوتی جاتی ہے۔ آخر ڈاکٹر کے مشورے سے خون کے ٹیسٹ کیے جاتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایڈز جیسے موذی مرض کا شکار ہے۔ اس مرض کے باعث یار دوست اور رشتے دار شاہد سے دور ہوجاتے ہیں۔ سوائے نادیہ کے جو بڑی دلجمعی سے اس کی تیمارداری میں لگی رہتی ہے۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ نادیہ کی خون کی رپورٹ نیگیٹیو آنے کے بعد تو شاہد کا رویہ نادیہ کے لئے تیکھا طنزیہ اور اذیت ناک ہوجاتا ہے۔ اپنے گناہوں، غلطیوں کا مداوا کرنے کی بجائے وہ اپنی مخلص بیوی کے خلوص کو ڈھکوسلا اسکی ایثار و قربانی کو چالاکی سے معمور کرتا ہے۔

ترنم ریاض نے اس جذبوں سے گندھی کہانی میں عورت کے ایثار و قربانی کے

رنگوں کو پیش کیا ہے کہ عورت کی محبت کی انتہا نہیں ہوتی اپنے محبوب کی خاطر ہر دکھ برداشت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس محبوب کا دیا زخم بھی سہ جاتی ہے۔

مرد اس اس معاشرے میں شاہد جیسے کردار موجود ہیں جو لایق نفرت ہے۔ مصنفہ نے دو متضاد کرداروں کو بہترین انداز میں صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔

''تم کیا تیمارداری کا ڈھونگ رچاتی ہو انتظار میں ہوگی کہ میں مروں اور تم جلد سے جلد دوسری شادی کرلو،،

یہ الفاظ نہیں شاہد کی کم ظرفی کی مثال ہے۔ نادیہ کی کمزوری دوبارہ ماں نا بن پانے کے درد کو وہ مذاق بناتا ہے کہ تم جیسی بانجھ عورت سے کوئی بوڑھا یا اپاہج شخص ہی شادی کرے گا اس ذلت آمیز رویہ، کج روی کو وہ شاہد کی بیماری کا سبب جان کر برداشت کر جاتی ہے۔

نادیہ کی بے انتہا برداشت قاری کو ناگوار گزرتی ہے کیوں وہ کوئی اقدام نہیں اٹھاتی؟ کیوں ایک موذی اور عفریت کی طرح زندگی پر چھائے اس شخص سے چھٹکارا حاصل نہیں کرتی!؟

دراصل ترنم ریاض نے عورت کی ممتا کے اس روپ کو نادیہ کی صورت میں پیش کیا ہے جو اپنی پسند اپنے محبوب سے کسی طرح کی امید نہیں رکھتی وہ صرف محبت کرنا جانتی ہے۔ اپنے محبوب کی بے التفاتی کو بھی اسکا ایک انداز سمجھتی ہے۔ ایک مثالی عورت جسے دنیا کی پرواہ نہیں جسے خود کی بھی پرواہ نہیں وہ صرف دینا جانتی ہے لینا نہیں۔

شاہد پاریا کا بھی مریض ہے۔ اس کے مسوڑھوں سے خون رستا رہتا ہے۔ اس کی سانسیں بدبودار ہو جاتی ہیں۔ ایک تعفن زدہ شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنا نادیہ کے ضبط و تحمل کی انتہا ہے۔

شاہد زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ ہسپتال میں جب وہ نادیہ سے اپنے قریب آنے کی گذارش کرتا ہے تو ایک پل کے لئے مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے کیے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتا ہے۔ اپنی کرتوت پر شرمسار ہوگا لیکن کہانی میں موڑ اس

وقت آتا ہے جب وہ نادیہ کے ہونٹ کو اپنے دانتوں سے کاٹنا چاہتا ہے تاکہ اس کے مسوڑھوں سے رستا ایڈز زدہ خون نادیہ کے خون میں شامل ہو جائے اور وہ بھی اس موذی مرض کا شکار ہو جائے۔ اسکی یہ حرکت اسے ذہنی مریض بھی ثابت کرتی ہے اسکے بزدلانہ اقدام کا اظہار ہے۔

مصنفہ نے شاہد کے کردار کہ ذریعہ ایک بے پرواہ بے قدر انسان کی تصویر پیش کی ہے۔ جو آخری دم تک بھی اپنی محبوبہ، بیوی اور اسکی بیٹی کی ماں کو ایذا پہنچانا چاہتا ہے۔ یہی وہ موڑ ہے جب ایک کی نفرت دوسرے کو بھی نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مصنفہ کی درون بینی، سادگی بیان و سہل پسندی نے دو متضاد جذبوں (ہمدردی و نفرت) کو ساتھ ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی چیز قاری کے ذہن و دل پر نقش مرتب کرتی ہے۔

''اسنے زندگی میں پہلی بار شاہد کی طرف حقارت سے دیکھ کر زمین پر تھوک دیا اور بھاگ کھڑی ہوئی''

افسانے کی یہ آخری سطر نادیہ کی اذیت بھری زندگی سے چھٹکارے کی ضامن بن گئی ہے۔ جس سے صرف محبت کرتی رہی اس کے لیے حقارت سے تھوک دینا صبر وضبط کی انتہا کی دلیل ہے بس اب اور نہیں کی تصویر ہے۔

ابتدائی سطور میں محبت سے شاہد کا بلانا اور آخری سطر میں نادیہ کا حقارت سے تھوک دینا ترنم ریاض کی تہ داری نفسیاتی بصیرت، باشعور اور حساس طبیعت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انسانی رشتوں کی گوناگوں کیفیات کی فنکارانہ تجسیم انکے افسانوں کو نئی وسعت بخشتی ہے۔
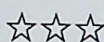
بی بی

بی بی ڈائننگ ٹیبل کے کونے سے پیٹھ ٹکائے اور ایک ہتھیلی کرسی کی پشت کے اونچے حصے پر دھر کر اپنے بدن کو سہارا دیے کھڑی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر وقفے وقفے سے ہلکے سے جھٹکے کھا کر ہل جاتا۔ ناک سکیڑنے کی آواز بھی رہ رہ کر سماعت سے ٹکراتی اور وہ اپنا خمیدہ سا تھرتھراتا ہوا ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر بار بار اپنے خشک بالوں کو سمیٹ کر سر پر دھرے ململ کے دوپٹے کے نیچے اڑستی جو لمحہ بھر بعد ہی پھسل کر واپس ماتھے پر بکھر جاتے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور بدن لرز رہا تھا مگر وہ اپنے مسوڑھوں کو سختی سے بھینچ کر اپنی اس کیفیت کو قابو میں رکھنے کی مسلسل کوشش کیے جا رہی تھی۔ کمرے میں موجود سبھی لوگوں کی نگاہیں اُس پر جمی تھیں۔

آخر اس عمر میں آپ کو یہ باتیں زیب دیتی ہیں؟ باسط نے بیزاری سے منھ پھیر کر کہا اور ہاتھ سے بال سنوارنے لگا۔

جو بھی ہوتا ہے، آپ کو پتہ تو چلتا ہی ہے۔۔۔ پھر اس طرح اندر گھس کر۔۔۔ شیبا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

جھانک کر دیکھنے کی کیا۔ ضرورت کیا ہوتی ہے آپ کو؟ بہو جملہ مکمل کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف پلٹی تو جھرّیوں میں جنبش سی ہوئی اور پوپلے منھ پر کھسیانی سی مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے سر کچھ اور جھکا لیا اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بالوں کو آنچل میں سمیٹنے لگی۔

بتایئے نا بی بی۔اس بار پوتے کی آواز ذرا اونچی تھی۔

سارا موڈ خراب کر دیا آپ نے۔۔۔آج سوچا تھا کہ Exam ختم ہوئے ہیں دوستوں کے ساتھ کہیں گھوم آؤں۔ خوامخواہ مماں نے روک لیا کہ Lunch کر کے جاؤں۔۔۔اور۔۔۔اب لنچ ہے۔۔۔کہ۔۔۔ باسط کی آواز کی جھنجھلاہٹ میں گِلے کی آمیزش صاف عیاں تھی۔

مجھے تو ٹیوشن جانا ہے بھیّا۔سکول میں سوچا تھا کہ فوراً کھانا کھا کر سو جاؤں گی تو شام تک Fresh ہو جاؤں گی۔۔۔مگر۔ پوتی نے ناک کو انگلی سے سہلاتے ہوئے دادی کی طرف دیکھا تو دادی نے سر ذرا سا اٹھا کر دھندلی نظروں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ پھر دروازے کی طرف نظر اٹھائی جہاں سے اس کی بہو کے سینڈل کی ایڑیاں فرش سے ٹکرا کر اونچی آواز پیدا کر رہی تھیں۔

اب آپ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں۔۔۔جایئے اپنے کمرے میں۔۔۔آرام کیجئے۔۔۔آپ نے تو کھا پی لیا ہے۔۔۔میری آج شام کی ڈیوٹی ہے۔۔۔اور اس Maid کو آج ہی جلدی جانا تھا۔۔۔مگر آپ سے یہ سب کہنے سے کیا حاصل۔ بہو اندر داخل ہوتے ہوئے بولی اور باہر نکل گئی۔

بیٹا تمہارے پاپا آتے ہوں گے۔۔۔وہ پھر اندر آئی اور بچّوں کی طرف دیکھنے لگی۔

تھرماس میں چائے رکھی ہے۔۔۔ پتہ نہیں آج دیر کیوں ہو گئی ان کو۔۔۔ورنہ اب تک تو۔۔۔ بہو نے بات ادھوری چھوڑ کر پھر بی بی کی طرف دیکھا۔ بی بی نے دو ایک بار پلکیں جھپکیں اور بہو کی طرف دیکھتی رہی۔اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے ان میں دودھیا رنگ کا کوئی گھول ڈالا گیا ہو اور چشمے میں لگے دو شیشوں میں سے ایک کا لینس زیادہ محدّب ہونے کی وجہ سے ایک آنکھ دوسری کی نسبت کوئی چار گنا بڑی نظر آ رہی تھی۔اُس ایک آنکھ میں ڈر اور التجا بھرا کوئی ملا جلا جذبہ تڑپتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔پُتلی بیقرار سی ادھر ادھر تھرک رہی تھی۔ شاید دوسری آنکھ کی پُتلی بھی اس کا ساتھ دے رہی ہو مگر اس کا کانچ دو

حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ نچلا حصہ آدھے چاند کی شکل میں تراشا گیا تھا۔ اور دونوں کو ملانے والا جوڑ پُتلی کی سیدھ میں ہونے کی وجہ سے آنکھ کچھ واضح نہیں تھی۔ اس نے منحنی سا ہاتھ اٹھا کر جلدی جلدی بال سمیٹ کر پلّو کے نیچے کرنے کی کوشش کی۔

اس سے۔۔۔ نہ۔۔۔ نہ کہنا بیٹا۔۔۔ بی بی نے دوسرے ہاتھ سے جو گٹھیا کے عارضے کی وجہ سے پرندے کے پنجے کی طرح سکڑا اور مُڑا ہوا تھا، ٹھہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اب۔۔۔ اب میں۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ بی بی نے سر جھکا لیا۔

مجھ سے۔۔۔ کچھ۔۔۔ کچھ ہوتا تو۔۔۔ ہے نہیں۔۔۔ میں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کرسی کی پشت کو دھکا دیا۔ کرسی میز کے اندر سے ذرا سا باہر کو سرکی تو وہ اس پر ٹک گئی۔ زیادہ دیر کھڑا رہنے سے اُس کی سوکھی لکڑی سی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کی نظریں بہو کی ہی طرف تھیں۔ ابھی۔۔۔ جاتی ہوں۔۔۔ اندر۔۔۔ میں۔۔۔ تم۔۔۔ تم کچھ نہ کہنا اس سے۔۔۔ وہ آئیگا تو۔۔۔ ورنہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔ بچپن میں بھی اگر۔۔۔ کبھی ایسا ہو جاتا۔۔۔ تو پورا دن۔۔۔ کھانا چھوڑ دیتا تھا وہ۔۔۔ اب۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ تو ہوتا نہیں۔۔۔ کچھ۔۔۔ بالوں میں۔۔۔ تیل ڈالے۔۔۔ کنگھا کیے۔۔۔ زمانہ ہو گیا۔ بی بی کی آنکھ کے دودھیا گھول میں کوئی سیماب سی شے تیرنے لگی تو اُس نے بار بار پلکیں جھپکیں اور دھیرے سے ناک پونچھی۔

تو یہاں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ آپ کے بال سنوارے بار بار۔ سب اتنے مصروف ہیں کہ۔۔۔ خیر وہ تو دوسری بات ہے۔ آپ پہلے ایسا کرتی ہی کیوں ہیں۔۔۔؟

بہو نے بی بی کو ایسے دیکھا کہ آنکھوں میں لائے گئے حقارت کے تاثرات بی بی کو صاف نظر آئیں۔

دانت بھی۔۔۔ تو۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہیں میرے۔۔۔ اب۔۔۔ میں تو۔۔۔

اب اس عمر میں دانت لگوا کر آپ کو کرنا بھی کیا ہے؟ دودھ، ڈبل روٹی، کیلا۔۔۔

اس میں ہے تو ساری غذائیت۔۔۔آپ کو اور کسی چیز سے کیا مطلب۔۔۔؟ بہو بحث کرنے کے انداز میں بولی اور ساری کے فالز درست کرنے لگی۔

اب۔۔۔ایسا کبھی نہ ہوگا بیٹا۔۔۔میں ادھر کا رخ بھی نہ کروں گی۔۔۔میں تو صرف۔۔۔خوشبو کے لیے۔

خوشبو کے لیے۔۔۔خوشبو پھیل تو جاتی ہے سارے گھر میں۔۔۔آپ کے کمرے میں بھی۔۔۔پھر۔۔۔! بہو نے تحکمانہ انداز میں سر جھٹکے سے نیچے سے اوپر کر کے کہا اور کانوں میں پڑتی ہوئی کال بیل کی آواز پر دروازہ کھولنے باہر آئی۔

بند مت کرنا دروازہ۔۔۔چابی دینے آرہا ہے ڈرائیور۔

سیف خوشدلی سے بیوی سے مخاطب ہوا۔

نہیں مجھے بھی گاڑی میں ہی جانا ہوگا۔۔۔آفس کی گاڑی ہارن کر کے چلی گئی۔۔۔میں تو عجیب مصیبت میں گھری ہوں۔۔۔کیسے جاتی۔۔۔چائے تھرمس میں ہے۔۔۔

وہ چہرے پر بیچارگی سی طاری کرتے ہوئے بولی۔

کیوں کیا ہوا۔۔۔؟ سیف نے دروازے پر آئے ڈرائیور سے بیگ لے لیا اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں تھمی چابی کی طرف دیکھا۔

تم گاڑی میں بیٹھو۔۔۔میم صاحب کو جانا ہے۔ڈرائیور کے چہرے پر مایوسی کی ہلکی سی تہہ چھانے لگی تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

ٹھیک ہے صاحب۔۔۔وہ باہر کی طرف لپکا۔

بہو نشست گاہ میں داخل ہوئی تو سیف بھی اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔

کیا ہوا۔۔۔ اس نے بیوی کی طرف رخ کر کے ماں کی طرف دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

میری تو قسمت میں ہی پریشانیاں ہیں۔۔۔آج۔۔۔معلوم ہے سالن میں سے

بال نکل آیا۔۔۔بچوں نے دیکھا۔۔۔

اف۔۔۔سیف نے نہایت ناگواری سے آنکھیں بھینچ کر منھ دوسری طرف موڑا۔

میں Maid پر بگڑی کہ سکارف باندھ کر کام نہیں کرتی۔ وہ بھی چپ سی ہو گئی۔۔۔ڈر ہے کام نہ چھوڑ دے۔۔۔اب دوسری ڈھونڈنا۔۔۔او گاڈ۔۔۔

مگر بال آیا کیسے۔۔۔سالن میں۔۔۔؟ سیف نے برا سا منھ بنا کر تھوک نگلا۔

بی بی نے چشمے کے پیچھے سے سہمی ہوئی نظروں سے بیٹے اور بہو کو باری باری دیکھا۔۔۔اور انہیں ایک دوسرے سے مخاطب دیکھ آہستہ سے کرسی سے اٹھی۔

ارے آنا کہاں سے تھا۔۔۔تھوڑی دیر بعد Maid مجھے بالکنی میں لے گئی۔ سورج کی روشنی میں دیکھا تو سفید رنگ کا تھا بال۔۔۔

سفید بال۔۔۔؟۔۔۔سفید بال تو۔۔۔

بی بی دیوار کے سہارے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

اور کیا۔۔۔اب آپ کی ماں آ آ کر ہر وقت ہانڈیوں میں جھانکے گی تو۔۔۔

بی بی نے اس کے بعد کچھ نہ سنا۔۔۔وہ اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ عجلت سے مسہری پر لیٹ کر اس نے جلدی سے دروازے کی طرف ایک نظر دیکھا اور آنکھیں میچ لیں۔ چشمہ اتارنا اسے یاد ہی نہ رہا تھا۔

بی بی

رفیع حیدر انجم

ترنم ریاض ایک ایسی تخلیقی فنکارہ ہیں جنہوں نے اپنے اظہار خیال کے لئے افسانہ نگاری کو منتخب کیا۔ چوں کہ ان کا تعلق وادی کشمیر سے تھا تو انہوں نے بیشتر کشمیر کی جیتی جاگتی سانسیں لیتی ہوئی زندگی کے مختلف جہات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ترنم ریاض نے افسانوں کے روایتی طرز اظہار سے قدرے ہٹ کر جدید اسلوب میں اپنے زرخیز تخیئل، ندرت فکر، گہرے مشاہدے اور وسعت مطالعہ کی بدولت اردو افسانے کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں وہ ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتی ہیں۔ فن کے بنیادی اصولوں کی پاسداری ان کے افسانوں کا طرہء امتیاز ہے۔

ترنم ریاض اپنے افسانوں کے مجموعہ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' میں لکھتی ہیں کہ ''اپنے گرد و پیش کی تبدیلیوں کو محسوس کر کے میں بھی کبھی خوش ہوتی ہوں، کبھی رنجیدہ میں انسانوں کے بدلتے ہوئے خیالات، کردار، اطوار اور طرز زندگی کا بغور مشاہدہ کرتی ہوں۔ انسانی احساسات کو اپنے تخلیقی نہاں خانوں میں محفوظ کر کے کہانیوں اور افسانوں کا روپ دیتی ہوں۔ تخلیق کا یہ سفر میرے لئے اذیت ناک بھی ہے اور تسکین آمیز بھی''۔

کبھی خوشی اور کبھی رنجیدگی، کبھی اذیت ناکی اور کبھی تسکین آمیزی کا یہ احساس

ان کے زیر تجزیہ افسانہ ''بی بی'' کے مطالعے سے بخوبی ہوتا ہے۔ یہ افسانہ جہاں ایک طرف ایک مخصوص معاشرے کے مسائل سے روبرو کراتا ہے وہیں یہ افسانہ اس بات کا شاہد بھی ہے کہ ترنم ریاض کی نگاہ زندگی کے رنج ومحن کی صداقت سے کس قدر آشنا تھی۔

''بی بی'' کی کہانی ہماری زندگی کی دیکھی بھالی کہانی ہے۔ہم سب ہی ایسی تمام بیبیوں سے واقف ہیں جنہیں اس افسانے میں ایک کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ہمیں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی گھر میں نظر آجاتی ہیں۔ترنم ریاض نے کمال فن کاری سے ایک ایسی ہی بی بی کے ظاہر و باطن کو سامنے لانے کی سعی کی ہے جو عصر حاضر میں ہمارے سماج میں ایک اضافی شے کا استعارہ بن چکی ہے۔افسانے کے آغاز سے ہی ایک ایسی عمر دراز مظلوم بی بی کا کردار نگاہوں کے سامنے روشن ہو جاتا ہے جسے کسی سخت ناپسندیدہ فعل کے لئے افراد خانہ نے موردالزام کر رکھا ہے۔ان میں ان کی بہو اور بچے بھی شامل ہیں۔افسانے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

''بی بی ڈائننگ ٹیبل کے کونے سے پیٹھ ٹکائے اور ایک ہتھیلی کرسی کی پشت کے اونچے حصے پر دھر کر اپنے بدن کو سہارا دیئے کھڑی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔اس کا سر وقفے وقفے سے ہلکے جھٹکے کھا کر ہل جاتا۔ناک سکیڑنے کی آواز بھی رہ رہ کر سماعت سے ٹکراتی اور وہ اپنا خمیدہ سا تھرتھراتا ہوا ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر بار بار اپنے خشک بالوں کو سمیٹ کر سر پر دھرے ململ کے دوپٹے کے نیچے اڑستی جو لمحہ بھر بعد ہی پھسل کر واپس ماتھے پر بکھر جاتے۔اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور بدن لرز رہا تھا مگر وہ اپنے مسوڑوں کو سختی سے بھینچ کر اپنی اس کیفیت کو قابو میں رکھنے کی مسلسل کوشش کئے جا رہی تھی کمرے میں موجود سبھی لوگوں کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔''

افسانے کے اس شروعاتی اقتباس سے ہی ہمارے ذہن میں گھر کی ایک بزرگ خاتون کا مکمل سراپا/ خاکہ مرتسم ہو جاتا ہے جو اپنے کسی ناپسندیدہ فعل کے لئے نادم ہے اور تاسف کے دبیز چادر میں ملبوس اپنے حرکات وسکنات سے قاری کی پوری توجہ حاصل کر لیتی ہے۔

افسانہ کے آگے کی قرات میں ہمیں بی بی کے اس کار عبث کے لئے افراد خانہ کے ان تمام رد عمل کا پتہ چلتا ہے جس کے لئے یہ افسانہ تحریر کیا گیا ہے اور اس رد عمل کو عصری علوم و ماحول کی زائیدہ کے طور پر لیا جانا چاہئے اور جہاں سے ہمارے اپنے شاندار تہذیبی وثقافتی ورثہ کا زوال شروع ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بزرگوں کی ناقدری اور ان کی تذلیل کا عام رویہ اپنی جڑیں مضبوطی سے جماتا جارہا ہے۔اس ضمن میں درج ذیل اقتباس قابل غور ہے۔

''جھانک کر دیکھنے کی کیا ضرورت .... ضرورت کیا ہوتی ہے آپ کو؟
بہو جملہ مکمل کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف پلٹی تو جھریوں میں جنبش سی ہوئی اور پوپلے منہ پر کھسیانی سی مسکراہٹ چھا گئی۔اس نے سر کچھ اور جھکا لیا اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بالوں کو آنچل میں سمیٹنے لگی''۔

اس سرزنش میں بہو اکیلی نہیں ہے بلکہ گھر میں موجود پوتا اور پوتی بھی اپنی دادی کی خبر گیری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔اس چوطرفہ حملے میں بی بی کا کمزور وناتواں وجود لہولہان ہو رہا ہے۔اسے ایک نفسیاتی اذیت سے گزارا جارہا ہے۔اس پر طنز کے تیر برسائے جارہے ہیں۔معاملے کی تہہ میں جائیں تو بات اتنی سی ہے کہ بی بی نے باورچی خانے میں جا کر ہانڈی کا ڈھکن اٹھا کے دیکھ لیا تھا کہ آج کیا پکا ہے اور ایسا کرتے ہوئے نادانستگی میں اس کے سر کا سفید بال سالن میں گر گیا تھا۔ یہ اسی بی بی کے سر کا سفید بال ہے جس نے اپنے بیٹے کو جنم دیا اسے پالا پوسا ,پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ اس کا بیٹا آج سماج میں فخر سے سر اٹھا کر چل رہا ہے۔لیکن آج اسی بی بی کی حیثیت اپنے ہی گھر میں ایک اضافی شے کی طرح ہو کر رہ گئی ہے جس کے جذبات واحساسات کوئی معنی نہیں رکھتے۔

ترقی پسند معاشرے کا تقاضا، اسٹیٹس سمبل کو برقرار رکھنے کی تگ ودو اور جدید طرز زندگی نے معاشی خوشحالی کے لئے زن وشو دونوں کو پیسہ کمانے کی مشین بنا دیا ہے۔بچوں کو اعلی تعلیمی اداروں میں داخلہ کروا کر والدین بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔عیش وعشرت کے سامان فراہم کرنے کی ہوڑسی مچی ہے۔اس نظام حیات نے انسان کو اتنا مادہ پرست بنا دیا

ہے کہ رشتوں کا تقدس موہوم ہو چکا ہے۔تمام اخلاقی تقاضے materialistic approach کے حوالے سے کام کرنے لگے ہیں۔بی بی، جسے عمر کے تقاضوں نے کمزور و ناتواں بنا دیا ہے، اس کی بہو بی بی سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ Maid کی جگہ لے لے کہ اب Maid کے نخرے اٹھانا آسان نہیں رہے۔بچوں کو اپنے Exam اور تفریحی مشاغل کی پڑی ہے۔بیٹے کو دفتری معاملات نے الجھا رکھا ہے۔بہو کو آفس جانے کی عجلت ہے۔ایسے ماحول میں بی بی کی ایک نادانستہ غلطی نے سارا ماحول مکدر کر رکھا ہے۔بی بی جو خود سے بالوں میں تیل ڈالنے اور کنگھا کرنے کی اہل بھی نہیں رہی۔

مگر اس کی ضرورتوں کی فکر کوئی نہیں کرتا۔بی بی کی التجا کے باوجود بیٹا جب گھر آتا ہے تو بہو اسے اس کی ماں کی کارستانی سے آگاہ کرتی ہے۔گھر کے تمام افراد اسے بی بی کے چھچھورے پن سے موسوم کرتے ہیں۔بیٹا اپنی ماں کی حرکت پر ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بھینچ کر منہ دوسری طرف موڑ لیتا ہے۔

ترنم ریاض نے بی بی کی کردار نگاری میں اپنے تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی رعنائی اور جزیات کی کارفرمائی کو اتنی شدت اور صداقت سے افسانے میں برتا ہے کہ قاری واقعے کی نوعیت کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو جاتا ہے۔افسانے کے درج ذیل اقتباس کی جزیات پر غور فرمائیں۔

''بی بی نے دو ایک بار پلکیں جھپکیں اور بہو کی طرف دیکھتی رہی۔اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے ان میں دودھیا رنگ کا کوئی گھول ڈالا گیا ہو اور چشمے میں لگے دو شیشوں میں سے ایک کا لینس زیادہ محدب ہونے کی وجہ سے ایک آنکھ دوسری کی نسبت کوئی چار گنا بڑی نظر آ رہی تھی۔اس ایک آنکھ میں ڈر اور التجا بھرا کوئی ملا جلا جذبہ تڑپتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔پتلی بیقراری سی ادھر ادھر تھرک رہی تھی۔شاید دوسری آنکھ کی پتلی بھی اس کا ساتھ دے رہی ہو مگر اس کا کانچ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔نچلا حصہ آدھے چاند کی شکل میں تراشا گیا تھا اور دونوں کو ملانے والا جوڑ پتلی کی سیدھ میں ہونے کی وجہ سے آنکھ کچھ واضح نہیں تھی۔اس

نے منخنی سا ہاتھ اٹھا کر جلدی جلدی بال سمیٹ کر پلو کے نیچے چھپانے کی کوشش کی‘‘۔

بی بی نے بہو سے التجا کی تھی کہ وہ اس ناپسندیدہ اور غیر متوقع واقعے کا ذکر بیٹے سے نہ کرے۔ بی بی نے یہ واسطہ بھی دیا کہ بچپن میں بھی اگر سالن میں بال آجاتا تھا تو اس کا بیٹا پورا دن کھانا چھوڑ دیتا تھا۔ مگر بہو پر اس التجا کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ اپنے شوہر کو من و عن سارا واقعہ سنانا شروع کر دیتی ہے۔

’’بی بی نے اس کے بعد کچھ نہ سنا .... وہ اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ عجلت سے مسہری پر لیٹ کر اس نے جلدی سے دروازے کی طرف ایک نظر دیکھا اور آنکھیں میچ لیں۔ چشمہ اتارنا اسے یاد ہی نہ رہا تھا‘‘۔

افسانہ ختم ہو جاتا ہے مگر قاری ایک بہت گہرے Pathos اور تاسف انگیز کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ اخلاقیات اور Code of conduct کی اس حد تک کی تنزلی پر حیران و پریشان رہ جاتا ہے۔ یہ افسانہ ایک دردمند دل اور انتہائی حساس فنکارہ کا عدیم المثال تخلیقی منظر نامہ ہے۔ اس افسانے کا المیہ ہی اس کا جمالیاتی ڈسکورس ہے۔ ایک بی بی کی یہ کہانی آج کے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا ہے۔ ہم اس افسانوی جز میں کل کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ذہنی قلاشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس شخصیت کو سماج میں اعلی وارفع مقام پر ہونا چاہئے، اسے بیچسی کی گہری کھائی میں دھکیل دیا گیا اور خود کو بلندی پر فائز سمجھنے کی نادانی پر فخر کرتے ہیں۔ افسانے کے بیانیہ کا یہ بالواسطہ منظر نامہ اتنا موثر ہے کہ ترنم ریاض کی افسانوی عظمت عیاں ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ مشیت ایزدی نے ترنم ریاض جیسی حساس فنکارہ کو ناوقت ہم سے چھین لیا۔ لیکن انہوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ بھی لکھا ہے، ان کی خدمات اردو کے افسانوی ادب میں ایک بڑے اور قیمتی سرمائے کی حیثیت سے انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔۔

تجربہ گاہ

خاکی نے ہسپتال کی تجربہ گاہ میں لگے بڑے سے آئینے میں خود کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ اپنے اسی قیمتی لباس میں تھا جو اُسے بہت پسند ہوا کرتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ رنگ کِھلتا ہوا گندمی، بال گھنے اور بھورے تھے۔ آنکھوں کی پتلیاں سیاہ تھیں۔

بہت پہلے وہ دنیا بھر کے چند مشہور دولت مند لوگوں میں سے ایک ہوا کرتا تھا۔ یہ دولت اُسے وراثت میں ملی تھی۔ جسے وہ دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا تھا۔ دن رات شراب سے مدہوش رہنے کی وجہ سے وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو گیا۔

اس کی بہت سی معشوقاؤں میں سے کسی نے اسے اس بلانوشی سے باز رہنے کو نہیں کہا۔ بیوی کی وہ کوئی بھی بات نہیں مانتا تھا۔ اور چالیس برس کی عمر تک آتے آتے اس کا جگر تقریباً ناکارہ ہو گیا۔ اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ دنیا کے چند ماہر ڈاکٹروں کی نگہداشت میں اس کا علاج ہونے لگا۔

ایک تندرست ملازم کا انتخاب ہوا جس کے پھیپھڑوں کا سرطان آخری درجے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے گھر والوں کو ایک ضخیم رقم دے کر خاکی کے جگر کو ٹرانسپلانٹ کیا گیا۔

آپریشن کامیاب رہا۔۔۔ کچھ دن آرام سے گزرے مگر اس کی لاپرواہیوں کی وجہ سے پیوند کیے ہوئے جگر نے زیادہ دن اس کا ساتھ نہ دیا اور اس میں Infection ہو گیا جینے کی آس جاتی رہی۔ ڈاکٹروں نے اس معاملے میں مشہور اداروں کے جنیٹک انجینئروں

سے مشورہ کیا۔

وہ گھیرا باندھے اس کی مسہری کے گرد کھڑے تھے۔

اس رنگ و شباب کی دنیا کو کیا اس کی دولت خرید نہیں سکتی۔ کس کام کی یہ تحقیق۔۔۔ یہ سائنس۔۔۔ یہ تجربات۔۔۔

مجھے زندہ رہنا ہے۔۔۔

اس نے احتجاج کیا۔۔۔

زہر نسوں کے اندر تک سرائیت کر چکا ہے۔۔۔ ڈاکٹر نا امید ہو گئے۔۔۔

سارا خون بدل ڈالو۔۔۔ یہ۔۔۔ دولت۔۔۔

اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔۔۔ مگر۔۔۔!

مگر۔۔۔؟

مگر ہمیں اپنی تحقیق پر دنیا کے قیام سا اعتماد ہے۔ ہم موت پر قابو پانے والے ہیں ہمیں Gene کا Code حاصل ہو گیا ہے۔۔۔ وہ پیچیدہ ضرور ہے۔ مگر جس دن ہم اسے Decode کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، سمجھ لیجئے کہ۔۔۔

مشہور عالم سائنسدانوں کی ٹیم 'اپنے آقا ہم' کے سربراہ نے کہا تھا۔

اپنی ساری دولت میں تمہارے نام کرتا ہوں۔

مگر اتنی جلدی تو ایسا کوئی امکان نہیں۔۔۔

او۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ مری سانس۔۔۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ تندرست ہے تم اسے محفوظ کر لو اور باقی کا جسم Hydrogen Peroxide میں Dissolve کر لو۔۔۔ اور جب۔۔۔ اور جب۔۔۔

ہاں اور جب زندگی ہمارے قابو میں آ جائے گی تو صرف تمہارے DNA کو Develop کر کے ہم بالکل تمہاری طرح کا انسان کلون کر لیں۔۔۔

سربراہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔

سائنسدان اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگے۔

مگر اس سب کی ضرورت پیش نہیں آئیگی۔ ایک خلیہ محفوظ رکھ لینا ہی کافی ہوگا۔۔۔سارا جسم اسی سے بنتا جائیگا۔

نہیں۔۔۔خاکی پوری طاقت استعمال کر کے چیخا۔

مجھے۔۔۔مجھے بچپن سے جوان ہونے تک کا مرحلہ۔۔۔طے نہیں کرنا۔۔۔مجھے جوانی چاہیے۔۔۔سیدھا جوان پیدا ہونا ہے مجھے۔۔۔یہی قد۔۔۔یہی صورت درکار ہے مجھے۔۔۔مجھے۔۔۔یہی صورت ڈاکٹر۔۔۔اُف۔۔۔میری سانس۔۔۔پلیز ڈاکٹر۔۔۔ یہی زندگی۔۔۔یہی دولت۔۔۔ہاں دولت۔

مگر تمھیں دولت دینا ہمارے بس میں۔۔۔کیسے؟

میں اسے۔۔۔میں۔۔۔وصیت کروں گا کہ۔۔۔میری دولت۔۔۔میرے کسی وارث کو اس وقت تک۔۔۔نہ دی جائے۔۔۔جب تک میں خود۔۔۔لوٹ کر۔۔۔ میں خود۔۔۔زندہ ہو کر۔۔۔اپنی مرضی سے۔۔۔اپنی۔۔۔مرضی سے۔۔۔ہاں۔۔۔اس چیک سے۔۔۔اس چیک سے تم اپنے اخراجات۔۔۔پورے کرتے رہنا۔۔۔اور۔۔۔ اور۔۔۔

ایک زوردار قہقہہ۔

پھر ہچکیاں۔۔۔ایک زور کی ہچکی۔

دستخط شدہ چیک اس کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان دبا ہے۔

DNA, RNA اور TRNA کے علاوہ اس کا ڈھانچہ بھی محفوظ ہے۔

تجربہ گاہ کو مزید وسعت دی گئی۔

تجربے ہوتے چلے گئے۔۔۔برسہا بیت گئے۔

سربراہ کا انتقال ہو گیا۔ دیگر ارکان بھی فوت ہو رہے ہیں، نئے نئے سائنسداں آرہے ہیں۔

تجربہ گاہ کے بہت بڑے وسطی ہال کے عین درمیان دنیا کے ایک امیر ترین آدمی کا ڈھانچہ شیشوں میں محفوظ اپنے سرہانے اپنی شناخت لیے لیٹا ہے۔

نام : خاکی

پیدائش : ۱۹۶۰ء

موت : ۲۰۰۰ء

بہت پہلے لوگ دلچسپی سے اس ہال سے گزرا کرتے تھے۔ مگر اب یہ بات بھی پرانی ہوگئی۔

دوصدّیاں گزر گئیں۔۔۔ شناخت کی فائل جانے کب کی بند ہوگئی تھی۔

اچانک ایک نوجوان جینٹیک انجینئر کو'اپنے آقا ہم' ٹیم کا خواب سچا ہوتا نظر آیا۔ لوگ کہتے تھے اس انجینئر کی شکل ہو بہو شیشے میں بند آدمی کی، ہال میں دیوار پر آویزاں قد آدم تصویر جیسی ہے۔ بال۔ چہرہ۔ آنکھوں کا رنگ۔ قد سب بالکل ویسا ہی۔

آخر کار انجینئر اپنے تجربے میں کامیاب ہوگیا۔

جیتے جاگتے متحیّر خاکی نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔

دوصدیوں سے محفوظ پڑا اس کا پسندیدہ لباس کچھ زیادہ پرانا نہیں لگ رہا تھا۔

بہت شکریہ۔۔۔ اب میں جاتا ہوں۔۔۔ اس نے انجینئر کی طرف دیکھا اور مزید حیرت زدہ رہ گیا۔

تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔

انجینئر مسکراتا رہا۔۔۔

تم۔۔۔ میری۔۔۔ اولاد ہو۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔

وہ خوشی سے چیخا۔

میں نہیں۔۔۔ جانتا۔۔۔ صدیوں پہلے کی بات میں کیا جانوں۔ انجینئر لاپرواہی سے بولا۔

صدیاں۔۔۔؟ خاکی بڑبڑایا۔

ہاں۔۔۔دوصدیاں گزرگئی ہیں تمہاری موت کو۔۔۔

دوسوسال۔۔۔اف۔۔۔

وہ سرتھام کردیوار سے ٹک گیا۔

مگرتم۔۔۔تو۔۔۔تم۔۔۔میری ہی نسل سے ہو۔۔۔میری اولاد کی۔۔۔اولاد کی۔۔۔اولاد کی۔۔۔وہ مسکرایا اور تمہارے Apron پر لگے اس نیم پلیٹ پر میرا دوسرا نام بھی ہے۔۔۔تم۔۔۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔انجینئر وہ ایک قدم آگے بڑھا۔انجینئر اسے بغیر کسی تاثر کے دیکھتا رہا۔۔۔

آؤ۔۔۔ذرا حساب لگائیں کہ تم میری کون سی پیڑھی سے ہو۔۔۔می۔۔۔تمھارا کون ہوں۔۔۔

انجینئر کے چہرے پرناگواری سی چھاگئی۔

کچھ لمحے اسی طرح گزرگئے۔

ٹھیک ہے۔۔۔میں جارہاہوں۔

وہ انجینئر کی طرف پلٹا۔

کہاں جاؤگے۔۔۔انجینئر کی آواز ہوبہو اسی کی طرح تھی۔

تمہاری آواز۔۔۔تم۔۔۔ہاں گھرجاؤں گامیں۔۔۔میں۔

کس جگہ۔۔۔؟

اپنا پتہ جانتا ہوں میں۔۔۔میرا پتہ ہے۔۔۔دس ہزار درخت والے جنگل کے پاس میٹھے پانی کے دریا کے کنارے دومنزلہ محل۔

اس نام کا کوئی مقام پایا جانا ممکن ہی نہیں۔۔۔تم بیٹھو۔۔۔میڈیا تمھارا انٹرویو لینے کوبیقرار ہے۔۔۔اور میرا بھی۔

نہیں۔۔۔ میرے کپڑے پرانے لگ رہے ہیں۔۔۔ مجھے نئے ملبوسات خریدنے ہیں۔

کیسے خریدو گے۔۔۔؟ تم جانتے نہیں ہو۔۔۔ میں دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک۔۔۔

تھے۔۔۔ تم دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے، انجینئر نے اس کی بات کاٹی۔

مطلب۔۔۔؟ خاکی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

کیا وہ دولت اتنی پیڑھیاں گزر جانے کے بعد تمہارے وارثوں نے ختم نہیں کر ڈالی ہو گی؟

مگر میں نے تو وصیت۔۔۔

ایسی وصیت جو مر کر دوبارہ جی اُٹھنے سے متعلق ہو۔۔۔ کون مان سکتا تھا۔ دو صدی پیشتر۔۔۔

ٹھیک ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ میری اسناد ہیں۔۔۔ میرا تجربہ۔۔۔ تو میرے پاس ہے۔۔۔ میں تیز رفتار ہوائی جہاز بنانے کا ماہر ہوں۔۔۔

اس کی ضرورت برسوں ہوئے ختم ہو گئی۔۔۔ اب ہم Space Warp کے ذریعے ایک جگہ سے غائب ہو کر دوسرے مقام پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

۔۔۔ ارے۔۔۔؟ اچھا۔۔۔؟۔۔۔ تو۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں محنت کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔۔۔

خاکی دروازے کے قریب جا کر دروازہ کھولنے والا دستہ گھمانے ہی لگا تھا کہ انجینئر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

چلو۔۔۔ ادھر بیٹھو۔۔۔ بیٹھو۔۔۔ گارڈس انجینئر تیز آواز میں پہرے داروں کو آواز لگاتا ہے۔

آرام سے اس کرسی پر بیٹھے رہو۔۔۔ تمہارے ساتھ لوگ باتیں کرنے آئیں

گے۔۔۔تم سے کئی طرح کے سوال کریں گے۔۔۔تمہاری باتوں سے کوئی بے چینی ظاہر نہ ہو۔۔۔سمجھے؟

تم کون ہو مجھ پر حکم چلانے والے۔وہ چیخا۔

میں تمھارا خالق ہوں۔۔۔تمھارا مالک ہوں۔تم ماضی کی کتاب کا ایک پھٹا ہوا ورق ہو۔اب اگر تمہاری کوئی شناخت ہے تو وہ مجھ سے ہے کہ میں نے تمھیں بنایا ہے۔مکمل کیا ہے تمہارے وجود کو۔عالم میں دھوم مچ گئی ہے میرے اس کارنامے کی۔۔۔اور اب میں ایک ایسا تجربہ کروں گا جس سے رہتی دنیا تک، میرا نام لوگوں کی زبان پر رہیگا اور اس کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔انجینئر خاموش ہو گیا۔

مجھے کیا کرنا ہوگا۔۔۔؟وہ کانپتے ہوئے بولا۔

میں تمہاری شہ رگ کاٹ کر اسے میڈیا کے سامنے اسی وقت جوڑ کر تمھیں مرنے کے فوراً بعد زندہ کروں گا۔

بس ذرا تمہاری صحت اچھی ہو جائے تو۔۔۔

نہیں تم۔۔۔تم ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔میں۔۔۔میں تم پر مقدمہ دائر کر دوں گا۔۔۔اور قانون تمھیں۔تمھیں۔

ہا۔۔۔ہا۔۔۔ہا۔۔۔تم ہو ہی کون، ہڈیوں کا ایک لاوارث ڈھانچہ۔۔۔جو، اب۔۔۔اب جو بھی ہے میری اپنی ملکیت ہے۔۔۔میرے گھر کے پالتو جانوروں کی طرح۔۔۔اور تم تو۔۔۔تم تو اینیمل ایکٹ میں بھی نہیں آتے۔۔۔گارڈس۔۔۔اسے شیشے کے اس صندوق میں لٹا کر آکسیجن کی نلی لگا دو۔۔۔حفاظت سے۔۔۔صندوق کی چابی میرے کیبن میں رکھ دینا۔۔۔میں باہر ذرا میڈیا سے بات کرلوں۔۔۔

محافظ خاکی کی طرف بڑھتے ہیں۔تو اُسے ایک زوردار جھٹکا لگتا ہے۔وہ اٹھ بیٹھتا ہے۔اور اپنے شب خوابی کے لباس کی ریشمی آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہے۔ الٹے ہاتھوں سے دونوں آنکھوں کو ملتا ہوا وہ بری طرح ہانپ رہا ہے۔اب وہ پوری طرح

بیدار ہو چکا ہے۔ اسے احساس ہوا کہ فون لگاتار بج رہا ہے۔

اوشٹ اپ۔۔۔

وہ فون اٹھا کر بغیر کچھ سنے واپس پٹخ دیتا ہے اور کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد پلٹ کی بائیں جانب دیکھتا ہے۔

پلنگ کے برابر کی تپائی پر چاندی کی منقش کشتی میں اس کی صبح کے وقت پینے والی پسندیدہ شراب کی بھری ہوئی بوتل اور نیلے رنگ کے باریک کانچ کا نازک سا جام رکھا ہوا ہے۔ دیوار کے ساتھ لگی، لکڑی کی نہایت خوبصورت گُل بوٹوں والی بڑی سی الماری میں کانچ لگے شفاف طاقچوں کے اندر مختلف اقسام کی شراب، چھوٹی بڑی جسامت کی الگ الگ شکل کی بوتلوں میں قطار در قطار سجی ہے۔ کھڑکی کے ذرا سے سرکے ہوئے پردے کی آڑ سے چلی آئی صبح کی دھوپ ٹھیک بار کی بوتلوں پر ہی پڑ رہی ہے اور جِھل مِل جِھل مِل کر رہے شیشوں نے کمرے میں ساتوں رنگ بکھیر دیئے ہیں۔

وہ کچھ سیکنڈ یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کشتی میں رکھی بوتل اٹھا کر پوری طاقت سے بار پردے ماری تو سرخ رنگ کے دبیز کشمیری ریشمی قالین پر کانچ کے بے شمار ٹکڑے بکھر گئے اور کمرے میں ان گنت ننھے منے سورج جھلملانے لگے۔

چھ باوری ملازم بھاگے بھاگے اندر آئے۔

سر۔۔۔؟ وہ ہاتھ باندھے پریشان حال سے اس کی پائینتی کی جانب کھڑے ہو گئے۔

جسٹ۔۔۔ گیٹ۔۔۔ آؤٹ۔ وہ دانت پیس کر رک رک کر بولا تو سب باہر کی طرف لپکے۔ اور وہ مسہری سے اتر کر کھڑکی کے قریب آیا۔ پردہ سرکا کر اس نے باغیچے میں نظر دوڑائی۔ اس کی بیوی گود میں اخبار پھیلائے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے سنگِ مرمر کی میز پر بیضوی کشتی میں نرم گرم ٹی کوزی کے اندر سے چائے دانی کا چمکدار روپہلا دستہ جھانک رہا تھا۔ برابر میں رکھی پیالی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اُس کے شانوں پر پھیلے آدھے بھیگے

بال صبح کی نرم دھوپ میں رچی ہوا سے ہولے ہولے لہرا رہے تھے۔ وہ بسکٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اپنے سامنے پھینک رہی تھی اور تین چار چڑیاں انھیں پھرتی سے چگتی ہوئی ظاہر اور غائب ہو رہی تھیں۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف مڑا۔

اس کا چہیتا ملازم جاتے ہوئے مڑ مڑ کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

لان میں ایک اور کرسی لگا دو۔۔۔

اور۔۔۔ایک کپ بھی لے جانا۔۔۔

اس نے مسکرا کر کہا۔

یس سر۔۔۔یس سر۔۔۔

وفادار ملازم کا چہرہ پھول کی طرح کھِل اٹھا۔

تجربہ گاہ

سیدہ شایستہ مبارک بخاری

میری نظر میں ایک فنکار کے فن پارے پر بات کرنا کسی طالب علم کے امتحانی پرچے کی مارکنگ کرنے کے مترادف ہے۔ایک حساس طالبِ علم پورے سال محنت کرنے کے بعد جب امتحان میں پرچہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کے لئے ذرا سا کاما (,) بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک نمبر کا معروضی سوال بھی اگر ممتحن کی نظر سے چھوٹ جائے تو طالب علم کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا اور یہ ناانصافی اس کے کریئر کو نہ سہی مگر اس کے ذہن کو منتشر کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک ناقد بھی کسی تخلیق پر تنقید کرتے وقت ایک منصف یا پھر ایک ممتحن کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ جس کا یہ فرض بنتا ہے کہ تخلیق کے ایک ایک جملے بلکہ ایک ایک لفظ پر غور کر کے اس تجربے تک پہنچے جو اسکے پس پردہ چھپا ہو۔ ایک نقاد کے قلم سے نکلا ایک جملہ بھی ایک تخلیق کار کو اس کا صحیح مقام دلا سکتا ہے۔ میں کوئی ناقد تو نہیں مگر ترنم ریاض کے افسانے ''تجزیہ گاہ'' پر تجزیہ کرتے ہوئے اس وقت خود کو اسی منصب پر فائز محسوس کر رہی ہوں اور مذکورہ افسانہ قریباً بیس سے زائد بار پڑھ چکی ہوں۔ یقین مانیں ہر بار افسانہ پڑھنے کے بعد افسانے کے حوالے سے نئے انکشافات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

ترنم ریاض مرحومہ کا شمار اردو کی صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ زیر

بحث افسانہ ''تجربہ گاہ'' ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے ''یمبر زل'' میں شامل ہیں۔ جو 2004 میں شائع ہوا۔

بقول وارث علوی۔۔

''ناول اور افسانے کا ایک اہم فنکش انسان اور اسکی فطری اور جبلی طاقتوں کو سمجھنے اور ایک مزہبی اور اخلاقی معاشرے میں اس کی زندگی کے تجربات اور اس کی آزمائشوں کی تفہیم اور تفسیر کا رہے''

(گنجفہ بازِ خیال۔۔ وارث علوی)

ترنم ریاض کا افسانوی ادب بخوبی اپنا یہ فنکشن نبھانے میں کامیاب ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں جہاں اصلاح اور تانیثی رجحانات غالب نظر آتے ہے جو کہ مشرقی ادب کا خاصا رہا ہے۔ وہی ''تجربہ گاہ'' اُن کے پورے افسانوی ذخیرے میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ کیونکہ یہ اُردو افسانہ نگاری میں سائنس فکشن کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور غالباً اس نوعیت کا اُنکا پہلا افسانہ ہے۔

سائنس فکشن جہاں مغربی ادب میں ایک الگ اور اہم ترین صنف کے بطور جانی جاتی ہے وہی اُردو ادب میں ابھی تک سائنس فکشن نہ ہونے کے برابر ہے۔ Mr Jim walker اپنے مقالے "Urdu science fiction where is it" میں یہاں تک لکھتے ہے کہ "Urdu literature contains many genres including fantasy,but science fiction is missing" اگر چہ سرے سے اردو میں سائنس فکشن کی موجودگی کو خارج کرنا بھی دُرست نہیں ہوگا کیونکہ اُردو ادب میں سائنس فکشن پر مبنی کئی فن پارے موجود ہیں۔ لیکن اردو افسانے میں سائنس فکشن کو شاذ و نادر ہی بھرتا گیا ہے۔ ایسے میں ''تجزیہ گاہ'' کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیمبرج اکیڈمک کنٹینٹ ڈکشنری کے مطابق سائنس فکشن ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو سائنس کی قیاسی ترقیات اور زندگی پر بالخصوص مستقبل میں ان کے اثرات سے متعلق ہو اسکی بنیاد ''کیا

ہوگا اگر'' کے مفروضے پر قائم ہے۔اس تعریف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''تجزیہ گاہ'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہر پہلو سے اسے سائنس فکشن بالخصوص "bio punk" کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ bio punk یعنی ''سائنس فکشن کی وہ قسم جس کی کہانیوں کی بنیاد بائیو ٹیکنالوجی پر قائم ہوتی ہے۔اس میں Gene, DNA اور genetic engineering کا ذکر ملتا ہے۔انسانی جینز میں تبدیلی کر کے نئے mutants پیدا کرنا اور cloning کرنا اس کے خاص موضوعات ہیں۔''

(اردو میں سائنس فکشن کی روایت۔۔۔۔خورشید اقبال)۔

تجربہ گاہ بھی بالکل ایسی ہی کہانی ہے۔جس میں ''خاکی'' نام کا ایک رئیس اور مغرور شخص اپنی دولت کے بل بوتے پر موت کو شکست دے کر رنگ وشباب کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔شدید بیماری کی وجہ سے جب ڈاکٹر اسے بتاتے ہیں کہ وہ مرنے والا ہے تو وہ احتجاج کرتا ہے کہ اسے زندہ رہنا ہے۔پھر سائنسدانوں کی ٹیم کا سربراہ اسے اُمید دلاتا ہے کہ genetic engineering کی ایک تحقیق کے ذریعے وہ موت پر قابو پانے والے ہیں مگر ابھی ان کی تحقیق نامکمل ہے۔اس پر وہ انہیں اسکی ہڈیوں کا ڈھانچہ hydrogen peroxide میں تحلیل کر کے محفوظ کرنے کے لیے کہتا ہے۔اور پھر دو صدیاں گزر جانے کے بعد اسی کی نسل کا ایک جینیٹک انجنیئر اسے دوبارہ زندگی دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

مصنفہ نے افسانے کی شروعات کچھ اس انداز سے کی ہے کہ آخر تک قاری اس مغالطے میں مبتلا رہتا ہے کی راوی خاکی کی اصل کہانی بیان کر رہا ہے لیکن افسانے کے آخر پر اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ دراصل یہ خاکی کی کہانی نہیں بلکہ اس کا خواب بیان ہو رہا ہے۔لیکن فن کی پختگی دیکھیے کہ خواب تو خواب لیکن خواب کے ذریعے ہی بنا خاکی کی شخصیت پر کوئی تبصرہ یا رائے قائم کیے قاری پر اسکی اصل شخصیت عیاں ہوتی ہے۔جسکا انکشاف افسانے کے پہلے ہی جملے سے ہوتا ہے۔

''خاکی نے ہسپتال کی تجربہ گاہ میں لگے بڑے سے آئینے میں خود کو سر سے پاؤں تک دیکھا'' دراصل یہ خواب ہی خاکی کو آئینہ دکھاتا ہے اور اس آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ وہ ایک جھٹکے میں خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنی حقیقت کو پہچانتا ہے جو خاک ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں پر پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ نے افسانے کے مرکزی کردار کا نام خاکی ایسے ہی نہیں رکھا ہے۔ خاکی دراصل آدم زاد کو ریپرزنٹ کرتا ہے۔ جو اس دور میں آرٹیفیشل انٹیلی جنس یعنی مصنوعی ذہانت کے دم پر موت کو بھی مات دینے کی تگدو میں ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جائے مگر پھر بھی قدرت کے خلاف جا کر قدرت کو نہیں ہرا سکتا۔ بلکہ اس مقابلہ آرائی میں وہ اپنا ہی نقصان کر جاتا ہے۔ افسانے میں جو مکالمہ نگاری سائنس دانوں کی ٹیم ''اپنے آقا ہم'' کے سربراہ اور خاکی کے درمیان پیش کی گئی ہے اسے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کا سائنسی شعور کس قدر بالیدہ ہے۔ کیونکہ عام فکشن لکھنا تو آسان ہے لیکن سائنس فکشن لکھنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔ کیونکہ اس کے لیے سائنسی علوم سے صرف واقفیت ہی نہیں بلکہ اپڈیٹ رہنا ضروری ہے۔ ترنم ریاض کا مطالعہ اس قدر وسیع ہے کہ وہ نہ صرف جینیٹک انجینئرنگ کی بنیادوں سے واقف ہے بلکہ مستقبل میں کیا کچھ اس شعبے میں ہونا ممکن ہے وہ بھی بخوبی تصور کر سکتی ہیں۔ اور اسی عنصر یعنی ''کیا ہوگا اگر'' کا ہونا ہی کامیاب سائنس فکشن کی ضمانت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایجادات ایجاد ہونے سے پہلے کہیں نہ کہیں ادب میں تصور کی گئی تھی اور بعد میں ان پر کام ہوا اور وہ حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آج موجود ہے۔ ویکیپیڈیا کے ایک مضمون ''افسانے میں مصنوعی ذہانت'' میں اس حوالے سے لکھا گیا ہے کہ "اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی ناول نگار نے اپنے ناول میں کسی عجیب و غریب مشین یا حربے کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے کے لیے وہ مشین ایک عجوبہ اور محض ادیب کا تصور معلوم ہوتی ہیں مگر چند برسوں کے بعد ہی وہ تصور حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے اور سائنسدانوں مشین ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں'' آگے جا کر وہ "the invisible Man" کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے

ہیں،''ایچ جی ویلس کے ناول the invisible Man میں ہیرو ایک ایسا طریقہ ایجاد کرتا ہے جس کے استعمال سے وہ موجود ہوتے ہوئے بھی لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور اس ناول کے شائع ہونے کے دس سال بعد جرمن سائنسدان پروفیسر ڈبلیو اسپالٹ ہولز نے مصنف کے خیالات کو بنیاد بنا کر تجربات شروع کیے اور مردہ جانوروں کے اعضاء کو غائب النظر بنانے میں کامیاب ہو گئے''

عین ممکن ہے کہ ترنم ریاض کے افسانے کا جینیٹک انجینئر بھی حقیقت میں سائنسدانوں کی ٹیم اپنے ''آقا ہم'' کا خواب پورا کرتا ہوا مستقبل میں نظر آئے اور اسپیس ریپ جو دراصل jhon.w.campbell کا تصور کردہ خیال ہے جو انہوں نے اپنے ناول islands of space میں پہلی بار 1957 میں پیش کیا تھا، بھی حقیقت کا روپ دھار لے۔

سائنس دانوں کی ٹیم کا نام اپنے آقا ہم ہونا بھی دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سائنسدان اپنے علم کے بل بوتے پر دراصل خالق کائنات سے مقابلہ آرائی میں لگے ہیں اور خود خالق بن کر انسان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں جو بعد میں افسانے کے مکالموں سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔

''تم کون ہو مجھ پر حکم چلانے والے۔''

وہ چیخا!

''میں تمہارا خالق ہوں۔۔۔۔تمہارا مالک ہوں۔تم ماضی کی کتاب کا ایک پھٹا ہوا ورق ہو۔اب اگر تمہاری کوئی شناخت ہے تو وہ مجھ سے ہے کہ میں نے تمہیں بنایا ہے مکمل کیا ہے تمہارے وجود کو۔''

آگے جا کر مصنفہ نہایت خوبصورتی سے قارئین کو یہ احساس دلاتی ہے کہ انسان کبھی خدا نہیں بن سکتا کیونکہ اس کے اندر کا تکبر، خود غرضی، لالچ اور شہرت کی بھوک اسے کبھی بھی انسان کے درجے سے بلند نہیں ہونے دے گی اور انسان پر اس کی حکومت محض انسانیت کے لیے زوال ہے۔ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس:

''عالم میں میرے اس کارنامے کی دھوم مچ گئی ہے،۔۔۔۔۔اور اب میں ایک ایسا تجربہ کروں گا جس سے رہتی دنیا تک میرا نام لوگوں کی زبان پر رہے گا اور اس کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟۔۔۔۔۔۔۔۔وہ کانپتے ہوئے بولا۔''

''میں تمہاری شہ رگ کاٹ کر اسے میڈیا کے سامنے اس وقت تمہیں مرنے کے فوراً بعد زندہ کرونگا۔۔۔۔''

''۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہیں تم .. تم .. تم ایسا نہیں کر سکتے میں میں تم پر مقدمہ دائر کروں گا اور قانون تمہیں۔۔تمہیں۔۔۔۔۔''

اس کے فوراً بعد آنے والے مکالمے کو افسانے کی جان قرار دیا جاسکتا ہے۔اسے پڑتے ہی قاری پر خوف کی لہر دوڑتی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر artificial intelligence کے اس طوفان کو نہ روکا جائے تو انسان کا مستقبل کس قدر خوفناک ہوسکتا ہے اور انسان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہوسکتی ہے''ہاہاہا۔۔۔تو ہے ہی کون۔۔۔ہڈیوں کا ایک لاوارث ڈھانچہ۔۔۔۔۔جواب۔۔۔۔اب جو بھی ہے میری اپنی ملکیت ہے۔۔۔۔۔میرے گھر کے پالتو جانوروں کی طرح۔۔۔اور تم تو۔۔۔تم تو اینمل ایکٹ میں بھی نہیں آتے۔افسانے کا مرکزی کردار بھی اس موڑ پر خواب سے بیدار ہوکر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔اسے یقین نہیں آتا ہے کہ گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا یا پھر یہ کوئی حقیقت تھی۔یہاں افسانہ نگار نے جو منظر کشی کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خاکی کی فریسٹیشن کو سکرین پر دیکھ رہے ہیں۔اس کا بوتل اٹھا کر بار بار پردے پر مارنا دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی سونچ اب بدل گئی ہے۔وہ اپنی عیاش پرستی اور گمراہ کن زندگی کا نتیجہ خواب میں دیکھ آیا تھا اسلئے وہ خواب میں ہی اسے الوداع کہہ چکا تھا۔چونکہ افسانے میں طوالت کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔اسلئے افسانہ نگار کو اپنا نظریہ اور اپنا مطلب قاری تک پہنچانے کے لیے ایسے جملوں بلکہ لفظوں اور استعاروں کا سہارا لینا پڑتا

ہے جو اپنے اندر معنی کی وسیع کائنات چھپائے ہو۔زیرِ بحث افسانے میں بھی مصنفہ نے خوب سوچ وچار کے بعد ایک ایک لفظ استعمال میں لایا ہے تبھی جا کر افسانہ اختصار کے باوجود مصنفہ کا نظریے حیات کاری تک پونچہانے میں کامیاب ہوا ہے۔۔

''وہ کچھ دیر یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس نے کشتی میں رکھی بوتل اٹھا کر پوری طاقت سے پردے پر ماری تو سرخ رنگ کے کشمیری ریشمی قالین پر کانچ کے بے شمار ٹکڑے بکھر گئے اور کمرے میں ان گنت ننے منے سورج جھلملانے لگے۔'' کانچ کے ٹکڑوں پر ننے منے سورج جھلملانا دراصل خاکی کی زندگی میں اُمیدوں کے سورج ہیں۔یہ خوبصورت استعارہ نہ صرف خاکی کی زندگی میں آئے بدلاؤ کو درشاتا ہے بلکہ اُس وقت کے منظر کی مؤثر تصویر کشی کرنے میں بھی معاون ثابت ہوا ہے۔یہ ترنم ریاض کی مثبت سوچ کا ہی نتیجہ ہے کہ مغربی فکشن نگاروں سے متاثر ہو کر Distopian science fiction لکھنے کے باوجود بھی یہ افسانہ مثبت سوچ کو پیش کرتا ہے۔۔گویا اس افسانے میں بھی اصلاح پسندی کے رجحان نے ترنم ریاض کو اپنی گرفت میں لے ہی لیا ہے۔افسانے میں شامل اس اقتباس پر ذرا غور فرمایئے۔

''اپنا پتہ جانتا ہوں میں۔۔۔۔میرا پتہ ہے۔۔دس ہزار درخت والے جنگل کے پاس میٹھے پانی کے دریا کے کنارے دومنزلہ محل''

''اس نام کا کوئی مقام پایا جانا ممکن ہی نہیں۔۔۔۔۔۔'' مذکورہ جملوں میں مصنفہ نے قاری کا زہن ماحولیاتی تباہ حالی کی طرف پھیرنے کی کوشش کی ہے۔اور ہمیں احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ ایسا وقت آنے والا ہے جب نہ جنگل ہونگے نہ میٹھا پانی لیکن اس سب کا ذمیدار انسان خود ہوگا۔

افسانے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو تانیثیت کا ہلکا سا اثر اس افسانے میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔محض افسانے کے دو جملے ایک پدری معاشرے میں شوہر اور بیوی کے تعلق کی داستان سناتے ہیں۔

''اس کی بہت سی معشوقاؤں میں سے کسی نے اسے اس بلانوشی سے باز رہنے کو نہیں کہا۔ بیوی کی وہ کوئی بھی بات نہیں مانتا تھا''

محض یہ دو جملے ہمارے معاشرے میں شوہر کی نظروں میں بیوی اور باہر والیوں کی حیثیت اور حقیقت قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ بیوی جو وفا شعار ہونے کے ساتھ ساتھ شوہر کے لیے فکر مند بھی ہے مگر اس کی کوئی بھی بات یا نصیحت شوہر کے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔ وہی دوسری طرف اسکی معشوقاؤں کو نہ اسکی صحت سے غرض ہے نہ اسکی بربادی سے کوئی مطلب۔ وہ تو بس اسکی دولت کو لوٹنے میں یقین رکھتی ہیں۔ پھر بھی اس آدمی کے لیے انہی کی باتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن، بدقسمتی سے وہ اُسے یہ بتانے کی کبھی زحمت نہیں کرتیں کہ یہ عیاشیاں اسے کس قدر بھاری پڑ سکتی ہیں۔ اور بتاتی بھی کیوں انہیں تو اسکی عیاشیوں سے ہی غرض تھی۔ لیکن شکر اس خواب کا جو اسکے لیے چشم کشا ثابت ہوا۔ کہتے ہے نہ جہاں آنکھ کھلے وہی سویرا۔ اسکی آنکھ کھلتے ہی اسکی اور اسکے اپنوں کی زندگی میں بھی سویرا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسکراتے ہوئے ملازم سے کہتا ہے''

''لان میں ایک اور کرسی لگادو----''

''اور----ایک کپ بھی لیجانا''

''اس نے مسکرا کر کہا''

''یس سر یس سر''

''وفادار ملازم کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا''

اسطرح وہ اپنی زندگی کے یہ خوشگوار لمحے لان میں بیٹھی اپنی بیوی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے اور افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

مجموعی طور پر اس افسانے کے فنی لوازمات کی بات کریں تو ہر اعتبار سے اس سے ایک کامیاب افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پلاٹ کی بات کریں تو وہ اس قدر خوبصورتی اور چستی سے بھنا گیا ہے کہ قاری کو اول سے آخر تک اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ مکالمے

عین کرداروں کی نفسیات کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں خاکی کے مکالموں سے اس کی رئیسی اوراس کا غرور چھلکتا ہے وہی سائنسدانوں کے سربراہ کے مکالمے علم پراس کے یقین کو ظاہر کرتے ہیں جینیٹک انجینئر کے مکالمے بھی اس کے کردار کے عین مطابق تخلیق کیے گئے ہیں کیونکہ یہ کرداراس آنے والے انسان نما حیوان یا روبورٹ کے لیے استعمال کیا گیا ہو جس سے انسان اپنے ہاتھوں سے تو تخلیق کر رہا ہے لیکن مستقبل میں وہی انسانوں کو قابو کرسکتا ہے جو انسانیت کے زوال کی آخری حد ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے اسے خاکی کا ہم شکل بتایا ہے جو ظاہراً تو اس کی اپنی اولاد میں کوئی ہے۔ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدم کی اولاد ہی آدمیت کے لیے زوال کا سبب بنے گی۔ جہاں تک افسانے میں استعمال شدہ زبان اور اسلوب کی بات ہے تو وہ بھی عین افسانے کے مطابق استعمال ہوئی ہے۔ انگریزی کی کئی سائنسی اصطلاحات اس میں بھرتی گئی ہیں جنہیں اگر اردو میں لکھا جاتا تو افسانے کا حُسن اثر انداز ہوتا۔۔ بقول وارث علوی ''ترنم ریاض کی پہلی اور آخری کوشش کہانی لکھنے کی ہوتی ہے۔۔۔ جادو جگانے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں''

لیکن میری رائے ہے کہ ان کی یہی پہلی کوشش اتنی مکمل اور پختہ ہوتی ہے کہ دوسری کوشش کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ انہوں نے اس افسانے میں جس انداز سے بچا بچا کر الفاظ خرچ کیے ہیں وہ اُن کے تخلیقی ڈسپلن کو ظاہر کرتا ہے افسانے کا اختصار ہی اس کا سب سے بڑا سنگھار ہے۔ میرے خیال میں اس افسانے میں ایک بھی جملے کو کم کرنے یا پھر اضافہ کرنے کی گنجائش نہیں۔

آخر پر اتنا کہنا چاہوں گی کہ سائنس فکشن لکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ ادب کا براہ راست اثر معاشرے پر ہوتا ہے اور جیسا ادب تخلیق ہوگا ویسا ہمارا معاشرہ تشکیل پائے گا جس کی واضح مثال مغرب اور مغربی ادب ہے۔ کیونکہ مغربی ادب چاہے وہ تحریری ادب ہو یا اسکرینی ادب، سائنسی رجحانات سے بھرا پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرہ بھی سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہروں سے بھرا پڑا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ آج کے دور میں

وہی قوم ترقی کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے جو سائنس و ٹیکنالوجی کے علوم سے بہرہ ور ہو۔ امید کرتے ہیں اردو ادیب بھی اب ترنم ریاض کے اس نقطے میں مزید نقطوں کا اضافہ کر کے اردو سائنس فکشن کی ایک طویل لکیر کھینچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تا کہ اُردو کی آنے والی نسلیں بھی فخر سے کہہ سکیں کہ ''ہم بھی کسی سے کم نہیں''

☆☆☆
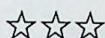
آدھے چاند کا عکس

پھول سا چہرا اترا دیکھ میرا پُر سکون دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو انہیں ہمیشہ کی طرح خوش وخرّم کِھلا کِھلا دیکھنا تصوّر کر رہی تھی۔ پھر یہ پتھر سی خاموشی چہ معنی دارد۔

ابھی کچھ مہینے ہی کی بات ہے۔ سالگرہ کی ایسی ہی ایک تقریب میں شرکت کر کے لوٹے تھے۔

چہرے سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ سر پر کاغذ کی لمبی سی تکونی چمکتی ہوئی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، ہاتھ میں تحفہ کے بدلے میں ملے ہوئے تحفے کا چھوٹا سا پیکٹ۔ گریبان پر کیک کی سوکھی ہوئی کریم۔ نرم نرم بھرے بھرے رخساروں پر مہین مہین سی افشاں جو جنم دن کے کیک کے اوپر لٹک رہے غباروں کے پھوڑنے سے اڑ کر چاروں طرف بکھرتے ہوئے ان کے گالوں سے بھی جا چپکی تھی۔ آنکھوں کے نچلے پپوٹوں سے لگی آنسو کے قطرے کی نصف جسامت کے برابر پسینے کی ننھی سی بوند تھی جو اس بات کی شاہد تھی کہ خوب دھما چوکڑی ہوئی ہے۔ اور مزے لوٹے گئے ہیں۔ ویسے بھی انہیں پسینہ کچھ زیادہ ہی آتا ہے۔

یہ ہیں ہمارے ساڑھے گیارہ سالہ صاحبزادے عاطفؔ ۔۔۔ جلد کا رنگ کھلا ہوا گندمی، آنکھوں کی رنگت شہد جیسی، وزن نارمل سے کوئی ۵ رکیلو زائد، شوق ستاروں اور

سیّاروں کی کھوج کرنا۔

فی الحال کتابوں اور الیکٹرانک میڈیا سے بعد میں آسمان کا سفر کرکے کسی بھی موضوع پر جدید ترین معلومات سے واقفیت، اسکول کوئیز میں ہمیشہ اوّل آنا، کوئی بھی چھپا ہوا کاغذ بغیر پڑھے نہ چھوڑنا۔

اسکول بس، گاڑی، بیت الخلاء، مسہری، ہر جگہ مطالعہ میں مصروف رہنا یا پھر کمپیوٹر کے اسرار و رموز کا حصّہ بن جانا۔

ان کا چہرہ گول سے اور ناک ترشی ہوئی ستواں، دہانہ چھوٹا سا، دانت موتیوں جیسے، بھرا بھرا نرم نرم سا سراپا، یعنی ساڑھے گیارہ برس کی عمر بھی پانچ، چھ سالہ گل گوتھنے سے کہ بے تحاشا لپٹا لینے کو جی چاہے، یعنی پچھلے پانچ چھ برس سے چہرے کی معصومیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

کہیں بھی جاتے آکر مجھے ایک ایک بات سناتے۔ بھلے اسکول مین زپ (Zip) کھلی رہ جانے پر بچوں کے Shame,Shame کہنے کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ تقریب سے لوٹتے ہی سنانے لگے کہ عامر کی امّی نے انہیں کتنا پیار کیا۔ اور سب بچّے ان ہی کے ساتھ تصویر کھینچوانا چاہتے تھے۔

''آپ سب سے اچھے جو ہو ہیں۔'' میں نے آنکھ سے لپٹی پسینے کی بوند پونچھ کر کہا تھا۔

''سب میں سے کون اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ ہمارا شہزادہ ہی نا؟'' میں نے پیار سے کہا۔

''نینا ہی لگ رہی تھی مگر۔'' وہ تحفہ میز پر رکھتے ہوئے بولے اور کچھ سوچنے لگے۔

''مگر کیا۔۔۔ وہ عیسائی دلہن کے لباس میں پری سے لگ رہی تھی۔

''میں نے بالکنی سے دیکھا تھا اسے'' میری بیٹی نے کہا جو ان سے ڈیڑھ برس بڑی ہے۔

''ہاں لگ تو رہی تھی مگر اس کی ناک موٹی ہے نا، اگر تھوڑی سی پتلی ہوتی، میرا

مطلب ہے لمبی ہوتی تو بہت اچھی لگتی۔'' وہ کچھ رُک رُک کر بولے۔

''ایشوریا رائے سی لگتی نا۔؟ عناب بولی۔

''ہاں ہوسکتا ہے۔مگر ایشوریا رائے کی ناک کچھ چھوٹی ہے۔وہ انڈین کم اور چاپانی زیادہ لگتی ہے۔''

وہ جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولے اور میں حیرت زدہ سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ان کے مشاہدے پر حیراں۔۔۔۔۔۔

''ہاں جاپانی گڑیاسی۔'' عناب نے کہا۔

''اسے تو دنیا کی حسین ترین لڑکی قرار دیا گیا تھا۔۔۔'' میں نے بحث سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ۔۔۔۔۔ ماماں، مجموعی طور پر تو خوبصورت ہے نا، جواب بھی اچھے دیئے تھے اس نے ججوں کو۔'' وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا تحفہ کھولنے لگے۔

''پر مادھوری تو سب سے خوبصورت ہے۔نا عاطف؟'' عناب نے اپنے سوال کی تائید چاہی۔

''اُس کی گردن موٹی ہے۔سائڈ پوز میں بھدّی لگتی ہے۔'' وہ تحفے پر لپٹا کاغذ کھول کر ردّی کے ڈبے میں ڈالتے ہوئے بولے۔میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ کسی بھی چیز کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو بہترین انداز سے پرکھ اور پیش کر سکتے ہیں مگر اس انداز کی گفتگو میرے سامنے پہلی بار ہو رہی تھی۔

''اچھا یہ بتایئے۔۔۔وہ جو نینا کی کزن آپ کے جنم دن پر آئی تھی ساکشی۔وہ کیسی ہے؟''

میں نے ان کے پاس بیٹھ کر کہا۔

''یہ دیکھئے ماماں۔۔اچھا ہے نا۔'' اس نے تحفے میں ملا چاکلیٹ سے بھرا ٹفن باکس میری گود میں رکھ کر کہا۔۔۔اور مسکرا کر مجھے دیکھنے لگا میں بھی مسکراتے ہوئے اپنے

جواب کا انتظار کرنے لگی کہ اس لڑکی سا کشی کا حلیہ عاطف سے بہت ملتا تھا۔ مگر وہ کچھ زیادہ ہی گول مٹول سی تھی، نقوش تیکھے تیکھے سے بھی تھے۔

''وہ۔۔۔۔۔'' وہ زور سے ہنسے۔

''وہ۔۔۔ وہ موٹی ہے۔۔۔ ماماں۔۔۔ اکثر موٹے لوگ ایک جیسی شکل وصورت کے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ سارے وجود کو گول گول سا کر دیتے ہیں اور چہرہ ایک دم دائرہ ہو جاتا ہے۔ جب تک فیس دکھائی نہ دیں، صورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

وہ ہم دونوں کو چاکلیٹ کا ایک ایک ٹکڑا پیش کر کے اپنا چاکلیٹ سامنے کے دانتوں سے کترنے لگے۔

''موٹے تو جناب بھی اچھے خاصے ہیں۔۔۔'' عناب نے ان کا پیش کردہ چاکلیٹ عجلت سے زبان پر رکھتے ہوئے ناک سکیڑ کر کہا۔

''ہاں میرا وزن ۳۵ ر کیلو ہونا چاہیے اور میں ۴۰ ر کے قریب ہوں مگر میں نے کب کہا کہ میں Mr.India ہوں۔ پھر بھی وزن کم کر رہا ہوں۔ میں نے کیک کھانے سے انکار کیا تھا تو نینا کی ممی نے کھلاتے کھلاتے میرے کالر پر بھی مل دیا۔

عاطف نے سنجیدہ سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ اپنے آپ پر عناب کے فقرے کا اثر انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی انہوں نے عناب سے اپنا چاکلیٹ واپس مانگا۔ گو کہ

واپس مانگے جانے کے خدشے پیش نظر عناب نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی چاکلیٹ منہ کے حوالے کر دیا تھا۔

''اچھا بتاؤ۔۔۔ وہ کیسی ہے۔۔۔ وہ ہالی ووڈ ایکٹریس۔۔۔ جولیا رابرٹس ۔۔۔ وہ Step MOm والی۔۔۔'' عناب نے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ مگر اس کا Mouth (دہانہ) بہت بڑا ہے۔''

''وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگے پھر پلٹ کر میرے قریب آ گئے۔

''آپ کو پتا ہے ماماں---Aliens نہیں ہوتے۔'' اس نے اپنے نرم نرم ہاتھ میرے شانوں پر رکھ کر کہا---

''جی نہیں ---ایلینز ہوتے ہیں ----آپ اپنی جنزل نالج (General Kanowledge) کسی اور پر جھاڑیے۔'' عناب اسے میرے قریب دیکھ کر میرے ساتھ لگ کر بولی۔

''نالج نہیں ----میں سچ کہہ رہا ہوں ---نہ ہی Aliens ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے Saucershaped جہاز (اڑن تشتریاں) اور اگر کوئی (Unidentified Flying Objects)(U.F.O's) ہوں بھی تو ماہرین ابھی disclose نہیں کر رہے۔

''تو پھر وہ کیا تھا جو آسمان میں مسٹر اور مسز ٹرنٹ (Trent) کو تیرتا ہوا نظر آیا تھا۔'' عناب نے ان کے چہرے کے سامنے شہادت کی انگلی نچا کر کہا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں رکھ دیا۔

''ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ کی ہی ایک (Valley) میں سائنس دانوں نے ایک بڑی Lab میں کچھ Secret قسم کے آلات اور گول ساخت کے جہاز بنانے کی کوشش کی تھی جو Streamlined جہازوں کی پھرتی سے ہوا میں اُڑ سکیں۔'' وہ میرے شانوں سے ہاتھ ہٹا کر بولے تو میں نے ہاتھ پکڑ کر نرم نرم ہتھیلی کا بوسہ لے لیا۔

''پھر اب کیسے معلوم ہوا۔'' عناب نے حیرت اور دلچسپی سے پوچھا اور کھڑی ہو گئی۔

''اب انہوں نے خود ہی یہ راز ظاہر کر دیا۔-- پچاس برس تک لوگوں کو کنفیوژن (Confusion) میں رکھ کر---مگر اب بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ اس بارے میں الگ الگ باتیں بتاتے ہیں۔''

وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

عاطف خاموش ہوتے تو اپنی عمر کے بھولے سے بچے کی طرح نظر آتے مگر جب بولتے تو اس قدر خود اعتمادی اور معلومات کے زخیرے کے ساتھ کہ معلوم ہوتا کہ کوئی بالغ

آدمی ان کے اندر جا بیٹھا ہے، جسے کائنات کے تقریباً ہر حصّے کی معلومات ہے۔ انہیں کبھی میں نے وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔ نہ ہی اس طرح گم سم سا پایا۔

آج وہ اپنے اسکول کے دوست کی سالگرہ کی محفل سے لوٹے تھے۔ بھاری بھاری سے قدم اُٹھاتے ہوئے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے۔ آج انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں دروازے کی گھنٹی بھی نہیں بجائی تھی۔

بیپ بیپ۔۔۔۔۔ بیپ بیپ بیپ۔۔۔۔۔ بیپ بیپ بیپ۔۔

بس ایک بار انگلی بٹن پر رکھی۔ میں نے دروازے کی محدب آنکھ سے جھانک کر دروازہ کھول دیا اور باہیں پسار دیں۔ وہ بغیر میرے چہرے کی طرف دیکھے سمٹے سمٹے سے میرے ساتھ لگ گئے۔ دھیرے سے سلام کیا اور سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں پریشان سی پیچھے چل دی۔ انہوں نے بے دلی سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹ کو مسہری پر پھینکا اور کچھ سیکنڈ کے لیے مسہری کے کنارے پر بیٹھ کر اس طرح لیٹ گئے کہ ان کے پاؤں فرش پر سے کچھ اوپر اٹھے رہے۔ میں قریب گئی تو چھت کو تک رہے تھے۔

''کیا بات ہے ہمارے شہد رنگ نینوں والے شہزادے کو؟'' میں نے ان کا رخسار الٹے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے پوچھا اور مسہری کے کونے پر ٹک گئی۔

''کچھ نہیں ماماں۔۔۔ میں تھک گیا ہوں۔''

انہوں نے سر میرے زانو پر رکھ دیا۔

''کیا بہت کھیلے آج''؟ میں نے بال سہلائے۔

''نہیں تو۔۔۔ میں تو آج کھیلا بھی نہیں۔''

''کیوں کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''نہیں ماماں۔۔۔ سونا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے آنکھیں بند کر لیں تو میں نے ان کے جوتے اتار کر ٹانگیں مسہری پر چڑھا دیں اور بتّی گل کر کے دروازہ بند کر دیا۔

گھر کا باہری دروازہ کھلتے بند ہوتے ہوئے اس زور سے چنگھاڑتا تھا کہ ہاتھی بھی

شرمندہ ہو جائے۔ میرے شوہر جب لوٹے تو میں نے سوچا کہ اس آواز سے عاطف جاگ گئے ہوں گے۔

اور باہر آجائیں گے۔ مگر وہ شاید گہری نیند سو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کھانے کے لیے بلانے گئی تو دیکھا کہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے سوچوں میں گم ہیں۔

یہ ایک انہونی سی بات تھی۔ میرا ممتا بھرا دل تڑپ اُٹھا۔

میں نے ہلکی روشنی والا بلب روشن کیا۔ پاس بیٹھ کر نرم نرم ابروؤں پر انگلیاں پھیریں، مکھڑا چوما اور ان کی آنکھوں میں خاموشی کی وجہیں تلاش کرتی مسکرادی تو وہ جواباً ہونٹ کے ایک کونے کو کان کی طرف خم دے کر جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ چہرے پر اداسیوں کے سائے آڑے ترچھے لہرا رہے تھے۔

''چلیے کھانا کھاتے ہیں۔'' میں نے سہارا دے کر اُٹھایا۔

''پاپا آگئے۔۔۔۔؟ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''آپ نے دروازے کی چیخ نہیں سنی۔'' میں نے حیرت سے دریافت کیا کہ اس آواز سے سب سے زیادہ بیزاری کا اظہار عاطف ہی کیا کرتے۔

''آپ نے قبضوں میں تیل ڈلوادیا ہوگا۔''

''نہیں بیٹا۔۔۔۔ پچھلے ہفتے ڈلوادیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آواز جاتی رہے گی۔۔۔اب کل ڈلوادوں گی۔''

وہ ہاتھ منھ دھو کر آئے تو منصور ان کے قریب چلے گئے۔

''جاگ گئے بیٹا آپ۔۔'' انہوں نے ان کے رخساروں پر ہاتھ رکھے تو یہ ان سے لپٹ گئے قد ان کا بھی خاصہ بڑھ گیا تھا مگر منصور چونکہ کافی طویل قامت تھے اس لیے عاطف ان کے پیٹ میں منھ چھپا کر کچھ لمحے چپ رہے پھر سر اور پر اُٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہم سوئے نہیں تھے پاپا، لیٹے تھے۔'' وہ ہونٹوں کو بے بسی سے سکیڑ کر بولے تھے۔

کھانے کے دوران وہ میرے برابر کی نشست پر بیٹھے بار بار سوچوں میں ڈوب جاتے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

منصور سونے کے لیے کمرے میں داخل ہوئے تو عاطف بھی اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ان کے پاس مسہری پر جا لیٹے۔ میں جب کمرے میں آئی تو انہوں نے اپنی نرم سی ٹانگ اپنے پاپا کے پہلو پر چڑھا رکھی تھی اور بے خبر سو رہے تھے۔ منصور آنکھیں بند کیے ان کا سر سہلا رہے تھے۔

''کیا آپ نے کبھی محبت کی ہے؟'' صبح کی چائے کے وقت منصور نے اچانک مجھ سے یہ سوال کیا تو میں سٹپٹا گئی کہ منصور تو شادی سے پہلے کی میری محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

''جی ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔'' میں کھسیانی سی ہو کر بولی تھی۔

''جناب ہم نہیں ۔۔۔ یہ آپ کے صاحبزادے پوچھ رہے تھے کل۔'' انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''جب رات میرے پاس لیٹے تو کافی وقت میرے چہرے کی طرف چپ چاپ دیکھنے کے بعد انہوں نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا تھا کہ پاپا ۔۔۔ آپ نے کسی سے پیار کیا ہے کبھی ۔۔۔ ہم نے جواب دیا کہ آپ سب سے کرتے تو ہیں ہم بہت پیار ۔۔۔ تو بولے کہ نہیں پاپا یہ نہیں ۔۔۔۔ جب آپ میری عمر کے تھے ۔۔۔۔ تب ۔۔۔ تو ہم نے کہا کہ کرتے تھے جینا لولو بریگیڈا سے ۔۔۔ مگر آپ سے کچھ بڑے تھے ہم۔ تو بولے Oh no Papa,Please be serious وہ تو اطالوی اداکارہ تھی۔ میں تو سچ مچ کی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ تو ہم نے کہا اچھا یاد کریں گے۔

اور صبح آپ کو بتا دیں گے۔ اب آپ سو جایئے۔ سکول بھی جانا ہے کل۔ آپ تھکے بھی ہوئے ہیں

تو کہنے لگے کہ میں تھکا نہیں ہوں ۔۔۔ اصل میں ۔۔۔۔۔ مجھے ۔۔۔'' کچھ دیر خاموش ہوئے۔اور پل بھر بعد سو گئے۔ منصور ساری بات بتا چکے تو کچھ سوچنے لگے۔

''عجب سوال ہے یہ۔۔۔اس عمر کے لیے۔۔۔ پتہ نہیں کیوں پوچھ رہے تھے۔'' وہ مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی میں چمچ گھمانے لگے۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' میں چپ چاپ چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔اور پتہ نہیں کیا کیا سوچتی رہی۔

الارم کی آواز سے عاطف جب بیدار ہوا کرتے تو ہمارے کمرے میں آکر بوسوں کے لین دین کے بعد اپنے غسل خانے کی طرف روانہ ہوتے۔ میں اسی خیال میں تھی کہ یاد آیا کہ وہ ہمارے کمرے میں سوئے ہیں۔

اُٹھئے بیٹا۔۔۔ اسکول جانا ہے۔'' میں نے بال سہلائے تو وہ دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئے۔ مگر اگلے ہی پل انہوں نے ایکدم آنکھیں پوری کھول دیں۔ کچھ لمحے میری طرف دیکھا پھر ایک ادھوری سی انگڑائی لی اور اُٹھ بیٹھے۔ میں نے ماتھے کا بوسہ لیا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر دونوں آنکھوں میں باری باری جھانکا۔

''نیند پوری نہیں ہوئی۔۔۔شہد یلے نینوں کی۔''

میں جب بھی شہد رنگ کی جگہ شہد یلا کہتی تو وہ ہنس دیتے۔ مگر اس وقت وہ مسکرائے بھی نہیں۔

''ہوگئی ماماں ۔۔۔'' انہوں نے میرے ہاتھ اپنے چہرے سے لگ کر کے اپنی گردن میں ڈال دیئے اور میرے شانے پر سر رکھ دیا۔

''تیار ہو جائیے نہ۔۔۔بس مس (Miss) ہو جائے گی۔'' میں نے انہیں لپٹا کر کہا۔

کچھ بے دلی سے تیار ہو کر وہ اسکول چلے گئے تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ یہ آخر خاموشی جیسی چیز ہے کیا۔

اسکول سے لوٹ کر وہ دوپہر کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں آ گئے۔

''سوئیے گا نہیں جان؟ مین نے رخسار تھپتپا کر پوچھا۔

''آپ کے پاس سوئیں گے۔۔۔ انہوں نے آہستہ سے کہا اور میرے برابر لیٹ گئے۔ چھت کو تکتے ہوئے پلکیں جھپکتے رہے۔

''ماماں۔۔۔'' انہوں نے پراسراری آواز میں پکارا۔

''آپ کو نیند نہیں آرہی۔۔۔؟ وہ مسلسل چھت کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ کو آرہی ہے بیٹا؟'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ہاں۔۔۔تھوڑی سی۔۔۔ماماں؟''

''جی میری جان!''

''آپ نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟''

''میں نے آپ سے کیا ہے نہ۔۔۔ بہت سا پیار۔۔۔آپ سب کو پیار کرتی ہوں میں۔''

میں نے وہی جواب دیا جو مجھے دینا چاہیے تھا۔

''ہاں وہ۔۔۔وہ تو ہے۔۔۔ میں اس پیار کی بات کر رہا۔۔۔کسی لڑکے سے آپ نے پیار کیا ہے۔''

''ہاں۔۔۔آپ کے پاپا سے۔''

''شادی سے پہلے۔۔۔؟''

''ہاں مگر منگنی ہو جانے کے بعد۔''

''تو تب آپ کتنی بڑی تھیں؟''

یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس کی۔''

''مگر میں تو ابھی Eleven Plus ہی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولے۔

''تو؟'' میں نے دل میں بیدار ہونے والے تجسّس کو آواز میں ظاہر نہ ہونے دیا۔

''آپ کو کسی سے محبت ہو گئی ہے؟''

''نہیں ماماں۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔۔''

''پتہ کیوں نہیں۔۔۔۔ بتائیے نا۔۔۔ہم تو آپ کی ماں ہے نا۔۔۔۔''

''مماں پاپا سے کچھ نہیں چھپاتے۔۔۔ یاد ہے نہ۔''میں نے لہجے میں پیار گھول کر کہا۔

''جی۔۔۔ یاد ہے۔''

''تو بتائیے نا''

''آپ۔۔۔ایک پرومز کیجئے۔'' وہ پلٹ کر میری طرف مڑے۔

''وعدہ۔۔۔''میں نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آپ کسی سے بھی نہیں کہیں گی نا۔''

''نہیں۔۔۔۔''

''جی نہیں۔۔۔۔ بالکل نہیں۔ یہ تو ہم ماں بیٹوں کا سیکریٹ (Secret) ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ماماں آپ کو پتہ ہے۔۔۔ساحل کی ایک کزن بھی تھی پارٹی میں۔''

ان کے چہرے پر مبہم مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بس ایک ہی کزن؟''

''نہیں نہیں۔۔۔۔ تھیں تو اور بھی۔۔۔۔ بہت سے دوست بھی تھے۔۔۔مگر اس کی وہ کزن بہت اچھی تھی۔۔'' وہ اپنے ناخنوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

''اچھا۔۔۔وہ کیسے۔''

''وہ ہم سب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔۔۔ باقی لڑکیاں تو۔۔۔۔

''۔۔۔۔ماماں۔۔۔؟''انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر پکارا۔

''ماماں۔۔۔یہ لڑکیاں اتنی Stupid کیوں ہوتی ہیں؟''

''نہیں تو بیٹا۔ آپ کی باجی کیا بدھو ہیں؟''

''نہیں باجی نہیں ۔۔۔ یہ لڑکیاں ۔۔۔ ایسے ظاہر کرتی ہیں جیسے وہ کوئی VIP ہوں اور ہم سب انہیں کسی بات کے لیے Request کرنے والے ہوں ۔ کسی نے اگر کلاس میں کچھ پوچھ لیا تو Shut up کہ دیتی ہیں ۔۔۔ خواہ مخواہ ہی ۔ جیسے سارے لڑکے بیوقوف ہوں اور بہت برلینیٹ Briliant ہوں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگے۔

''وہ ابھی چھوٹی ہیں نا۔ جب آپ لوگ بڑی جماعتوں میں جائیں گے تو وہ آپ سے Friendly ہو جائیں گی ۔۔

آپ کے ساتھ پڑھیں گی، آپ سے سوال پوچھیں گی ۔۔ جواب بتائیں گی ۔ جیسے باقی لڑکے آپ کے دوست ہیں، ویسے ہی وہ بھی بن جائیں گی۔''

''ہماری ٹیچرس بھی لڑکیوں کی بات کا بھروسہ کرتی ہیں ۔ چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ بولتی ہوں ۔۔ ٹیچرس ان کو آگے کی کرسیوں پر بٹھاتی ہیں ۔ اور ہم کو پیچھے۔''

''وہ بیٹا ۔۔ قد کی وجہ سے، آپ لمبے ہوں گے نا، اس لیے تا کہ سب کو بورڈ نظر آئے۔

''نہیں ماما ۔۔ Sir جب ہوتے ہیں تو سب کو ہائٹ Height کے مطابق بٹھاتے ہیں۔

بس میم (Medam) ہی ہیں جو ۔۔۔''

''یہ تو غلط ہے ۔ میم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے ۔ مگر اس میں لڑکیوں کا کیا قصور ۔۔ آپ کو لڑکیوں کی عزت کرنی چاہئے۔''

''اگر وہ ہمیں Respect دیں گی تو نا؟''

''آپ بھلے ہی Respect ظاہر نہ کریں مگر دل میں ہر ایک کے لیے عزّت رکھیں۔''

''لڑکیاں بہت اچھی بھی ہوتی ہیں بیٹا ۔۔۔ یہ تو تربیت پر منحصر ہے۔''

''ہاں۔۔۔کوئی تو بہت اچھی ہوتی ہے۔جیسے ساحل کی کزن۔''

''آپ کو وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔''

''جی ماماں۔۔۔میں جب سے پارٹی سے آیا ہوں نا۔انہیں کو یاد کرتا ہوں۔۔۔ ان کا ہمارے ساتھ کھیلنا۔۔۔ان کی باتیں۔۔۔ان کا لباس، ان کا Face۔'' وہ اداس سے ہو گئے۔

''وہ بہت سندر ہیں؟''

''او۔۔۔ماماں۔۔۔بہت۔۔۔۔She is a perfect beauty ان کا Face میں ایک بھی چیز Unattractive نہیں ہے۔''

''وہ بھی ساتویں درجے میں پڑھ رہی ہیں؟'' میں نے ان کی باتوں سے پیدا ہونے والی حیرت کو قابو میں رکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''نہیں وہ تو Tenth میں ہیں۔'' انہوں نے کچھ ایسے فخر سے کہا کہ ان کی شہد رنگ آنکھیں چمک اٹھیں اور سارے چہرہ پر کوئی لطف سا جذبہ چھا گیا۔ پھر کچھ پل بعد ہی اپنی اداسی کو واپس اوڑھتے ہوئے بولے۔

''آپ نے پیار کیا ہے ماماں۔۔۔شاید۔۔۔پیار میں یاد آتی رہتی ہے نا۔۔۔ اور نیند بھی نہیں آتی۔۔۔

کھانا کھاتے ہوئے اگر دیدی کی یاد آجاتی ہے تو میری بھوک ایک دم ختم ہو جاتی ہے۔'' وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

''او۔۔۔اچھا۔۔۔دیدی'' میں نے زیر لب کہا۔

اب ساری بات سمجھ میں آئی۔تو میرے شہد رنگ نینوں اولے شہزادے کو دیدی سے عشق ہو گیا ہے۔اس خیال کے آتے ہی میرا جی، دل کھول کر ہنسنے کو چاہ رہا تھا کہ میں سوچنے لگی کہ حالات کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔عاشق صاحب اپنے ساڑھے گیارہ برس کے ننھے سے دل کو انجانے میں دل کا روگ لگا بیٹھے تھے۔اور فرقت کے تمام تر تقاضوں پر

پورے اتر رہے ہیں اوراس سے پیدا شدہ کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرر ہے تھے۔ دل میں اس حسینہ کو دیکھنے کا خیال زور پکڑ نے لگا۔ مگر عاطف کی مسلسل اداسی سے رنجیدہ بھی ہوتی رہی۔

شام کو میں نے منصور کو ساری روداد سنائی تو وہ ہنس دیئے۔ مگر پھر میرے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات دیکھ کر سنجیدہ ہو گئے، اور کچھ سوچنے لگے۔

''اس میں میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بس ایک آدھا دن میں دیدی کو بھول بھال کر نارمل ہو جائیں گے۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہنے لگے۔

''وہ تو ہم سے بھی تیز نکلے۔'' انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تو میں بھی مسکرا دی۔ حالانکہ ہم دونوں اندر سے کچھ کچھ اداس تھے۔

دو دن تو گذر ہی چکے تھے۔ تیسرا اور چوتھا بھی گزر گیا۔

مگر ان کی طبیعت بجھی سی ہی رہی۔ بیٹھے بیٹھے چھوٹے سے لبوں سے طویل آہ نکل جاتی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم جم جاتیں۔

چہرے پر پیلاہٹ چھا گئی تھی۔ میرے دل کے اندر سے ہوک سی اٹھنے لگی تھی۔ شکر ہے عناب اس بارے میں کچھ جانتی نہیں تھیں ورنہ مذاق بن جاتا غریب کا۔ مجھے خیال آتا۔

کبھی کبھی میں یہ مسکرا کر سوچتی ہوں کہ ہفتہ بھر گزر گیا دیدارِ یار کو مگر اس سچّے عاشق کی وارفتگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

عاطف آج کل بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ محبتوں کو رشتوں کے خانوں میں رکھنا وہ کیا جانتے۔ بس انہیں سوائے سوچتے رہنے کے اور کچھ سُجھائی نہ دیتا۔ ادھر کچھ دنوں سے ان کا دوست ساحل بھی بیمار تھا اور اسکول سے مسلسل ناغہ کر رہا تھا۔ عاطف اسے فون پر ہوم ورک وغیرہ سے آگاہ کرتے۔ پھر بھی کتنی چیزیں رہ جاتیں۔

ایک دوپہر کو جب عاطف سوچتے سوچتے گئے تو دروازے کی گھنٹی بجی۔

دروازے میں لگی آتشی آنکھ سے دیکھا تو ایک بڑی سی ناک نظر آئی اور اس کے پیچھے ایک اجنبی لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے دروازے کے کنارے پر لگی زنجیر کو چوکھٹ میں پھنسا کر کھلنے دیا کہ مجھے لڑکی ٹھیک سے دکھائی بھی دے اور بات بھی ہو سکے۔ اور وہ اندر بھی نہ گھس سکے۔ کہ کون جانے بڑے شہر کی ایک لمبی گرم دو پہر میں کون لٹیرا کس روپ میں آ جائے۔ لڑکی سر سے پاؤں تک نظر آئی تو اچھے گھر کی معلوم ہوئی۔

''ہائے۔۔۔۔ میں ساحل کی دیدی ہوں۔''

تو یہ ہیں دیدی صاحبہ۔ میں نے مسکرا کر دروازہ کھول دیا۔

''میں معافی چاہتی ہوں۔ بغیر فون کیے آ گئی۔ بس کچھ جلدی میں بھی تھی اور ادھر سے میرا ٹیوشن کا جانے کا راستہ بھی تھا۔ پھر Sure بھی نہ تھی کہ وقت ملے گا کہ نہیں۔ میں نے ساحل سے وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ مگر کوشش تھی کہ اس کا کام نقل کر لاؤں۔''

وہ سراپا مسکراہٹ بنی کچھ شرمندہ سی ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''میں نے کچھ غلط کیا؟'' اس نے مجھے بغور اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''تم نے بہت اچھا کیا۔ آؤ اندر آؤ۔'' میں اس کا شانہ تھام کر مسکرائی۔

وہ ایک دھلی دھلی سی اسمارٹ لڑکی تھی۔ دبلی، دیا سلائی سی، سانولی رنگت۔ آنکھیں گہری کالی۔ بال لمبے لمبے جنہیں اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا اور وہ اس کے خاکی رنگ کے لمبے سے ٹاپ کے نچلے کنارے تک آتے تھے۔ اس کے ساتھ اس نے سیاہ ڈینم کی جینز پہن رکھی تھی۔ پیروں میں بغیر ایڑھی کے نوکیلی جوتے تھے۔ جب تک اس نے بات نہیں کی تھی مجھے وہ ایک عام سی نارمل لڑکی نظر آئی مگر جب وہ مسکراتے ہوئے، سوالیہ سی منتظر سی نظروں سے دیکھتی ہوئی بات کرنے لگی تو اس کی آواز کی کھنک اور مسکراہٹ سے پھول کی طرح کھل جانے والے چہرے نے اس کے پروقار رنگ کے لباس کے ساتھ میل کھا کر اسے ملکوتی حسن بخش دیا۔ اور اس دبلے پتلے خاموش سراپے کے ساتھ اس کی کالی کالی آنکھوں نے ایک ذہین قسم کا تال میل پیدا کر دیا۔ لیکن اگر چہرے کے نقوش کو جدا جدا دیکھا

جاتا تو کسی میں کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ چہرہ لمبا تھا اور آنکھیں خاصی چھوٹی کہ ٹھوڑی اور آنکھوں کے درمیان اچھا خاصہ فاصلہ ہو جاتا۔ ناک پھیلی ہوئی مگر نوکیلی تھی ہونٹ بہت پتلے۔ مگر دانت سچّے موتیں کے دانے جیسے نہایت متناسب قطار میں جڑے ہوئے تھے۔

عاطف میاں کو کیا بات بھا گئی تھی خدا جانے۔۔۔۔۔

بہر حال مصلحتاً عاطف کو بیدار کیے بغیر میں نے ان کی کاپیوں سے کچھ چیزیں نقل کروادیں۔ وہ اس کے کمرے میں گئی اور نیند میں ان کا ماتھا چوم کر ایک چاکلیٹ انکے سر ہانے کے پاس رکھ دی۔

عاطف جاگے تو ہم نے بتایا کہ دیدی آئی تھیں اور اپنے بھیا کے لیے چاکلیٹ رکھ گئی ہیں۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ چہرے پر کئی رنگ آتے جاتے رہے۔ کچھ دیر خاموش رہے کے بعد انہوں نے سر اُٹھا کر ایک زخمی سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

''دیدی آئیں اور آپ نے۔۔۔ مجھے جگایا تک نہیں۔'' ان کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

''وہ چلی بھی گئیں۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔'' وہ بلک بلک کر رو پڑے۔

میرے دل میں دُکھ کی لہر سی اُٹھی۔ ''انہوں نے بھی مجھے نہیں جگایا۔۔۔۔ انہیں مجھ سے بات نہیں کرتی تھی؟'' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگے۔

میں بے چین ہو اُٹھی۔

''کون سی بات بیٹا۔۔۔'' میں نے نہایت نرمی سے کہا۔

''وہ تو ساحل کا ہوم ورک لینے آئیں تھیں۔ آپ کی نیند خراب کیے بغیر ہی انہوں نے آپ کے لیے چاکلیٹ رکھا اور چلی گئیں۔

میں نے سینے سے لگا کر نرم نرم گالوں پر ڈھلکتے موٹے موٹے آنسوؤں کو انگلی سے صاف کیا۔

وہ سر جھکا کر چاکلیٹ کو دیکھنے لگے۔ پھر اٹھ کر اسے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا۔

حالانکہ یہ ان کی پسندیدہ چاکلیٹس میں سے ایک تھا۔ اور نیند سے بیدار ہونے پر انہیں بھوک بھی لگی ہوگی۔

میرے اندر بے چارگی سی اتر آئی۔

اس طرح کوئی دس روز گزر گئے۔ اب منصور بھی پریشان ہو گئے تھے کہ ان کی مسکراہٹیں کس طرح واپس لائی جائیں۔

دو روز بعد دسہرے کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ ہم پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ منصور کا خیال تھا کہ وہاں عاطف کو نارمل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

دو ایک دن عاطف اِدھر اُدھر ٹہلا کیے۔ تیسرے دن ہمارے بغل والے سویٹ میں ایک اور کنبہ رہنے آیا۔ ان کے ہاں بھی ایک دیدی تھیں۔ کچھ ویسی ہی دبلی پتلی مگر عمر میں بڑی تھیں۔ بی اے کی طالبہ۔ ہوٹل کے باقی کمرے تقریباً خالی تھے اس لیے عاطف اور وہ کچھ کچھ دوست بن گئے۔ دیدی بھی ان کے بھولے مکھ پر کچھ ایسی ریجھ گئیں کہ انہیں اپنے ایک اہم راز سے واقف کر دیا۔ اور انہوں نے بھی رازداری کا حلف ایسا نبھایا کہ صرف مجھے بتا دیا کہ ان کی دیدی کا بوائے فرینڈ آنے والا ہے۔

دیدی مال (Mall Road) پر بوائے فرینڈ سے ملنے گئیں تو یہ بھی ہمراہ تھے۔ لوٹے تو خاصے پرسکون تھے اور بیچ بیچ میں کچھ سوچ بھی رہے تھے۔ مگر یہ سوچ ویسی اداسی لیے ہوئے نہیں تھی جو مجھے اُداس کر دیتی۔

دوسری صبح دیدی کو جانا تھا۔ بوائے فرینڈ دیدی کے ہاتھ عاطف کے لیے ایک خوبصورت سی کتاب بطور تحفہ بھیجی۔

اگلے روز ہم بھی چلے آئے۔ عاطف نے گھر پہنچ کر اپنا سامان خود ان پیک (Unpack) کیا۔ کمرہ ٹھیک کیا اور میرے پاس آ گئے۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ میرا رُخ گیس کے چولہے کی طرف تھا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے باوزو میرے گرد ڈال دیئے اور سر میری پیٹھ سے ٹکا دیا۔

''ماماں'' وہ دھیرے سے بولے۔

''جی میرے بچے۔''

''کیا ساحل کی دیدی۔۔۔'' وہ سنجیدہ سے لہجے میں کچھ کہتے کہتے رکے۔۔۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''ساحل کی دیدی کا بھی کوئی بوائے فرینڈ ہوگا۔'' انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔۔۔ہوسکتا ہے۔۔۔وہ بڑی ہیں نا۔''

''ہوٹل والی دیدی سے تو تین چار سال چھوٹی ہیں نہ۔''

''مگر آپ سے بھی تین چار سال بڑی ہیں نا۔''

''ہاں۔۔۔وہ تو ہے۔''

میں ان کی طرف پلٹی۔۔۔کچھ دو تین پل اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف گئے۔

لوٹے تو ان کے ہاتھ میں چاکلیٹ تھا جو انہوں نے چھٹیوں سے پہلے اپنی لکھنے کی میز کی دراز میں سنبھال کر رکھا تھا۔ آدھا توڑ کر میرے منھ میں ڈال دیا اور باقی خود کھانے لگے۔

''شام کا اخبار آیا ہوگا نا۔'' انہوں نے کہا اور میرا جواب سننے سے پہلے ہی اخبار کی تلاش میں اچھلتے کودتے باہر بالکنی کی طرف گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

آدھے چاند کا عکس

ڈاکٹر فریدہ تبسم

جدید افسانہ اپنے عروج کی طرف گامزن ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں جدید رجحانات کی شعوری کاوش نظر آتی ہے۔ نئی نسل میں انور قمر، انور سجاد، نیر مسعود، طارق چھتاری، سلام بن رزاق، غضنفر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جہاں مرد افسانہ نگار نے افسانہ میں روایت سے انحراف کیا، وہیں خاتون افسانہ نگاروں نے افسانوں میں نئے نئے تجربات کئے نئے انداز اسلوب میں افسانے لکھے ہیں۔ جدید افسانہ ارضیت اور سماجی مسائل کو بیان کرتا ہے اور خارجی حالات سے انسان کے باطن میں جو کیفیت ہوتی ہے اس کو محسوس کر کے علامتی استعارتی یا تمثیلی پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ اس طرح کہانی اور کردار کے ذریعے اپنے فکر وخیال کو اعتبار بخشا ہے خواتین افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر کے بعد ذکیہ مشہدی غزال ضیغم، ترنم ریاض، سرفہرست شامل ہے۔

ترنم ریاض کشمیر کی فکشن نگار خاتون ہیں جن کے افسانے اور ناول عالمی سطح پر ستائشی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان میں انہوں نے موضوعاتی سطح پر اکثر و بیشتر تانیثی تناظر میں عورت کی نفسیاتی کیفیت اور اس کے استحصال کو موضوع بحث بنا کر لکھا ہے۔ دوسری طرف سماج کی برائیوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ اپنے علاقے کشمیر کی داستان الم بیان کی ہے جہاں ظلم واستحصال کی انتہا کو مرکوز قلم زد کیا ہے۔

ترنم کا اسلوب اس قدر دلکش اور رواں ہے کہ قاری کے دل میں اتر کر احساس فکر پیدا کرتا ہے۔قاری اپنے آپ کو اس کردار میں محسوس کرتا ہے۔ بچہ ہو کہ جوان ان کے کردار کی نفسیاتی کیفیت کو فنی ساخت کے ذریعے معنی بندی کرتی ہیں۔

ترنم ریاض عصر حاضر کے افسانوی منظر نامہ میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔آزاد اظہار کا استعمال کرتے ہوئے سماج کی برائیوں پر کمال ہنر مندی سے روشنی ڈالتی ہیں۔

ان کے مشہور افسانوں میں متاع گمشدہ، شہر، ناخدا، باپ، آدھے چاند کا عکس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک افسانہ ''ادھے چاند کا عکس'' کی بات ہے اس افسانہ میں جو کہانی بیان کی گئی وہ ایک گیارہ سالہ معصوم بچہ کی نفسیاتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے احساس فکر کو ممتا کے آنچل کے لمس میں دبا دبا سا پیار و محبت کی ردا میں بچہ کی نفسیات تک پہنچنے کی سعی کی گئی ہے کہ دور حاضر میں زمانہ کس قدر تیزی سے بدل رہا ہے۔ماں باپ کو اپنی اولاد کا دوست بن کر ان کے ذہن تک رسائی کرنا ہوگا۔۔ یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

> ''کچھ دیر بعد کھانے کے لئے بلانے گئی تو دیکھا اندھیرے میں آنکھیں کھولے سوچوں میں گم ہیں۔۔۔۔۔۔یہ ایک انہونی سی بات تھی میرا ممتا بھرا دل تڑپ اٹھا میں نے ہلکی روشنی والا بلب روشن کیا پاس بیٹھ کر نرم نرم ابرووں پر انگلیاں پھیریں۔مکھڑا چوما اور ان کی آنکھوں میں خاموشی کی وجہ تلاش کرتی مسکراتی تو وہ جواباً ہونٹ کے ایک کونے کو کان کی طرف خم دے کر جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ چہرے پر اداسیوں کے سایے آڑے ترچھے لہرا رہے تھے۔''

جزئیات نگاری میں جو فضا بندی کی گئی ہے وہ تشکیک آمیز حیرت انگیز کیفیت سامنے آتی ہے فکر و خیال کے ساتھ ساتھ واقعات کے تسلسل کے ذریعہ تجسس کو برقرار رکھا گیا ہے۔

بیٹے کا ٹیلینٹ تو تھا ہی مگر لڑکی کی خوبصورتی پر جب گفتگو ہوئی تو بچہ کی ذہن میں خوبصورتی، کن معنوں میں اہمیت رکھتی ہے پتہ چلا۔ ماں محو حیرت سے اس عمر میں بچہ کی سوچ دیکھ کر حیران ہے۔ مگر جب بچہ دوست کی برتھ ڈے پارٹی سے آکر سہما سہما خاموش رہتا ہے تو ماں متفکر ہو جاتی ہے۔ اس کم سنی میں آخر بچہ کس مرض کا شکار ہو گیا ماں کی ممتا تڑپ اٹھتی ہے بالآخر وہ وجہ تلاش کر لیتی ہے۔

یہاں افسانہ نگار نے کمال ہنر مندی سے ڈرامائی انداز میں بچہ کی نفسیاتی کشمکش جو اعصاب پر حاوی ہے اور انہیں آشکار کر معاشرہ کے بچوں کی نفسیات اور ان کی سوچ کے دائرہ کو اجاگر کیا ہے۔ اب بچہ۔۔۔ بچہ نہیں کم سنی میں عشق کے مرض میں مبتلا ہے۔۔ یہ جملے ماں جب پوچھتی ہے۔۔

''وہ بہت سندر ہیں؟''

جی ماماں۔۔۔ بہت۔۔۔

she is perfect beauty

ان کے فیس میں ایک بھی چیز un attractive نہیں ہے۔

وہ بھی ساتویں درجہ میں پڑھ رہی ہیں۔۔ میں ان باتوں سے پیدا ہونے والی حیرت کو قابو رکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔۔

''نہیں وہ تو ٹینتھ میں ہیں'' انہوں نے کچھ ایسے فخر سے کہا کہ ان کی شہد رنگ آنکھیں چمک اٹھیں ایک لطیف سا جذبہ چھا گیا۔۔۔

اس افسانہ کے درون متن فنی ساخت پر معنی بندی میں قلبی واردات تخیلی تجربہ سے گزر کر ذہنی مسرت کا وافر سامان مہیا کر رہی ہیں۔

افسانہ کی تخیلی فضا میں تخلیقی ہنر مندی سے بظاہر سادہ سی کہانی کا گمان ہوتا ہے مگر اس کی باطنی کیفیت کو محسوس کریں تو موضوع واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ'' آدھے چاند کا عکس''، یعنی کم عمری میں عشق۔۔۔

کم سنی میں عشق کے دوار پر کھڑے ہوکر مشاہداتی تجربہ سے دستک دینا یہاں کردار کو ہنرمندی کے ساتھ مرکوزنظر بنا کر قاری کو متوجہ کیا گیا ہے۔

جو بچے جینیس ہوتے ہیں اور دوررس نگاہ رکھتے ہیں یہ بچے کسی پریشانی کا شکار ہوجاتے ہیں تو آسانی سے اس دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے۔یہاں بھی بچہ عاطف زندگی کے نئے تجربہ کو وقت سے پہلے محسوس کرتا ہے اور نفسیاتی کشمکش میں الجھن کا شکار ہوجاتا ہے۔اور خاموشی اختیار کرتا ہے۔

افسانہ نگار بہت خوبی کے ساتھ معصوم دل کے جذبات واحساسات کو عشق کی ہلکی آنچ پر سنہرے خواب کی بہترین عکاسی کی ہے۔عمر کا فرق جسے وہ دیدی کہتا اس کے پیار نے اس عشق نے ایک درس دیا۔

''دیدی آئیں آپ نے مجھے جگایا نہیں۔۔''ان کی آنکھیں لبالب بھرائیں۔

''وہ چلی گئیں۔۔اور۔۔۔اور۔۔''وہ بلک بلک کر رو پڑے

''میرے دل میں دکھ کی لہر سی اٹھی۔۔انہوں نے بھی مجھے نہیں جگایا۔۔انہیں مجھ سے بات کرنی نہیں تھی۔۔وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگے''۔۔۔

زندگی میں کبھی کچھ واقعات انسان کو بہت کچھ سیکھا جاتے ہیں عشق کے معاملے میں ہر کسی کی بات غلط نظر آتی ہے۔جب تک کہ خود کا تجربہ سے حاصل کیا ہوا درس نہ ہو۔۔

چند دنوں بعد ہوٹل کے دوسرے کمرے میں دوسری دیدی کی آمد پھر دوستی اور رازداری میں پتہ چلا کہ دیدی کا بوائے فرینڈ ہے۔وہ ان سے ملنے آنے والا ہے۔

تب احساس جگا کہ یہ جسے دیدی کہہ کر عشق اول میں مبتلا تھے ان کا بھی بوائے فرینڈ ہوگا۔۔یہ گفتگو دیکھئے گا۔

''کیا ساحل کی دیدی کا بھی کوئی بوائے فرینڈ ہوگا۔انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔۔

ہاں بیٹا ہوسکتا ہے وہ بڑی ہے نا

ہوٹل والی دیدی سے تین چار سال چھوٹی ہے نہ۔۔؟

''مگر آپ سے بھی تین چار سال بڑی ہے نا۔۔''

''ہاں وہ تو ہے۔۔''

میں ان کی طرف پلٹی وہ دو تین پل ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

''میں ابھی آتا ہوں''۔۔وہ اپنے کمرے کی طرف گئے۔

''لوٹے تو ان کے ہاتھ میں چاکلیٹ تھا۔ جو انہوں نے چھٹیوں سے پہلے اپنے لکھنے کی میز کی دراز میں سنبھال کر رکھی تھی۔ آدھا توڑ کر میرے منہ میں ڈال دیا اور آدھا خود کھانے لگے''

ترنم ریاض نے اس افسانہ کے ذریعے بچہ کی نفسیاتی کیفیت کے پس پردہ معاشرہ کو یہ پیغام دیا ہے کہ بچہ کی اس عمر کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ محبت اور دوستی کا برتاو رکھ کر اس کے مسائل کا حل کرنا چاہیئے۔ تاکہ بچہ غلط راہ سے بچا رہے غلط قدم سے پہلے اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لے۔ یہاں تہذیبی دائرے میں تربیت کے ذریعے رہنمائی کی گئی ہے۔

دور حاضر میں انٹرنیٹ کی تیزی سے ترقی کرتی دنیا میں بچے فکر نو آزاد خیالی کے قائل ہیں۔ جہاں ماں باپ نگراں کار بن کر ان کی ہر حرکت پر خاموشی سے نظر رکھ کر دوستی کے ساتھ خوش اسلوبی سے ان کے مسائل کا حل تلاش کریں۔

اس افسانہ کا پہلا پیرا گراف

''پھول سا چہرہ اترا دیکھ کر میرا پر سکون دل دھک سے رہ گیا میں انہیں ہمیشہ کی طرح خوش وخرم کھلا کھلا دیکھنا تصور کر رہی تھی۔ پھر یہ پتھر سی خاموشی چہ مہ دارود۔۔۔''

یہاں افسانہ نگار نے تجسس کو خوب پیدا کیا کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے کر بچہ کی کہانی کی طرف ملتفت کرتے ہیں۔

سطر در سطر جزئی تفصلات نے فطری حسن پیدا کیا یہ کہانی حقیقت سے قریب سبک روی کے ساتھ قاری کے دل پر اثر کرتی ہے بچہ کی سوچ کے دائرے کو تخلیق میں تحلیل کر کے معنی خیز بناتی ہے۔ بچہ کی ذہنی الجھن اور اس کے انجام کے تجسس میں کہانی فطری انداز میں آگے بڑھتی ہے اور اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہے۔

اس افسانہ میں زبان و بیان بہت عمدہ ہے لیکن کردار کے اعتبار سے جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ کسی شاہی خاندان کے چشم و چراغ کا گمان ہوتا ہے۔اور بچہ کی معصومیت سے زیادہ اس کی سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔کم سن بچے کی معصومیت کہیں کھو گئی ہے۔مگر مجموعی طور پر کہانی دلچسپ اور کامیاب ہے۔

ماں صاحب

جانماز پر بیٹھی ماں صاحب نے سر اوپر اٹھا کر خرم کی جانب دیکھا تو روشنی سے ماں صاحب کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

''خدا اس کی عمر دراز کرے بیٹا۔ ابھی معصوم بچہ ہے۔۔ اگلے برس چلا جائے گا۔۔عمر پڑی ہے اس کی۔۔۔میں۔۔۔میں کتنے دن اور زندہ رہ لوں گی۔''

انہوں نے ادھ مندی آنکھیں میچ کر سر جھکا لیا۔ مگر ان کے کان خرم کی آواز کے منتظر تھے۔

ان کے ماتھے کے قریب نظر آنے والے بال سر پر اوڑھی چادر سے بھی سپید نظر آرہے تھے۔

تسبیح پھیرنے کی رفتار کے ساتھ آڑی ترچھی لکیروں والی ٹھوڑی اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ چھوٹی سی جانماز پر بیٹھی ماں صاحب سکڑتے سکڑتے اتنی ہو گئیں تھیں کہ اگر جانماز موجودہ سائز سے نصف کردی جائے، جب بھی وہ اس پر بآسانی نماز ادا کر سکیں۔

ماں صاحب کب اتنی نحیف ہو گئیں پتہ ہی نہ چلا۔ خرم کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ پاس سے تیز چل کر اندر جانے کی کوشش میں ہانپتی شگوفہ پر نظر پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی بھری بھری انگلیوں سے کنپٹیاں ایسے تھام رکھی تھیں جیسے ہاتھ ہٹانے سے سر کے زمین پر گر جانے کا اندیشہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا شگوفہ کا بھاری بدن رفتار کے

ساتھ داہنے بائیں جھکتا تھا۔ کمر کے معمولی طور پر سے نمایاں خم کو چھوڑ کر سارے جسم پر چربی نے قبضہ جما رکھا تھا۔

"ہے نا بیٹا۔۔ میں کتنے دن تک رہوں گی اب۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔؟

خرم نے نظریں اندر جاتی ہوئی شگفتہ سے واپس لا کر ماں صاحب کی طرف موڑیں۔ ماں صاحب دوبارہ گردن اوپر کئے آنکھیں جھپک جھپک کر بیٹے پر پتلیاں مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آنکھ کے آپریشن کے بعد ایک آنکھ کی پتلی کسی شے پر زیادہ دیر مرکوز کرتے وقت اس آنکھ میں بھینگا پن آ جاتا تھا۔ تسبیح فاطمہ کا ورد کر رہی ماں صاحب کی زبان ایک ردھم سے تالو سے لگتی تھی اور انگلیاں تسبیح کے دانوں پر تیزی سے چل رہی تھیں۔

بسم اللہ۔ خرم نے دل میں دہرایا تو عجب حسرت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔

"بسم اللہ۔۔"

زاہدہ نے بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھوں کو مزید پھیلا کر کہا اور لام کی آواز نکالتے وقت لاجوردی سے ہونٹوں والا دہانہ وا کر کے تالو سے جا ملتی زبان کا لام کہنے والا عمل سمجھانے کے لیے چار سالہ خیرو کے گول گول چہرے کے عین سامنے اپنا چہرہ لے جانے کیلئے فرش پر بیٹھ گئی۔

"ایسے ہی کہا تھا۔۔ ہم نے بھی۔۔"

خیرو نے روٹھی روٹھی آواز میں کہا اور ہاتھ میں تھاما چمچ ہفت رنگ پھولوں والی تام چینی کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

"نہیں کھائیں گے۔۔ ہم۔۔"

اس نے زاہدہ کی زبان کی طرف دیکھا جو لام کہہ کر ابھی ابھی تالو سے الگ ہوئی تھی۔

"کیوں نہیں کھائیں گے۔۔"

زاہدہ نے کچھ اونچی آواز میں کہا اور ہاتھوں میں تھامی خیرو کی دونوں کلائیاں

جلدی سے چھوڑ دیں۔

ایسے میں اس کی چوڑیاں چھن سے بجیں تو خیرو اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''اس لئے کہ آپ نے زور سے پکڑے تھے۔۔ ہاتھ ہمارے۔۔''

اس نے دھیرے سے کہا پھر زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف موڑا جہاں سے دسترخوان پر چنی نعمتیں نظر آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا، اور خاص کر باریک سفید چینی کی قاب جس کے پار سے دسترخوان کے سرخ پھول تک نظر آتے تھے اور جس میں زاہدہ نے اس کی پسند کی ضیافت یعنی نرم نرم آلو کے بھورے بھورے قتلے پروس رکھے تھے۔

تام چینی کی رکابی اپنی طرف سرکاتے ہوئے زاہدہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہم کھلائیں گے اپنے بچے کو۔۔ مگر پھر بچے کیسے سیکھیں گے اگر سمجھایا نہ جائے۔۔ آپ لام پر تشدید بھول جاتے ہیں نا۔۔''

زاہدہ نے اسے اپنے زانو پر بٹھایا۔

''دھیرے سے ہاتھ پکڑ کر بھی تو سمجھایا جا سکتا تھا نا۔۔''

خیرو زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں زاہدہ ہی کی طرح بار بار پلکیں جھپک کر بولا کہ اب اور روٹھے رہنا قتلوں کے ذائقہ کو ترستی زبان کیلئے ممکن نہ تھا۔ وہ تتلاتا نہیں تھا اور اس کی زبان بھی صاف تھی۔ زاہدہ کو ہنسی آئی تھی مگر وہ مزید ذرا گہرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''اوہ۔۔ اس کیلئے ہم معافی مانگتے ہیں۔۔''

زاہدہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو خیرو نے دیکھا کہ کمرے کی چھت کے درمیان لٹک رہے فانوس سے ملتے جلتے جھمکوں کے ساتھ بندھے بہت سے چھوٹے چھوٹے سرخ موتی (جو ہلکے ہلکے جھولا سا جھولا کرتے تھے) زور زور سے ہلنے لگے تھے۔ زاہدہ نے کانوں سے ہاتھ ہٹائے تو ننھے ننھے سرخ موتیوں سے نظریں ہٹا کر خیرو نے رکابی کی طرف دیکھتے

ہوئے منہ بڑا سا کھول دیا۔ موتی خرگوش کی آنکھ کی طرح چمک رہے تھے مگر خوگوش کی آنکھ سے بہت چھوٹے تھے۔ اس نے ایک اور سیکنڈ کیلیئے زاہدہ کے کانوں کی طرف نظر ڈالی اور پھر رکابی کی جانب دیکھنے لگا۔ زاہدہ آلو کو کاٹے میں پروئے پھونک مار کر ٹھنڈا کر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں قتلہ خیرو کے منہ میں آنے والا تھا۔

''اب ہمارا بچہ جلدی جلدی کھائے گا۔۔ پھر ابو کے ساتھ تھوڑا سا کھانا بھی کھاتے ہیں نا اچھے بچے۔۔''

زاہدہ نے اس کے گال پر ایک بوسہ ثبت کیا۔

''جی۔۔''

آلو چباتے ہوئے وہ سر ہلا ہلا کر جھومتے ہوئے بولا تھا۔

جب تک خیرو کے ہاتھ پاؤں تھوڑے لمبے ہوئے تھے، وہ زاہدہ کے ہی ہاتھ سے آلو کے قتلے کھاتا تھا کہ اوپر سے ٹھنڈا نظر آنے والا گستاخ قتلہ منہ کے اندر جاتے ہی اس کی زبان جلا دیتا۔ مگر پھر اپنے ہی ہاتھ سے کھانے سے بھی ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا اور وہ دہانہ وا کر کے زور زور سے سانس اندر باہر کر کے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا تو زاہدہ جانے کہاں سے پانی لئے آ پہنچتی۔

انہوں نے کیسے سانس کی آواز سن لی تھی اتنی دور سے۔ خیرو سوچ کے رہ جاتا۔

''اگر ہم گھوم گھوم کر کھائیں کے تو پانی ساتھ کیسے رہے گا۔۔''

وہ جب بھی سمجھانے کے ہی انداز میں کہا کرتی۔

خیرو نے اپنے ساتھ زاہدہ کو بھی بڑا ہوتے دیکھا تھا۔ مگر جب اس کا قد اور لمبا ہوا تو اس کی دونوں چچیاں موٹی ہوگئی تھیں اور ان کے اچھے اچھے کپڑے ان کی کمر میں پھنس جاتے تھے اور کبھی کبھی وہ گاؤ تکیے سی لگتیں۔ مگر زاہدہ پہلے کی ہی طرح تھی۔ مشن سکول کی پیرنٹ ٹیچر میٹنگ میں جب بچے کہتے کہ خیرو کی مدر بہت کیوٹ ہیں تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ خیرو نے زاہدہ کو ہمیشہ بچوں کی ہی طرح پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا لیتے دیکھا تھا۔ گھر کے

لوگ کھانے پینے کے خاصے شوقین تھے۔ خیرو کے ابو بھی دیر تک کھانے کی میز پر نظر آیا کرتے۔

زاہدہ پانچ نمازوں کے علاوہ بھی کچھ اور نمازیں پڑھا کرتی اور رمضان کے علاوہ بھی کئی روزے رکھا کرتی۔ گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ چادریں کاڑھنے سے لے کر ملازمین کے ساتھ مل کر باغیچے کے حوض صاف کرنے تک۔ کچن گارڈن میں پھول سبزیاں اگانے تک، اور زاہدہ کو پودوں میں پانی کھاد ڈالنے اور کھانا بنانے جیسے کام کرتے دیکھ خیرو خیر سے بڑا ہو گیا تھا۔

یہ بیسویں صدی کے وسط کے آس پاس کے دن تھے۔ لوگ کچھ سرحد پار ہجرت کر گئے تھے۔ بعض اپنی زمینوں سے لگے رہے۔ جاگیریں ضبط ہونے لگیں تو محنت کش لوگ سر اٹھا کر جینا سیکھنے لگے۔ بدلتی اقدار سے جب استحصال شدہ لوگوں نے آرام طلبوں کو جی کھول کر مذاق کا نشانہ بنایا تو زاہدہ اس کی شکار نہ ہوئی کہ اس کی ملنسار طبیعت ہر دل عزیز تھی۔ زمینوں کو مستقل قسم کا سرمایہ سمجھنے والے گھر کے حاکموں نے صرف پیسہ جمع کیا تھا۔ مستقبل کیلئے کسی قسم کی سرمایہ کاری کر کے مالی حالات کو مضبوط نہیں کیا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ جمع شدہ پیسہ بھی ختم ہوتا گیا۔

دونوں دیور منقولہ جائیداد کا بڑا حصہ لے کر ہجرت کر گئے۔ ان کی والدہ ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے پاس رہیں۔ اور ان کا خیرو بھی دوستانہ رشتہ تھا۔ زاہدہ کے شوہر کا انہی دنوں انتقال ہو گیا۔ پھر والدہ بھی زیادہ دن تک زندہ نہیں رہیں۔

مگر گھر کا ظاہری رکھ رکھاؤ ویسے ہی قائم رہا۔ خیرو کی تعلیم بلکہ کچھ اور اہتمام سے جاری رہی۔ دبلی پتلی ناخواندہ ماں کے کام کی صلاحیت اور مستقبل کے مشوروں پر خیرو کی عقل حیران رہ جایا کرتی۔

اپنے ساتھ اس نے ماں کو بھی بدلتے دیکھا تھا۔ جب چھوٹا تھا تو ماں کے ہاتھوں میں بہت سی چوڑیاں ہوا کرتیں۔ لباس کے رنگوں جیسے آویزے اور کنگن۔ ماتھے کے اطراف اس کے بال لہراتے بہت اچھے لگتے۔ جب ماں اسے گود میں لیا کرتی تھی تو اس کے کندھے

کے پاس سے چنبیلی کے پھولوں کی سی خوشبو آتی جس کی پھلواری باغیچے کے پیچھے والے کونے میں جھولے کے قریب کی دیوار سے لگی رہتی۔ خیر و جب دسویں درجے میں تھا تو ماں نے چوڑیاں بندے پہننا چھوڑ دیے تھے۔ صرف کلائی میں گھڑی تھی اور گلے میں چھوٹے موتیوں کی بڑی مالا۔ وقت سے پہلے ہی ماتھے کے اطراف بال خاصے سفید ہو چلے تھے سفید موتیوں کی مالا کے ساتھ خوب جچتے تھے۔ خدا حافظ کہتے وقت ماں اس کے ماتھے کا بوسہ لیتیں تو ان کے پاس سے وہی گل یاسمین کی مہک آیا کرتی۔

ماں صاحب جب اور بڑی ہوگئیں اور خرم بھی بڑا ہو کر اور بڑا افسر بن گیا تو ماں نے اس کیلئے اسی کی طرح پڑھی لکھی اور ہری ہری آنکھوں والی دلہن ڈھونڈ لی جو خود بھی بڑی افسر تھی۔

ماں صاحب نے گھر سنبھالے رکھا اور دلہن کی زچگی بھی ماں کی ہی طرح کر کے اسے دفتر کیلئے چاک و چوبند کر دیا۔ ماہم کی دیکھ بھال خود کرتی رہیں اور پھر کوئی تین برس بعد قیصر کی بھی۔ ماں صاحب نے بیٹے کے بچوں کی بھی اسی انداز سے عمدہ پرورش کی گو کہ وہ اب پہلے کی نسبت کمزور ہوگئی تھیں۔ خاندان بھر میں اور خاندان سے باہر بھی ماں صاحب کے ایسا احترام اور کسی کو نصیب نہ تھا۔

ماہم پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہوئی تو اسے وداع کر دیا گیا۔ جب ہی پھر ماں صاحب کو ذرا دم لینے کی فرصت ملتی محسوس ہوئی۔ اور پھر انہوں نے حج کو جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خرم بخوشی تیار ہو گیا۔

"تمہیں بھی چلنا ہوگا میرے ساتھ بیٹے۔۔"

ماں صاحب مسکرا دیں۔

"کوئی محرم چاہیے نا۔۔اور پھر تمہیں بھی تو۔۔"

"جی ماں صاحب۔۔میری بھی شدید چاہت ہے۔۔انشا اللہ۔۔"

قیصر کی پڑھائی کا معاملہ نہ ہوتا تو شگوفہ کو بھی لے چلتے۔

خرم نے پراٹھے پر بالائی لگاتی ہوئی شگوفہ کی طرف دیکھا۔

''آپ کا بجٹ ہے اتنا۔۔؟''

شگوفہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''ہاں۔۔ کھینچ کھانچ کے۔۔ اگر بلاوا ہوا تو۔۔''

''اتنے خرچے کے بعد بھی۔۔ سب بڑی بڑی رقوم تو نکال لیں ہم نے۔۔''

اچھا۔۔؟''

ماں صاحب نے موٹے چشمے کے پیچھے سے ایک نظر سب کو دیکھا اور ابلی ہوئی لوکی پر چھڑکی گئی دھنئے کی پتیوں کی خوشبو سے محفوظ ہو کر مسکرا دیں اور نمک دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خرم نے نمک ان کی طرف سرکایا۔

''بس ذرا سا۔ ضرورت نہیں ہوتی اتنے نمک کی انسان کو۔۔''

''یہ بات ذرا انہیں بھی تو سمجھائیے نا۔۔''

خرم نے شگوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور مسکرایا۔

''شگوفہ کو۔۔؟''

ماں صاحب بھی مسکرائیں۔

''کہاں کا شگوفہ ماں صاحب۔۔ یہ تو جانے کب کی پھول ہوگئیں اور وہ بھی سورج مکھی کا۔۔ وہ اس لئے کہ اس سے بڑا کوئی اور پھول نہیں ہوا کرتا غالباً۔۔''

''قیصر قہقہہ لگا کر ہنسا۔''

''ہوتا ہے پاپا۔۔ گوبھی کا۔۔''

اس نے کہا تو ماں نے اسے مصنوعی غصے سے دیکھا۔

''مام۔۔ نظر لگا رہے ہیں ڈیڈ آپ کے ڈنر کو۔۔''

شگوفہ بھی مسکرائی۔

''لگا نے دو جی۔۔ ہم پھر بھی وہی کھائیں گے جو جی چاہے گا۔ اصل میں خود ان

کا جی للچا رہا ہے۔۔ماں صاحب کے ڈر سے نہیں کھا رہے۔۔"

"مجھے چشمے کے پیچھے سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتا۔۔جسے جو چاہے کھا سکتا ہے۔۔"

سب نے قہقہہ لگایا تو ماں صاحب سر جھکائے مسکرائیں۔

"کبھی کبھی چلتا ہے۔۔"

انہوں نے پر خلوص سی آواز میں کہا۔

ماں صاحب اور خرم حج سے لوٹے تو شگوفہ اور گھر کا ملازم کئی روز تک مبارک بادیوں کے تقاضوں میں گھرے رہے۔کئی دن تک روز کا سکیڈیول متاثر ہوتا گیا۔ہفتوں بعد کہیں کچھ سکون میسر ہوا۔

رات شگوفہ خواب گاہ میں آئی تو خرم میز پر کچھ کاغذ دیکھ رہا تھا۔

"باہر جانا چاہتے ہیں صاحب زادے۔۔"

اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"جی۔۔کوئی ڈپلومہ ہے دو سال کا اور اس کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا،انشااللہ۔۔"

"مگر فیس ڈالر، پاؤنڈ یا یورو میں ہوگی۔۔ پتہ ہے آپ کو۔۔"

خرم نے ایک کاغذ پلٹ کر دیکھا۔

"ہے تو۔۔مگر بچے کا مستقبل تو دیکھنا ہے نا۔۔اور اگر کم ہو تو وہ پانچ سال والی ایف ڈی میچور ہونے والی ہے۔۔"

"ہاں ہے تو مگر وہ نومبر میں ہوگی اور رقم مارچ میں چاہئے۔۔میں وہی دیکھ رہا تھا۔۔"

"اس ایف ڈی پر لون بھی مل سکتا ہے۔۔ کچھ انٹریسٹ میں کمی ہو سکتا ہے مگر۔۔"

"توڑا بھی جا سکتا ہے اسے۔۔مگر پھر انٹریسٹ لوز ہو جائے گا۔۔"

''کوئی اور چارہ بھی نہیں۔۔''

اس نے شوہر کے چہرے کی جانب دیکھا اور الماری سے رات کو پہننے والا لباس نکالنے لگی۔

باہر کوئی کتا زور زور سے بھونک رہا تھا۔

اگلی صبح برآمدے میں ناشتے کے دوران ماں صاحب نے بتایا کہ رات ان کی چھاتی میں ہلکا سا درد اٹھا تھا۔

''کس طرف۔۔؟ داہنے یا بائیں۔۔''

خرم نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

ماں صاحب نے جب بائیں کہا تو خرم نے چائے کا پیالہ چھوڑ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

''آپ تیار ہو جائیں۔۔میں چینج کرتا ہوں۔۔ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، پوری طرح چیک اپ کرانا ہوگا۔۔''

''ابھی بھی تکلیف ہے۔۔؟''

شگوفہ نے پوچھا۔

''نہیں۔۔''

''تو پھر کوئی خاص بات نہ ہوگی انشااللہ۔۔تیزابیت سے بھی بھاری پن ہو جاتا ہے اور دھڑکن تیز اور تکلیف سی محسوس ہوتی ہے۔۔''

شگوفہ نے کہا۔

''ہاں بیٹا۔۔پھر بھی۔۔مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔۔نرسنگ ہوم لے چلنا مجھے۔۔''

''ہاں سب چیک کروائیں گے ماں صاحب آپ فکر نہ کریں۔۔''

خرم اندر چلا گیا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔۔سب ٹھیک ہے۔۔بلا وجہ۔۔''

شگوفہ نے سامنے کی دیوار پر اخروٹ کی لکڑی سے منقوش آیت الکرسی کو ابرو

اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور لمبا سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اور واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہر طرح کی جانچ صحیح نکلی۔ سب مطمئن ہو گئے مگر خرم نے محسوس کیا کہ ماں صاحب اکثر و بیشتر کراہتیں ہیں۔

ویسے ماں صاحب کا معمول بھی نہیں بدلا تھا اور صحت بھی ٹھیک لگتی تھی۔ وقت سے کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔ رات کو آرام سے سوتی بھی تھیں اور رات کی عبادت بھی حسب سابق جاری تھی۔ مگر جب بھی خرم کے کانوں میں ان کے کراہنے کی آواز پڑتی، وہ بے سکون ہو جاتا۔ لپک کر ان کے پاس جا پہنچتا۔ پوری تسلی کرتا کہ سب خیریت ہے۔

''ماں صاحب ٹھیک تو ہیں نا آپ۔۔ کیوں کراہ رہی تھیں۔۔؟''

''میں ٹھیک ہوں بیٹا۔۔ دفتر جا رہے ہو۔۔ آؤ دعا دم کر دوں۔۔ پھر میں چاشت میں مصروف ہو جاؤں گی۔۔''

انہوں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا پڑھی۔ ان کے پاس سے گل یاسمین کی خوشبو آ رہی تھی جس سے خرم پچاس سال سے مانوس تھے۔

''جاؤ اللہ حامی و ناصر ہو۔۔''

''ٹھیک ہیں نا آپ ماں صاحب۔۔''

خرم نے باہر کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے پوچھا۔

''ہاں بالکل۔۔ بے فکر ہو کر جاؤ۔۔''

لابی میں لوٹا تو چائے کی پیالی پر بھاپ جیسی کوئی شے نظر نہ آئی۔

''ناشتہ کیئے بنا اٹھ گئے۔۔؟''

شگوفہ نے پیالی ان کے سامنے سے سرکائی اور ٹی کوزی ہٹا کر ہاتھ کی الٹی طرف سے کیتلی کو چھوا۔ پھر گردن باورچی خانے کی طرف اچکائی۔

''ظفر دوسرا کپ دینا۔۔''

اس نے ہلکے سے پکارا۔

''گرم ہے۔۔''
وہ کیتلی سے ہلا سنہرا گرم گرم پانی نیلے کنارے والی سفید پیالی میں انڈیلنے لگی۔
''لیجئے۔۔''
''گھبرا جاتا ہوں میں۔۔''
وہ شکردان اپنی طرف سرکا کر بولے۔
''بلا وجہ گھبراتے ہیں آپ۔۔''
''سوچتا ہوں ہمارے لئے کیا نہیں کرتی رہتیں ماں صاحب۔۔کہیں مجھ سے کوئی کمی نہ رہ جائے۔۔''
''کس چیز کی کمی۔۔وہ ماشا اللہ بالکل تندرست و توانا ہیں۔۔''
''مگر ان دن تکلیف کے بعد کراہتی کیوں رہتی ہیں پھر۔۔؟''
''آپ ہی کی موجودگی میں یہ آواز سننے کو ملتی ہے۔۔ورنہ دن بھر تو۔۔''
''کیا تم روایتی بہوؤں کی طرح۔۔کبھی انہوں نے روایتی ساس جیسا برتاؤ کیا ہے تمہارے ساتھ۔۔''
''آپ یہ الزام نہ دیجئے۔۔ساری رات عبادت میں گزارتی ہیں ہمیشہ کی طرح۔۔کمرہ ہم سے زیادہ دور تو نہیں۔۔جب ان کے درود و تلاوت کی آواز کانوں میں پڑ سکتی ہے تو۔۔؟''
''وہ تو میری کچی نیند کے سبب اونچی آواز میں کہاں پڑتی ہیں۔۔''
''تو کراہتی ہیں رات کو کیا۔۔کبھی سنا آپ نے۔۔؟''
''نہیں۔۔سنا تو نہیں۔۔شاید۔۔''
''اگر کراہتیں تو آپ ضرور سنتے۔۔''
''برداشت کا مادہ ہے ان میں بہت۔سہ لیتی ہوں گی۔۔''
''پھر دن میں کیوں نہیں سہ پاتیں۔۔''

''دن میں سب گھر میں ہوتے ہیں جاگ رہے اسی لئے شاید۔۔''
''ہاں شاید۔۔شاید یہ ہی بات ہوگی۔۔''
شگوفہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔
''یہی ہوگا۔مگر آپ پریشان نہ ہوں۔۔ ماشااللہ سے تندرست ہیں۔''
خرم چائے پینے لگا۔تو ملازم آکر میز کے دوسرے کنارے کے پاس کھڑا ہوگیا۔
''رات میں کیا بنے گا میم صاحب۔۔''
''کیا کھائیے گا۔۔''
شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا۔
''جو آپ کھلائیے گا۔۔''
خرم نے سر کاندھے کی طرف خم کیا۔باہر سے کوئی بانسری بیچنے والا ایک پرانی فلم کی دھن بجاتا گزرا۔
خرم نے پیالی خالی کر کے پرچ میں ذرا اونچی آواز سے رکھی اور نیچی آواز میں گاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔
''تن ڈولے میرا من ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے۔۔''
وہ کمرے کی طرف گیا تو شگوفہ بھی مسکراتی پیچھے چل دی۔
''گوبھی گوشت چلے گا۔۔؟''
شگوفہ نے مسہری پر رکھی نیلے مہین مہین خانوں والی سفید قمیض کو نظر بھر کے دیکھا اورالماری سے نیلی ہری آڑی دھاریوں والی ٹائی نکال کر خرم کو پکڑائی۔
''ضرور چلے گا۔۔''
وہ ٹائی باندھنے لگے تو شگوفہ باورچی خانے کی طرف لوٹی۔ملازم ریفریجریٹر میں سر ڈالے 'تن ڈولے' کا اگلا حصہ گنگنا رہا تھا۔
''میرے دل کا گیا قرار رے کون بجائے بانسریا۔۔''

شگوفہ دروازے کے پاس ذرا سا ٹھٹھکی اور کھنکار کر اندر گئی۔ ظفر نے ہونٹ سی لئے اور سر باہر نکالا۔

''ادرک ہے،ہی نہیں۔۔''

وہ جلدی سے بولا۔

''گوبھی گوشت بنے گا۔۔اور وہ بلیک بینز بنانا۔۔کالی دال۔۔اور ماں صاحب سے پوچھو جا کر کچھ اور لانا ہوتو۔۔ کچھ کہہ رہی تھیں لانے کو گھیا کے علاوہ۔۔ پھر جلدی مارکیٹ جاؤ۔۔ اور یہ سر اتنا اندر کیوں ڈالتے ہو عقل مند آدمی۔۔سبزی والا ڈبہ نکال لیا کرو۔۔اس بہانے دھل بھی جائے گا۔۔''

''کل ہی دھویا تھا خدا کی قسم۔۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔اب شروع ہو جانا قسم پر قسم۔۔''

شگوفہ باورچی خانے سے باہر نکلی۔

''اب قسم نہیں کھاؤں گا میم صاحب خدا کی قس۔۔اوہ۔۔''

ظفر نے دروازے تک آ کر جلدی سے دانتوں تلے زبان دبائی اور واپس اندر گیا۔

اس شام خرم کچھ دیر سے لوٹا کہ بیٹے کے لیے ٹریولرس چیکس وغیرہ کا کام تھا۔ شام کو قیصر بھی ان کے ہمراہ گیا تھا۔ سب کچھ توقع کے مطابق ٹھیک ہوا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ماں صاحب کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی تو خرم بے قرار ہو گیا۔

''ماں صاحب کو پھر تکلیف ہے دیکھتا ہوں۔۔''

وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف گیا۔

''سوئے نہیں بیٹا۔۔''

وہ دھیرے سے بولیں۔

''بس سونے ہی والا تھا ماں صاحب۔۔آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔۔''

''میں ٹھیک ہوں۔۔تم کیوں فکر مند ہو جاتے ہو۔۔''

''مگر آپ کیوں کراہ رہی تھیں۔۔؟''

''میں۔۔کچھ نہیں۔۔ٹھیک ہوں میں۔۔تم۔۔میں۔۔''

شگوفہ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم لوگ آرام کرو۔۔کچھ فکر کی بات نہیں۔۔''

ماں صاحب نے گہری سانس لی۔

''بس میرا جی چاہتا ہے کہ۔۔''

''کیا ماں صاحب۔۔؟''

''ایک بار عمرہ کے لیے جاؤں۔۔''

زاہدہ خانم نے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے۔جیسا آپ چاہیں ماں صاحب۔۔''

خرم فوراً مسکرایا۔

''مگر تمہیں بھی چلنا ہوگا۔۔یا قیصر کو۔۔محرم کے بغیر تو ممکن۔۔''

ماں صاحب نے پھر بہو بیٹے دونوں کو دیکھا۔

''یہ۔۔یہ۔۔کیسے کرتے ہیں۔۔سوچتے ہیں ماں صاحب۔۔آپ بے فکر ہو کر آرام کریں۔۔کچھ کرتے ہیں۔۔''

شگوفہ نے ماتھے پر ہلکا سا بل ڈال کر شوہر کو دیکھا پھر ماں صاحب کی طرف (بغیر بل ڈالے) بھی۔

''قیصر بھی آسکتا ہے بیٹا۔۔اس کے امتحان بھی ہو گئے ہیں۔۔چھ مہینے کے لیے وہ بھی آزاد ہے۔۔آجائے گا ساتھ میرے۔۔مشکلیں حل کرے گا اللہ اس کی۔۔''

''مگر ماں صاحب اسے کوچنگ کا کورس جوائن کرنا ہے۔ابھی بچہ ہے انشا اللہ آگے چل کر۔۔کرے گا جج بھی اللہ نے چاہا تو۔۔ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔۔''

شگوفہ نے جلدی سے کہا۔

''ہاں انشا اللہ ضرور کرے گا۔۔میں محرم کی وجہ سے۔۔خیر خرم ہی چلے تو۔۔''

''آپ آرام کیجئے ماں صاحب۔۔کچھ کرتے ہیں۔۔''

خرم نے انہیں مصنوعی ریشم کے نرم نرم ریشوں سے بھری، ساٹن کے چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والی نیلی رضائی شانوں تک اڑھادی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ شگوفہ اس کے آگے آگے تھی۔ کمرے میں پہنچے تو شگوفہ کا سانس پھول رہا تھا۔

''ہانپ رہی ہو تم تو دو قدم چل کر۔۔وزن کم کرلو اپنا شگوفہ بیگم۔۔ورنہ ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔۔ایسے بھی ابھی ہم جوان لگتے ہیں۔ اور ویسے بھی وہ تمہاری خدمت کرے گی۔۔اور جیسے تیسے میں نبھالوں گا۔۔''

خرم خود کو آئینے میں اور دراصل شگوفہ بیگم کو دیکھ کر بولے جو آئینے کے اندر مسہری پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔۔؟ ویسے آپ سے کیا بعید ہے۔۔''

اس نے ایک نظر آئینے میں دیکھ کر گردن جھٹکی۔

''اچھا۔۔؟ ابھی بھی شکوک نے پیچھا نہیں چھوڑا آپ کا۔۔کتنے ثبوت دے دیے ہم نے وفا کے۔۔ہمیں کوئی آپ جتنا خوبصورت نظر نہیں آتا ورنہ۔۔''

''نظر نہیں آتا۔۔کسی اور سے کہئے جا کر۔۔خیر میں سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں اور آپ۔۔''

''سنجیدہ بات۔۔اچھا اب بتایئے اگر سچ مچ ہی ہمیں وہ آپ کی رشتے کی بہن جس کی ہم نے بھول سے ایک بار تعریف کر دی تھی، پسند آ جاتی اور ہم آپ کو آئے دن خدانخواستہ طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے تو آپ کی زندگی تو۔۔''

خرم اپنے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بیگم کی طرف پلٹے۔

''جہنم ہو جاتی۔۔ٹھیک سمجھا آپ نے۔۔مگر ہم جہنم میں رہنے کے قائل نہیں

ہیں۔۔یہ آپ بھی جانتے ہیں۔۔ہم نے راستے الگ کئے ہوتے۔۔''
شگوفہ بیگم کا لہجہ سخت سا ہو گیا۔
''دیکھئے اس ذکر سے ہی آپ ٹینس ہو جاتی ہیں۔۔خدا کا شکر ہے کہ آپ کا شوہر ایسا نہیں ہے۔سوچئے اگر سچ مچ ہی کسی کے ساتھ ایسا ہوتا تو اس کا کیا حال ہو جائے گا۔۔''
''زندہ در گور ہو جائے گی۔۔''
شگوفہ نے پاؤں سمیٹ لئے اور پیچھے ہو کر تکیہ درست کرنے لگی۔
''ہاں آپ نے بالکل سچ کہا۔۔ایسا ہی ہوا تھا۔۔''
''کب۔۔؟کس کے ساتھ۔۔کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔؟''
خرم نے کنگھا میز پر رکھ دیا اور ایک لمبی سانس لیتے اس کے برابر آ بیٹھے۔
خورشید عالم نے گھٹنوں تک آ رہے لمبے سفید جوتے کرسی کے قریب اتار کر اور کوٹ کرسی کی پشت کو گویا پہنا سا دیا۔اور چائے کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نظر آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں کی طرف ڈال کر کھانے کی کرسی پر آ بیٹھے۔
''تو کوئی فائدہ نہ ہوا تمہیں باہر بھیجنے کا۔۔''
انہوں نے سر جھٹک کر، چائے بنا رہی بیگم کی طرف نظر اٹھائی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھے اپنے صحت مند جوان بیٹے کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔
''نقصان ہی ہوا الٹا۔۔''
بیگم خورشید اداسی سے بولیں۔
''کہاں کمی رہ گئی ثاقب۔۔قصبے کے اہم اور اکلوتے مشن سکول میں تمہیں تعلیم دلوائی۔۔سینٹ جوزف میں۔۔آکسفورڈ بھیجا۔۔کیوں تمہارا پڑھائی میں دل۔۔''
''آکسفورڈ نہیں کیمبرج ابا جی۔۔''
ثاقب جانتا تھا کہ موضوع بدلنے کا یہ ہی یک کارگر طریقہ ہے۔
''دونوں اہم ہیں۔۔کیمبرج اسی کی اصل میں ایک شاخ ہے۔۔اور تم۔۔لندن

کی سب سے پرانی یونیورسٹی آکسفورڈ میں جس کے والد نے تعلیم حاصل کی ہو اس کی پہلی اولاد اس عمر تک آ کر بھی چھوٹے بچوں کی طرح پڑھائی سے جی چرائے۔۔اور۔۔''

خورشید عالم پیالی کو چھو کر رہ گئے۔

''کتنی پرانی ہو گی یونیورسٹی ابا جی۔۔کوئی۔۔؟''

''لیجیے۔۔یہ موضوع کو کیسے۔۔''

وہ بے بسی سے بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔

''نہیں ابا جی میں واقعی جاننا چاہتا تھا۔۔کوئی گیارہویں صدی کہتا ہے کوئی بارہویں۔۔''

ثاقب بھی ماں کی جانب گویا بے بسی سے دیکھنے لگا۔

''اب جو بھی ہے۔۔کوئی۔۔ابھی پچھلی صدی میں تمہاری پیدائش سے کوئی صدی بھر قبل۔۔۔یعنی۔۔۔سن ۱۸۲۳ء میں اس کی یونین۔۔۔آکسفورڈ یونین بننے کے بعد سے۔بننے کے بعد۔جانتے ہو بڑے بڑے لیڈر اور nobel laureates پیدا کئے ہیں اس نے۔۔''

''پہلے بہت جھگڑا ہوا کرتے تھے نا تعلیم کو لے کر وہاں۔۔چرچ کی تعلیم کے خلاف سمجھتے تھے لوگ یونیورسٹی میں پڑھنے کو۔۔اور سٹوڈنٹس کے ساتھ بھی ہوئے تھے نا جھگڑے۔۔؟''

''ہاں۔۔بند ہونے سے بچانا پڑا تھا بری مشکل سے منتظمین کو اسے۔۔مگر یہ تو ہمیشہ ہی سماج میں ہوتا ہے۔۔کوئی نئی چیز اپنے ساتھ متضاد خیالات تو لاتی ہی ہے۔۔اور جیت ہمیشہ صحیح بات کی ہوتی ہے۔۔مگر تعجب ہوتا ہے۔۔وہ علمی ماحول۔۔وہ سبزہ زار۔وہ چناروں جیسے میپل ٹریز۔۔وہ کشادہ باغات۔۔وہ پرشکوہ عمارتیں۔۔کلس۔۔گرجے۔۔راستے۔۔کوئی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہیں کر سکا۔۔کتنا شوق تھا مجھے تمہاری اسناد میں تاج پر رکھی کھلی کتاب کے دونوں صفحات پر مزید وہ تاج سنبھالے علم کی دنیا کو وہ بے مثال

نشان دیکھنے کا۔۔اپنے جیسا۔۔یا ایسا ہی کوئی اور اہم نشان۔۔ایک پورا شہر۔۔ایک پورا تعلیمی شہر۔۔ایک پوری علمی کائنات بھی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کرسکی۔۔اور آخر کار تم نے فیصلہ ہی کرلیا کہ۔۔"

انہوں نے مکھن لگی مکئی کی روٹی کا ادھ چپا ٹکڑا کلے میں دبائے جواب دیا اور پھر اسے عجلت سے نگل کر بیٹے کی جانب غصے سے دیکھنے لگے۔۔مگر تم۔۔ یہ بچوں کے سے سوالات پوچھ کر میرا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔۔مجھے یہ بتاؤ کہ یہ اتنی جائیداد۔۔ یہ امپائر جو میں نے کھڑی کی ہے اسے۔۔اسے کس کو سونپ کر جانا چاہتے ہو تم۔۔وہ دونوں تو بہت چھوٹے ہیں۔۔تم بڑے ہو۔۔کتنی امیدیں وابستہ تھیں تم سے میری۔۔"

انہوں نے گردن خم کر کے ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دئے اور بیٹے پر نظریں مرکوز کرلیں۔

"اچھا آپ۔آپ کا دل لگتا ہے یہاں۔۔سچ بتایئے ابا جی۔۔میں۔۔؟"

"نہ لگتا تو میں یہاں آکر کیوں بس جاتا۔۔گرم خطے کا باشندہ ہوکر بھی۔۔یہ جگہ مجھے لندن سے کم نہیں معلوم ہوتی مجھے۔۔یہ ہماری اپنی سرزمین ہے۔۔اور پھر کمی کیا ہے۔۔ کس بات کی کمی ہے۔۔ایسے باعزت عہدے پر فائز ہوں۔۔گھر بار زمینیں باغ سب یہاں ہے۔۔اور یہ سب مجھے ساتھ نہیں لے جانا۔۔اور تم۔۔کیسے سمجھاؤں تمہیں سمجھ میں نہیں آتا۔۔"

"مگر مجھے۔۔مجھے۔۔یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا ابا جی۔۔اگر اس سب کو بیچ کر ہم لندن میں بزنس کریں اور کسی لارڈ کی طرح رہیں۔۔"

اس نے بالکل بچوں کی طرح کہا۔

"چپ رہو۔۔میں نے تمہیں آکسفورڈ کاروبار کے لیے نہیں تعلیم کیلئے بھیجا تھا۔۔میری موت کے بعد ہی۔۔تم۔۔تم۔۔اور لارڈ۔۔یوں ہی نہیں بن جاتا کوئی۔۔ بغیر محنت اور عزت کمائے لارڈ۔۔تم میں یہ دو چیزیں ہیں؟۔۔تم۔۔؟"

خورشید عالم کھانسنے لگے تو بیگم نے غصے سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''سوری۔۔میں۔۔''

اس نے باپ کی طرف نظر اٹھا کر جھکالی۔

''دور ہوجاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ مجھے شک ہے کہ۔۔کہ۔وہاں تم۔۔''

وہ کچھ کہتے ہوئے رک گئے اور کمرہ چھوڑ کر جاتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھتے بیگم کی طرف پلٹے۔

''اس نے کہیں شادی تو نہیں کر لی وہاں۔۔میں نے اسے غلط کیا بھیج کر۔۔اس کا تو کبھی تعلیم میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔یہیں باغ واغ سنبھالتا۔۔اب تو یہ ہاتھ سے نکل ہی۔۔''

''نہیں خدا نہ کرے۔۔کچھ بھی ہو وہ شادی نہیں کر سکتا وہاں آپ کی مرضی کے بغیر۔۔بھانجی میری منگیتر ہے اس کی۔۔جانتا نہیں کیا۔۔آپ بھی کہاں کی سوچنے لگ جاتے ہیں۔۔''

''غصے میں۔۔میں۔۔میں کہیں اسے عاق۔۔''

''کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ۔۔سن لے گا تو چلا جائے گا ناراض ہو کر۔ پھر کیا کریں گے اس سب کا۔۔دیوانے ہو جائیں گے ہم دونوں۔۔ابھی بھی باہر جاتا ہے تو کیا میری طرح آپ بھی چپکے چپکے روتے نہیں رہتے۔۔؟ بھوک مر جاتی ہے ہماری۔۔ہول پڑنے لگتے ہیں ہم لوگوں کو۔۔اپنی اولاد آنکھوں سے اوجھل کی جاسکتی ہے اپنی مرضی سے۔۔؟ یہ تو ہم نے اس کی بہتری کے لیے کلیجے پر پتھر رکھ لیا تھا۔۔اب آ گیا ہے تو۔۔مہینوں کے سمندری سفر سے۔۔''

بیگم کی آواز آنسوؤں سے نم ہو گئی۔ خورشید عالم کی آنکھوں میں بھی پانی سا بھر آیا۔ مگر اگلے لمحے وہ پیالی اٹھا کر پر سکون سے چائے پیتے نظر آنے لگے۔

''ٹھیک کہتی ہو۔۔ ہماری تو جان ہی اس میں بستی ہے۔۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔۔ مگر ایک بار اس سے پوچھ لیں کہ کہیں اس نے وہاں کسی سے شادی۔۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ ایسا۔۔ میں پوچھوں گی۔۔ نہیں پہلے اپنے طریقے سے معلوم کروں گی۔۔''

''جیسے۔۔؟''

''جیسے کہ پیار سے دلار سے۔۔ کوئی آپ کی طرح اعلانِ جنگ کر کے نہیں۔۔''

اگلی صبح جب ثاقب گھڑ سواری کیلیئے اپنے باغوں کی جانب نکل گیا تو اس کی والدہ اس کے کمرے سے دھونے والے کپڑے لینے گئی۔

مسہری پر پڑے کوٹ کی جیب سے ایک والیٹ جھانک رہا تھا جس میں اور چیزوں کے علاوہ ایک تصویر بھی نظر آئی۔ اس کا حسین وجمیل لڑکا اپنے سے کچھ لمبی لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ لڑکی کے شانے اس کے کثرتی بیٹے کے شانوں سے کچھ زیادہ کشادہ تھے اور کمر تک چست، گھیرے دار گاؤن جیسے لباس میں بھی اس کی کمر کا خم نہایت مبہم نظر آتا تھا۔ جیسے کسی لڑکے کی کمر ہو۔ لڑکی کے ہنستے ہوئے دانتوں کے اطراف اس کے چربی سے نابلد چہرے پر دو دو لمبی کمانیں سی بنی تھیں۔ سیاہ سفید تصویر میں اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی نسبتاً کم تھی اور ہلکے رنگ کے ترشے بالوں کے ساتھ میل کھا کر کچھ جاذبیت عطا کر رہی تھی۔

'گورا رنگ تے بلیاں اکھاں۔' بیگم خورشید نے خالص پنجابی لہجے میں گویا اپنے آپ سے کہا۔

'کیا بات نظر آ گئی میرے بیٹے کو۔۔ تجھ میں۔۔ مگر اس کے باپ نے بھی تو ہمیشہ حسن کا معیار اسی پیمانے سے ماپا تھا۔۔'

انہوں نے سوچا۔

'ہمیشہ کہتے میمیں گوری ہوتی ہیں بہت۔۔ ہاں مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ حسین ہوتی ہیں۔۔ خیر اپنی اپنی پسند۔۔ مگر یہ بیٹا میرا۔۔ بالکل اچھی نہیں لگتی اس کے

ساتھ۔۔ گندمی سے ہیں ہم۔۔ اور وہ بھی کھرے گندمی نہیں۔۔ مگر نین نقش تو ان سے کہیں۔۔ مطلب اس سے کہیں اچھے ہیں۔۔ اچھے نین نقش وہاں بھی ہوتے ہوں گے۔۔ اب اسے یہ ہی پسند آ گئی۔۔'

وہ ذرا اونچی آواز میں بولنے لگیں۔

'مگر اس کے ابا تو'

بیگم خورشید کا دل ذرا سا گھبرایا۔

'اب تو اسے روکنا ہی ہوگا'

وہ کچھ اور اونچی آواز میں بولیں۔

'نہیں۔۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔۔ منہ پھٹ اور صاف گو بیٹے نے کہہ دیا ہوتا کہ شادی کر لی ہے۔۔ ابھی صرف پسند کیا ہوگا۔۔'

باہر سے جمال بٹ کی کلہاڑی کے لکڑیوں پر چلنے کی آواز آ رہی تھی جو بہت سویرے سے چولہے، حمام اور آتش دانوں کیلئے لکڑی کا دوسرا ڈھیر لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس بار سردیوں نے کچھ طوالت پکڑ لی تھی۔ چالیس روز پر مشتمل سردی کے دنوں کا بڑا حصہ 'چلہ کلاں' گزر چکا تھا اور قاعدے سے بعد کے 'چلہ خورد' کی سردی میں اس قدر شدت نہیں ہونا چاہئے تھی۔ مگر ایسی کوئی بات فی الحال نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹھک ٹھک۔ ٹھیک ٹھاک۔ ٹھک ٹھک۔

بیگم خورشید کو لکڑی چیرنے کی آواز ہمیشہ اسی طرز میں سنائی دیا کرتی تھی۔ آواز کچھ دیر کیلئے بند ہوئی تو ان کے کان باہر کی طرف لگ گئے۔ جمال بٹ نے گھاس سے بنے جوتوں کے اندر بھیڑ کے اون سے کاتے گئے موٹے کپڑے کی چوڑی سی پٹیاں بنا لی تھیں اور انہیں اپنے گھٹنوں تک لپیٹ رکھا تھا۔ کلہاڑے کے لکڑی سے ٹکرانے کی ضرب نے بھی زمین پر کانچ کی تختی کی طرح بچھی جمی ہوئی سخت برف کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جب کہ کل بھی جمال بٹ اسی مقام پر لکڑیاں چیرتا رہا تھا۔

بیگم خورشید کی آنکھوں میں باہر کا منظر گھوم گیا۔

کانگڑی سینکنے کے بہانے چلم سلگائے گا اب یہ۔ اور پھر باورچی خانے کے پچھلے صحن کی صفائی آج بھی رہ جائے گی۔ اگر یہی رفتار رہی جمال بٹ کی تو۔ کتنا خراب لگتا ہے جمی برف پر لکڑی کا چورا سا گرا ہوا۔ جیسے صفائی ہی نہ ہوئی ہو۔ پھر زیبا کتنی مشکل سے سمیٹ پاتی ہے لکڑی کے ڈھیر کی طرف یہ چورا۔ بیگم خورشید نے ہونٹوں کو سکیڑ کر دائرہ سا بنایا اور گردن دو ایک بار نفی میں ہلائی۔

کب اٹھائے گا اس ڈھیر کو، اور برادے کی کوٹھری کے چھجے کی آڑ میں چار چار کر کے تہہ در تہہ لگائے گا سوکھنے کیلئے۔ یہ کام چور۔ اگر اور برف گری تو کہاں چیرے گا لکڑیاں پھر۔ سارے شیڈ میں بغیر چیری لکڑیاں بھری ہیں۔ برآمدہ تھوڑی تڑوانا ہے۔

بیگم خورشید نے سر جھٹکا تو کلہاڑے کی آواز پھر کانوں میں پڑنے لگی، اور ساتھ ہی پتھر کی ایک ایک سل سے تراشے گئے کشادہ زینے پر زیبا کے ننگے پیروں تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ یعنی کپڑے لینے زیبا اور آ رہی تھی۔

ٹھاک ٹھاک۔ ٹھیک ٹھاک۔ ٹھک ٹھک۔

باہر سے آواز سنائی دی۔

'ٹھیک ٹھاک۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کچھ نہیں بگڑا۔'

ہر حال میں خوش رہنے کو ترجیح دینے والی بیگم خورشید خوش دلی سے مسکرائیں۔

"میں نیچے ہی لا رہی ہوں کپڑے زیبی۔ تم مت آؤ۔"

انہوں نے پکار کر کہا کہ کون جانے پتنگ ایسی نازک اور ڈور ایسی لچکیلی زیبی، جسے اس کے ساتھ ہاتھ بٹانے ولی پہاڑن بی بونے، دھان کوٹتے وقت نظر بچا کر بار بار ثاقب کی کھڑکی کی طرف دیکھتے دیکھا تھا، سچ مچ ہی ثاقب سے بات کرتی ہو اور اسے بتا دے کہ میں اس کے والیٹ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

یہ ثاقب میاں بھی اسی کے ہاتھوں کی لسی پسند کرتے ہیں۔ کیوں بھلا۔ کیا بی

بو نے سچ کہا تھا۔؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ خیر۔ مگر ایسا ہوگا نہیں۔ یہ تربیت نہیں ہے ہمارے بچوں کی۔ بیگم خورشید کے ماتھے پر ایک آدھ بل سا کھنچ آیا۔

''اچھا بی بی جی۔۔''

زیبا نے بھی پکار کر کہا، اور اس کے ننگے پیروں زینہ اترنے کی تیز تیز آواز آئی۔

بیگم خورشید نے نفی میں سر ہلایا اور ماتھے سے بل یک سر غائب ہو گئے۔

'تیرے سے تو میری زیبی اچھی ہے بے چاری۔ جو اس سردی میں ننگے پاؤں کام کرتی ہے میرا اتنا۔ اس جمال بٹ سے کہوں گی اپنی بیٹی کے لیے بھی بن دے دو چھوٹے چھوٹے جوتے گھاس کی بل کھائی رسیوں کے پولہے۔ مگر اسے تو جیسے سردی ہی نہیں لگتی۔ پچھلے دنوں اپنے سلیپر دیئے تھے اسے۔ جانے کہاں پڑے ہوں گے۔'

بیگم خورشید نے زینے کی طرف نظر ڈالی اور واپس تصویر کو دیکھنے لگیں۔

زیبی سے ہی نہ پھر بیاہ کر دوں اپنے بیٹے کا۔ کاشتکار کی بیٹی سے۔ تجھ سے بہتر جچے گی اس کے ساتھ۔

یہ جملہ بیگم خورشید نے ہونٹوں سے ادا نہیں کیا۔

'خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'

انہوں نے پھر اپنے آپ سے بات کی۔

'یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے مسئلے حل کئے ہیں تو نے رشیدہ بانو، اس چھوٹی سی زندگی میں۔ اللہ کے فضل سے۔ اب اس کے ابا جی کو یہ بات سنا کر پریشان ہونے سے بچانے کے لیے جلدی سے نسخہ بھی سوچنا اور بتانا ہوگا۔ باپ بیٹا دونوں بچے ہیں اس گھر میں۔ ایک میں ہی بڑی ہوں۔ پیدائشی بڑی۔

'نی مائیں تیری شیداں تے پیدا ہی وڈی ہوئی سی۔'

سیالکوٹ کی پنجابن بیگم خورشید ہمیشہ پنجابی میں سوچا کرتیں اور اپنے آپ سے پنجابی ہی بولتیں کہ اور کسی کے ساتھ وہ گھر میں پنجابی نہیں بولتی تھیں۔ میاں انگریزی اور اردو

بولنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی پنجابی میں گنگنا ضرور لیتے۔ بس ایک آدھ مصرعہ۔ بیگم کان آواز پر لگا دیتیں کہ ذرا اور گائیں۔ مگر وہ ایسے خاموش ہو جاتے کہ صاف ظاہر ہوتا پچھتا رہے ہیں۔ لیکن مادری زبان میں سنی لوریاں اور لوک گیت ہی تو ساری عمر یاد رہتے ہیں انسان کو۔ کتنا بھی اردو دان اور انگریز ہو جائے وہ۔ بیگم خورشید نے زیر لب کہا اور گنگنانے لگیں۔

'کھیڈن دے دِن۔۔ چار نی مائیں۔۔ گھر بابل دے مڑ کے نہیں آنا۔۔ بسر گیا گھر یار نی مائیں۔۔ بسر گیا گھر۔۔ کھے اے۔۔ اے۔ اے ڈن دے۔۔ کھیڈن دے دن چار نی مائیں۔'

خود باپ بن جانے کے بعد ثاقب خورشید نے اپنے بیٹے کے سامنے یہ نغمہ گنگناتے اور اپنی والدہ کی باتیں کرتے ایک دن بتایا تھا کہ کیسے ابا جی پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ خود ولایت نہیں جا سکے تھے۔ اماں جی نے ایک بار پوچھا بھی تھا کہ کہیں وہ مجبوراً تو نہیں رک گئے باپ کو بیمار دیکھ کر، مگر ثاقب نے نفی میں سر ہلایا تھا اور اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی تھی۔

''کہ تم کو دنیا میں آنا تھا۔۔''

وہ محبت سے بیٹے کے چہرے کو نہارتے اور اسے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر گھما دیتے۔ پھر بڑے سر میں گانے لگتے۔ ایسے ہی جیسے انہوں نے اماں جی سے سنا تھا۔

'کھیڈن دے دِن چار۔۔نی۔۔ مائیں۔۔'

خالہ زاد سے شادی کرنے کی مجبوری کا دبا دبا سا غصہ ابا جی کی موت کے بعد بیوی پر ظاہر ہونے لگا تھا کہ خرم نے بچپن میں کئی بار انہیں ماں صاحب سے یہ کہتے سنا تھا کہ اچانک سب کچھ چھوڑ کر وہ بہت جلد ولایت جا کر اس فرنگن سے شادی کر کے اسے یہاں لے آئیں گے۔

''اور ماں صاحب اس خوف سے اکثر روتی نظر آتیں۔ انہوں نے ابو کی خوشنودی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ آتے میرا رونا تک بھول کر ان کی خدمت میں لگ جاتیں۔۔ حالانکہ ابو میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی۔ دادا حضور کی جائیداد کا انہوں نے بیشتر حصہ فروخت

کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا۔ ماں صاحب نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں شگوفہ بیگم۔۔تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔۔''

خرم دراز ہو گئے۔ شگوفہ بیگم آہ بھر کر رہ گئیں۔

''ایسا ہوا ماں صاحب کے ساتھ۔۔اور مجھے کوئی خبر ہی نہیں۔۔ کتنے ضبط سے جی ہوں گی ماں صاحب۔۔''

شگوفہ بیگم نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ ہر خوشی ان کے قدموں میں ڈال دوں۔۔''

''ہاں یہ ان کا حق بھی بنتا ہے۔۔مگر ابھی اللہ نے دو سال قبل حج کی سعادت عطا کی ہے نا۔۔''

''جانتی ہو۔۔اس بارگاہ سے کسی کا جی نہیں بھرتا شگوفہ۔۔خدا بہتر جانتا ہے جب سے آیا ہوں وہی منظر آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔۔آنکھیں بھر آتی ہیں۔ دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے کہ ایک بار پھر کسی طرح۔۔کسی طرح ایک بار جا کر۔۔جان وہیں نکل جائے میری۔۔ سچ شگوفہ یہ تجربہ ایسا روحانی سفر ہے کہ دنیا کے معنی صفر ہو جاتے ہیں۔۔تم گئی ہوتیں تو یہ بات ہی نہ۔۔''

''مگر وقت۔۔حالات۔۔اور حکم بھی یہ ہی ہے کہ فرائض سے سبک دوش ہو کر۔۔ اور پھر خود وہاں کی سرکار نے کہلوایا ہے کہ جنہیں اللہ نے یہ موقع نصیب کیا وہ دوسروں کو موقع دیں۔۔بار بار جانے کی جگہ ایک بار جا کر ان کا بھی خیال کریں جو کبھی نہیں گئے۔۔ کبھی بھیڑ بھی اتنی ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ کچلے بھی گئے ہیں۔۔اور کمزور سی ماں صاحب کی جان۔۔ یہ ثواب نہیں کہ کسی اور کو جانے کے لیے رقم دی جائے اگر ایسا ہی ہے تو۔۔؟۔۔یا کسی غریب کی مدد کی جائے۔ کسی یتیم لڑکی کے بیاہ پر خرچ کئے جائیں۔۔''

''یہ عشق حقیقی ہے جناب۔ عشق نہیں مانتا یہ عقل کی باتیں شگوفہ بیگم۔۔''

''اور اس کے اخراجات۔۔وہ بھی تو ایک پہلو ہے سوچنے کے لیے۔۔جو بچ رہا

ہے کچھ کہیں بنکوں میں۔۔ نکال دیجئے اور ماں بیٹا عمرہ کر آیئے۔۔ آگے کا خدا مالک ہے۔۔ ہے نا۔۔"

"تم اس قدر پریشان نہ ہو۔۔ ایسا بڑا خرچہ نہیں ہے۔۔"

"مگر کچھ ایسی رقم ہے نہیں۔۔ دیکھ لیجئے نا۔۔ جا کر۔۔ جوائنٹ تو ہے اکاؤنٹ ہمارا۔۔ زمینوں کی سالانہ انکم کا زمانہ تو چلا گیا نا۔۔ کاروبار ہے نہیں۔۔ لے دے کر تنخواہ ہی تو ہے۔۔ پھر بچوں کے بڑا ہوتے اخراجات کیسے پر لگاتے ہیں یہ آپ کو بیٹی کی شادی کے بعد بھی اندازہ نہیں ہوا۔۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ ایسے لاپرواہ۔۔"

"ٹھیک ہے مگر۔۔ ماں صاحب کے دن جییں گی۔ سوچتا ہوں۔۔ ایک پالیسی لی تھی۔۔ قیصر کی تعلیم کے لیے۔۔ وہ میچور ہونے والی ہے۔۔ اور ابھی کوئی اور ایمرجنسی نہیں ہے۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔ کچھ دیکھتا ہوں۔۔ یہ بھی ضروری ہے۔۔ خیر تم خود کو پلیز پریشان نہ کرو۔۔ یہ سب میری ذمہ داری ہے۔۔"

"آپ کے ذمہ ہے۔۔ وقت پر بات سمجھتے نہیں۔۔ بعد میں مہینوں بعد کہتے ہیں کہ تم ٹھیک کہتی تھیں۔۔"

شگوفہ بیگم دوسری طرف دیکھ کر بولیں۔

"وہ تو ہے جناب۔۔"

خرم ہنسے اور اٹھ کر غسل خانے میں چلے گئے۔

خرم کے دفتر کے ایک ساتھی اور ان کی بیگم جا رہے تھے۔ محرم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ماں صاحب خوش خرم لوٹیں مگر کمزور ہو گئی تھیں۔

رفتہ رفتہ ماں صاحب اور کمزور ہوتی گئیں۔

ان کے روز و شب حسب معمول ویسے ہی رہے۔ صرف بینائی کم ہو گئی تھی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اتر آیا تھا مگر ابھی پختہ نہیں ہوا تھا کہ آپریشن کیا جائے۔ گو کہ اب کچھ پہلے بھی آپریشن کیا جانے لگا تھا۔ مگر ماں صاحب نے خود ہی دیر انتظار کرنا مناسب جانا۔

قیصر ولایت چلا گیا تھا۔اور کچھ خوش نہیں تھا۔

یہاں کے لوگوں کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا اپنے ملک میں پسند ہی نہیں ہے۔۔ بہت ساروں کو تو مذہب ہی شکایت کا سبب نظر آتا تھا۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔لیکن آپ کے کالج کی لیول میں تو ایسا نہیں ہونا چاہئے۔پھر آپ کوئی نوکری کرنے تھوڑی گئے ہیں۔۔دوسال کی بات ہے۔۔''

''ہر جگہ ایسا ہی ہے مام۔۔کہیں کم کہیں زیادہ۔۔میں خوش نہیں ہوں یہاں۔۔''

قیصر کی بجھی ہوئی آواز تو شگوفہ کے دل کا شگوفہ یکلخت مرجھا گیا۔وہ خود ضبط کئے بیٹھی تھی کہ قیصر کے جانے کے بعد گھر میں صرف ماں صاحب کے کراہنے کی آوازیں آتیں۔۔کوئی قہقہہ کم کم ہی کانوں میں پڑتا۔خرم بھی خاموش سے ہو گئے تھے،اور شگوفہ پر چڑ چڑے پن کا الزام تھا۔

''جہاں یہ مہینے گزرے۔۔باقی بھی گزر جائیں گے میری جان۔۔یہ ڈگری تمہارے بہت کام آئے گی یہاں۔۔بس تم وہاں مت رہ جانا دوسروں کی طرح۔۔نہیں تو مر ہی جاؤں گی میں بیٹا۔۔''

''نہیں مام سوال ہی نہیں۔۔میں کسی سہولت کے لیے اپنے وقار سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔۔دادی جان کہتی ہیں نا۔۔''

''ہاں بیٹا انہوں نے ہی تمہارے اس خواب کی تعبیر یہ نکالی تھی نا کہ تم بہت اونچی تعلیم حاصل کرو گے اور بڑے عہدے پر فائز ہو گے۔۔''

''ہاں۔۔وہ جب میں نے ایک دن صبح اٹھ کر انہیں خواب سنایا تھا۔۔جس دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ہرے بھرے باغ سے گزر رہا ہوں جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے پودوں کی قطاریں ہیں اور ان پودوں پر زرد رنگ پھول کھلے ہیں اور سارا ماحول خوشبو سے بھرا ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ تم نے زعفران کے کھیت دیکھے ہیں اور اتنی اچھی تعبیر نکالی تھی۔۔ہے نا مام۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔تمہیں یاد بھی کرتی ہیں وہ۔۔کبھی تمہارا نام لے کر بلاتی ہیں اور پھر کسی اور کو بلانے لگتی ہیں۔۔''

''آئی مس ہر ٹو۔۔مگر میں اداس ہو جاتا ہوں۔۔جی کرتا ہے بھاگ کر آ جاؤں۔۔''

''نہیں بیٹا۔۔ایسا مت کہونا۔۔''

''نہیں ماما۔۔ڈونا ٹ وری۔۔ابھی نہیں آؤں گا۔۔بس اگلی چھٹیوں میں۔۔یعنی چھ مہینے بعد۔۔یعنی پچاس بار شیمپو کرنے کے بعد۔۔ہے نا مام۔۔''

اس کی آواز میں ہنسی کی گونج سنائی دی تو شگوفہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ہاں میرے بچے۔۔''

اس نے آواز کو بھیگنے نہیں دیا۔

وہ فون کے پاس سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئی

ناز و نعم سے پلے بچے جانے کن خوابوں کے لیے یا والدین کی خوشی کے لیے وہاں ڈگریاں لینے ٹک جاتے ہیں۔قیصر کہتا تھا کہ وہ ان کی سخت جانی دیکھ کر حیران بھی ہوتا ہے اور پریشان بھی۔کبھی جان کا خطرہ ،کبھی مال کا۔اور ہر وقت بے سبب بے عزت ہونے کا نفسیاتی تناؤ۔

شگوفہ برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔خرم آیا تو اس نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔

قیصر کی تعلیم زور و شور سے جاری تھی۔اس کے کھاتے میں بار بار رقم جمع کرنا ہوتی تھی۔جو دوسرے ملک کی کرنسی میں بدلنے کے بعد خاصی کم ہو جاتی تھی۔گو کہ اب ڈالر روپے کی نسبت پہلے سے کچھ سستا بھی ہوا تھا۔مگر اس سے بھی کیا فرق پڑ سکتا تھا۔خرم کا عہدہ مزید اونچا ہو گیا تھا۔مگر روز روز مہنگائی اور عجیب عجیب اخراجات نے کسی قسم کی مثبت تبدیلی محسوس ہی نہ کرنے دی۔

اس دن دیر تک قیصر سے انٹرنیٹ سے رابطے میں بہت سی باتیں ہوئیں تھیں۔

شگوفہ اسے ویب کیم میں کبھی ہاتھ دکھانے کو کہتی تو کبھی پیر۔ کبھی سر کے پیچھے بال دیکھنا چاہتی کہ تناؤ سے اڑ تو نہیں رہے۔ اور کبھی ماتھے سے بال پیچھے کروا کر کہ پیشانی بھی ویسی ہی نا جیسے پہلے تھی۔ اور خرم بھی ان سب باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ کھانے کی میز پر سب ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ قیصر کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ گھر کے لوگ اس کی غیر حاضری کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

''میرے پاس کچھ رقم ہے بیٹا۔۔ تھوڑی تم مدد کر دو تو۔۔ میں عمرہ کر آؤں۔۔''

خرم کھانا ختم کرنے کے بعد بھی میز پر ہی بیٹھا رہتا تھا کہ جب تک ماں صاحب کھانا ختم نہ کر لیتیں۔ میز سے واش بیسن کی طرف جاتی شگوفہ کے قدم پل بھر کو ٹھٹھک کر تھم گئے پھر آگے بڑھنے لگے۔ مگر ٹھٹھک کر چلنے کے بعد رفتار غیر ہموار سی ہو گئی تھی۔

''ماں صاحب بھی۔۔''

خرم اندر آیا تو شگوفہ شب خوابی کا لباس پہن کر مسہری کے کنارے پر بیٹھی تھی۔

''ابھی تک سوئیں نہیں۔۔''

خرم نے بات کاٹی اور الماری کی جانب بڑھا۔

''آخر ماں صاحب کیوں نہیں سمجھتیں ہماری پریشانیاں۔۔ کتنے تو لونز لے رکھے ہیں ہم نے بینکوں سے۔۔''

''ہم نے کہاں لئے ہیں۔۔ بینک والوں نے دیے ہیں ہمیں۔۔''

''وہ تو ان کا بزنس ہے۔ ہم منع بھی تو کر سکتے تھے نا۔۔ خیر اب جو بھی ہے۔۔ لونز تو ہیں نا۔۔ اور ادا بھی کرنے ہیں۔۔ باہر کتنا پیسہ بھیجنا ہوتا ہے۔۔ انہیں کوئی۔۔''

''کیوں پریشان ہوتی ہو۔۔ یہ معمولی باتیں ہیں۔۔ ماں صاحب کوئی غیر تو ہیں نہیں۔۔ ان ہی کی دعاؤں کے طفیل گھر پھل پھول رہا ہے۔۔ جو ہے سب ان کا ہی تو ہے۔۔''

''وہ مگر ہماری ضروریات سے بھی تو واقف ہیں۔۔''

''تو انہوں نے ایسی کون سی بے پروائی دکھائی ہے۔۔ایک ہی تو شوق ہے ان کا۔۔اور پھر ان کے پاس ہیں پیسے اپنے بھی۔۔میں وہ خرچ نہیں کرنا چاہتا۔۔''

''ہاں جیسے وہ صرف خود پر خرچ کرنا چاہتی ہیں۔۔''

''ایسی کوئی بڑی رقم نہیں ہوگی ان کے پاس۔۔تم بھی۔۔اور اگر ہو بھی تو وہ سب ان کا ہے۔۔مجھے اتنی بھی سعادت نصیب نہ ہوگی کہ جس ماں نے ہر حال میں گھر کا وقار قائم رکھا۔۔ہمیں خودداری سے جینا سکھایا۔۔کتنی خوش اسلوبی سے ذمہ داریاں نبھائیں۔۔میں ان کے لیے اتنا سا کرلوں۔۔ہمارے لئے کیا نہیں کیا انہوں نے۔۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک کہتے ہیں آپ۔۔مگر ایک۔تھوڑا سا کنسرن ہوتا ہے اپنوں کی طرف۔۔انہیں تو جیسے اور کچھ۔۔''

شگوفہ نے اپنی طرف والی میز کی بتی گل کردی۔

''ایسا نہیں ہے۔تمہارا ردِعمل زیادہ شدید ہے۔وہ بہت کنسرنڈ ہیں اپنی فیملی کے ساتھ۔۔اور کون ہے ان کا ہمارے علاوہ۔۔''

خرم بولتے بولتے غسل خانے کی طرف بڑھا تو شگوفہ کی آواز کانوں میں پڑی۔

''اچھا پھر صحت ان کی دیکھیئے۔۔ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگی ہیں۔۔نظر آتا نہیں اچھی طرح۔۔دانت بھی جو بچے ہیں جھول رہے ہیں کیا کھائیں گی۔۔کیسے کریں گی۔۔ہم تو ان کے کھانے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔۔''

''اللہ مالک ہے۔۔وہاں سب ملتا ہے۔۔پھر وہ اپنی صحت کا خیال رکھنا ہم سے بہتر جانتی ہیں۔۔''

وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

اس بار ماں صاحب نے خود ہی محرم تلاش کرلیا۔انہیں رشتے دار تقریبات میں بڑے اہتمام سے بلاتے لے جاتے تھے۔

''نادرہ کی بیٹی اپنے شوہر کے پاس سعودیہ جارہی ہے۔اسی کے ساتھ جاؤں گی

میں ۔۔اور پھر وہ بھی ساتھ ہوگا۔۔اس کا شوہر۔۔عمرہ کے وقت۔۔''

ماں صاحب نے ناشتے کی میز پر گویا خوشخبری سنائی۔

شگوفہ ملازم کو دو پہر کے کھانے کیلئے سمجھا رہی تھی۔

''ظفر دودھ لے آؤ ماں صاحب کیلئے۔۔پہلے۔۔''

خرم نے گردن موڑ کر کہا۔

''چھ مہینے تک رہے گی وہ وہاں۔۔''

ماں صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''کون نادرہ کی بیٹی۔۔اور آپ۔۔''

شگوفہ نے مڑ کر دیکھا۔

''میں جلدی آجاؤں گی انشااللہ۔۔رمضان کے فوراً بعد۔۔''

''رمضان میں بڑی بھیڑ ہوگی وہاں ماں صاحب۔۔''

شگوفہ نے پھر گردن موڑی۔

''تو میں کون سا کسی غیر کے ساتھ ہوں گی۔۔نادرہ کی بیٹی ساتھ ہوگی۔۔''

''نادرہ کی بیٹی کا نام کیا ہے ماں صاحب۔۔''

''شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا تو خرم جلدی سے بولا۔

''اس کا نام نادرہ کی بیٹی ہے۔۔''

وہ زور سے ہنسا تو سب کی ہنسی میں برابر میں باورچی خانے کے اندر سے ظفر کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ماں صاحب مسکرائیں۔

''سچ مچ مجھے پتہ ہی نہیں۔۔میری بھانجی کی نند کی بیٹی ہے۔۔وہاں سب اس کا ذکر اسی نام سے کرتے ہیں۔۔تو میں۔۔''

''فون پر پوچھتی ہوں ابھی ماں صاحب۔۔آپ فکر نہ کریں۔۔''

سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔حج کے بعد سے ماں صاحب اپنا طواف والا

لباس ساتھ رکھا کرتیں تھیں۔ کہتیں بلاوا آئے گا تو اسی میں دفن ہونا ہے مجھے۔ میری وصیت ہے یہ۔ پہلا عمرہ بھی اسی میں ادا کیا۔ اس دفعہ بھی ہی یہ لباس ان کے ساتھ تھا۔

کچھ دن بعد ماں صاحب نادرہ کی بیٹی کے ساتھ خیر خیریت سے سعودیہ پہنچ گئیں۔ فون پر بات ہوئی تو خوش تھیں کہ صبح زیارت کے لیے جارہی ہیں۔ دو دن بعد بات ہوئی تو آواز میں نقاہت صاف نمایاں تھی۔

''میں۔۔جلدی آؤں گی بیٹا۔۔ اگلے بدھ کی فلائٹ ہے۔۔''

ماں صاحب نے رک رک کر کہا۔

''مگر آپ۔۔خیریت سے تو ہیں نا ماں صاحب۔۔''

خرم کی تشویش بھری آواز ابھری۔

''ہاں۔۔ٹھیک ہوں میں۔۔آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔۔''

ماں صاحب کی آواز میں عجب یاسیت تھی۔

''پھر اتنی کمزور کیوں معلوم ہو رہی ہیں۔۔''

خرم کو خیال آیا کہ ماں صاحب اداس بھی ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس دفعہ بھی ان کی دلی آرزو پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ زندہ لوٹنا نہیں چاہتی تھیں وہاں سے۔

''ٹھیک ہوں بیٹے۔۔''

''ماں صاحب بتائیے نا کیا ہوا۔۔؟''

فون کے سپیکرس آن تھے۔ شگوفہ نے جلدی سے پوچھا۔

''میں۔۔میں گر گئی تھی۔۔''

ماں صاحب کی آواز میں آنسوں شامل ہو گئے۔

''کب کیسے۔۔چوٹ تو۔۔کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔۔میں۔۔''

خرم کی بے قرار آواز ابھری تو دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز آئی۔

''نہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔۔ذرا سا کلائی پر زور پڑا ہے۔۔''

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ نادرہ کی بیٹی کے شوہر ہونگے۔۔''

شگوفہ نے آہستہ سے شوہر سے کہا۔

''کوئی فریکچر تو نہیں ہے نا۔۔وہ تو درد میں بری طرح مبتلا معلوم ہوتی ہیں۔۔''

خرم نے تشویش سے پوچھا تو اس آدمی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ارے نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔۔ ہم نے ڈاکٹر کو دکھا دیا ہے۔۔ ایکسرے بھی ہو گیا ہے۔ٹکٹ بھی ہو گیا ہے ان کا۔۔لیجئے بات کیجئے۔۔''

''کچھ نہیں بس۔۔سوجن ہے کلائی پر بہت۔۔اسی لئے درد ہو رہا ہے زیادہ۔۔ نادرہ کی بیٹی نے بڑا خیال رکھا۔۔لو بات کرو۔۔''

''میں نے خود ٹکٹ بک کروایا ہے ان کا۔۔ آپ بس وقت سے انہیں لینے آجایئے گا۔۔پھر تسلی سے ڈاکٹر کو دکھایئے گا۔۔اوکے۔۔''

''جی۔۔''

نادرہ کی بیٹی کا شوہر بولا۔

''چلئے تو پھر خدا حافظ۔۔''

''جی اچھا خدا حافظ۔۔''

ائیر پورٹ پر دیکھا تو ماں صاحب آدھی رہ گئی تھیں۔اور درد کو بڑے ضبط سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔خرم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایئر لائنز کی خوبصورت وردی میں ملبوس ایک دبلا سا نوجوان ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر آدمی کو وھیل چیئر پر بٹھائے اسی طرف آرہا تھا۔خرم نے جلدی سے ماں صاحب کی جانب گردن موڑی۔ ماں صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چل رہی تھیں۔اس نے لپک کر بازو تھام لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی خرم نے ماں صاحب کی ایکسرے رپورٹ دیکھی۔ ماں

صاحب کی کلائی کی دو ہڈیوں میں سے بڑی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایکسرے میں صاف نظر آتا تھا۔یعنی اس کو بھی جوڑا کٹر نہ ہو۔خرم کو پھر تشویش نے گھیر لیا۔وہ انہیں ائیر پورٹ سے گھر لانے سے پہلے ہسپتال لے گیا۔وزن میں نسبتاً نہایت ہلکا، عمدہ قسم کا پلستر کروایا گیا اور درد کی گولیاں دی گئیں۔

ماں صاحب تڑپتی کراہتیں سی گھر پہنچیں، اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی سیدھا وضو کرنے چلی گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد کمرے سے ان کی سسکیاں باہر سنائی دینے لگی۔ خرم کچھ مزید طاقت کی دواؤں کے لیے باہر گیا تھا کہ کسی مصدقہ وسیلے سے دوا آئے اور کہیں نقلی نہ ہو کہ نقلی دواؤں کا خفیہ چلن سا چل نکلا تھا۔شگوفہ ان کے دروازے تک جا کر لوٹ آئی۔ ماں صاحب بلک بلک کر رو رہی تھیں اور بزعم خود چھپ کر رو رہی تھیں۔ وہ ان کا بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔مگر جب تک ان کے رونے کی آواز آئی وہ بے قرار سی آس پاس ہی رہی۔

ماں صاحب ک روز وشب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نہ عبادت میں نہ کھانے پینے کے معمول میں۔کبھی کبھار ان کی کوئی کراہ کانوں میں پڑتی کہ گلے میں لٹکے بازو کے بوجھ سے کمزور سے شانے کا جوڑ دکھنے لگتا تھا۔

پلستر اترا تو ہڈی کچھ ٹیڑھی جڑی تھی۔ ہاتھ، کلائی سے پیچھے کی طرف بالکل نہ جاتا تھا۔کلائی کا قدرتی خم تبدیل سا ہو گیا تھا۔انگلیوں کے درمیانی جوڑ مستقل طور پر خمیدہ رہتے تھے۔طبی اصطلاح میں اس طرح کے جوڑ کو کھانا کھانے والے کانٹے کی شکل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

مگر ماں صاحب کو اس کا کوئی ملال نہ تھا۔ البتہ ہاتھ کی آزادانہ جنبش سے محرومی سے پریشان سی ہو جاتیں۔ درد بھی رہتا تھا۔ ہاتھ کو گرم نمکین پانی سے دھوتیں۔اس پر زیتون کے تیل سے مالش کرتیں۔ پھر ذرا راحت ہوتی تو مطمئن سی نظر آتیں۔خرم دیکھتا تو اداس ہو جاتا۔ ماں صاحب کے بال بکھرے بکھرے رہتے تھے۔ چوٹی بنانے کیلئے دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ماں صاحب کا ایک ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کرتا تھا۔خرم دفتر جاتے

وقت اجازت لینے گیا تھا تو ان کے پاس سے گل یاسمین کی وہ مہک بھی نہیں آ رہی تھی جوان کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوا کرتی تھی۔ جس کے بارے میں ماں صاحب نے برسوں پہلے کہا تھا کہ پہلی بار خرم کے ابو نے ان کیلئے یہ عطر ایران سے لایا تھا۔ ابو کے تعلق سے ماں صاحب کی واحد مثبت یاد۔ خرم اور شگوفہ بھی ان کیلئے یہ خوشبو لایا کرتے۔ اب ان سے عطر کی شیشی نہیں کھلتی ہوگی۔ خرم سوچتا۔

''ماں صاحب کے بال بکھرے دیکھتا ہوں تو دل دکھنے لگ جاتا ہے۔''

اس نے شام کی چائے کے دوران برآمدے سے باہر کی طرف جانے کہاں دیکھ کر کہا تھا۔

''وقت ہی نہیں ملتا مجھے۔ ان کے ہمیشہ سجے سجائے بال دیکھ کر مجھے بھی برا لگتا ہے۔ جب میں آتی ہوں اس وقت وہ مغرب میں مصروف ہوتی ہیں۔ پھر عشاء کی نماز تک جانماز پر ہی رہتی ہیں۔ صبح فجر کے بعد سے بہت دیر تک جانماز پر ہوتی ہیں۔ پھر کچھ وقت آرام کرتی ہیں۔ ادھر میرے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ ہفتے کو ہی کہیں وقت مل پاتا ہے مجھے۔ جب جا کر کہیں کر پاتی ہوں یہ سب تھوڑا بہت۔۔''

شگوفہ بھی باہر درختوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ہاں۔۔ وہ تو ان کا معمول ہی رہا ہے ساری زندگی۔۔''

''الگ گلٹی فیل ہوتا رہتا ہے کہ مجھ سے کہیں کوتاہی تو نہیں ہوئی۔۔ یہ ہی سوچتی رہتی ہوں۔۔''

''نہیں تم ایسے مت سوچو۔۔ اپنی طرف سے تو۔۔''

''نہیں۔۔ سب سے پہلے نادرہ کی بیٹی کے ساتھ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔؟''

''تو پھر کس کے ساتھ جاتیں۔۔ تم بھی حد کرتی ہو شگوفہ۔۔''

جانے کی ہی کیا ضرورت تھی خرم۔۔ حج بھی کر لیا تھا۔۔ عمرہ بھی۔۔ پھر ایک اور عمرہ کیا ایسا ہی ضروری تھا۔۔ بس ایک ضد سی پکڑ لیتی ہیں بچوں کی طرح۔۔''

''ضد نہیں ہے یہ۔۔بس وہاں مرنے کی دعا مانگتی ہیں۔۔اور اسی لئے لوٹ کر بہت دنوں تک اداس رہتی ہیں۔۔''

''یہ بھی تو ایک طرح کی ضد ہے۔۔خدا انہیں حیات عطا کرے۔۔کون جانتا ہے اپنا وقت۔۔کہ کب جانے ہے۔۔اور۔۔''

''چلو چھوڑو شکر ہے خیریت سے گھر تو پہنچ گئیں۔۔ورنہ۔۔''

''کیا خیریت۔۔زخمی اور اپاہج کر کے بھیجا ہے نادرہ کی بیٹی نے انہیں۔۔اور بجائے پلستر لگوانے کے ٹوٹی ہڈی لئے درد سے بلکتی ہوئی حالت میں روانہ کیا۔۔بے رحموں نے۔۔کتنا درد ہوتا ہوگا۔۔اب خود ٹھیک سے نہاتی دھوتی نہیں۔۔چڑ چڑی سی ہوگئی ہیں۔۔''

''انہوں نے زندگی کے ہر سٹیج پر وقار سے جینا سکھایا ہے ہمیں۔۔ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ۔۔''

''کر تو رہے ہیں۔۔بس مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ بھانجی کی نند کی بیٹی کے شوہر کے سہارے گئیں اور کلائی تڑوالی۔۔''

''بس اب بھول بھی چکو یہ سب۔۔سب ٹھیک ہوگا انشا اللہ۔۔''

''ہاں۔۔انشا اللہ۔۔''

ماں صاحب کو مٹھی بند کرنے اور کھولنے کے قابل ہونے میں سال بھر وقت لگ گیا۔ان کا سراپا سکڑ سا گیا تھا۔جسم کی تمام ہڈیوں کی ساخت چھوٹی ہوتی جارہی تھی۔ان کا قد شگوفہ کے برابر ہوا کرتا تھا۔اب کم ہو گیا تھا۔

ماں صاحب پچاسی کے قریب ہوگئی تھیں۔اب ان کی غذا ذرا زیادہ ہوجاتی تو طبیعت خراب ہونے لگتی۔کبھی ایک چیز موافق آتی تو کبھی دوسری۔ادھر ایک منفی بات یہ ہوئی تھی کہ جس چیز سے انہیں کچھ فائدہ ہوتا، اس کے کم پڑ جانے کی صورت میں انہیں شک گزرنے لگتا کہ گھر کا ملازم بھی کھاتا ہے اور ان کی شکایت وہ وقتاً فوقتاً شگوفہ سے کرتیں۔دو ملازم اسی سبب نوکری چھوڑ گئے تھے جن میں سے ایک ظفر بھی تھا۔بڑی مشکل سے شگوفہ نے

نئے ملازم کا انتظام کیا تھا۔ یہ باتیں خرم سے کہنے میں اور الجھن ہوتی تھی کہ تھوڑا سا تناؤ بٹ بھی جاتا پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا کہ ماں صاحب اب باتیں بار بار بھولنے لگی تھیں، اور اس فراموشی میں کبھی کبھی کھانا پینا بھی شامل ہو جاتا۔ شگوفہ نے پریشانی سے سوچا۔ اس پریشانی میں دکھ کی آمیزش بھی تھی۔

اس دن شگوفہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی کہ شادی کا البم سامنے آ گیا۔ ہرے لباس اور ہلکے ہلکے زیورات میں ماں صاحب سرخ جوڑے میں لپٹی بھاری زیوروں سے سجی شگوفہ سے کچھ کم حسین نہیں لگ رہی تھیں۔ بلکہ کسی کسی تصویر میں اس سے کم عمر اور اس سے زیادہ جاذب بھی۔

کبھی ماں صاحب بھی چھوٹی سی لڑکی ہوں گی۔ پھر بڑی ہو گئیں اور بدلتی گئیں۔ جیسے لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔ بدل دی جاتی ہیں۔ بدلتے حالات انہیں بدل دیتے ہیں۔

شگوفہ کی نظریں تصویر میں اپنے مہندی رچے پیروں سے ہوتی ہوئی ادھ کھلے گھونگھٹ تک چلی گئیں۔ جسے ماں صاحب مہندی رچے ہاتھوں سے کھول رہی ہیں۔ شگوفہ کا چہرہ رو رو کر کچھ سوج بھی گیا ہے مگر میک اپ نہیں اترا ہے۔

کیسے بابل کا گھر چھوٹ گیا تھا اچانک۔

اسے اچانک شدت سے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ اس گھر میں اب کوئی نہیں رہتا تھا۔ بھائی کسی دوسرے ملک کا شہری ہو گیا تھا۔ دو چار برس میں کہیں ایک آدھ چکر لگا تا تھا۔ اس نے وہاں ایک چوکیدار رکھ چھوڑا تھا جس نے باغیچے کے کونے میں ایک کٹیا سی بنا رکھی تھی، اور مکان رفتہ رفتہ بوسیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سسکیاں لے کر رو دی۔ کسی پرانی فلم کا گانا شگوفہ کے ذہن میں گونج گیا۔

اب کے برس بھیج بھیا کو بابل۔۔ ساون میں لیجو بلائے۔

آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے نظریں ماں صاحب کی تصویر پر مرکوز کر دیں۔

ہونٹوں کو داہنی جانب خم دے کر مسکراتی ماں صاحب موجود بیبیوں کی جانب فخر سے دیکھ رہی ہیں گویا کہتی ہوں کہ دیکھو میری پسند۔ ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں کی چمکتی پتلیوں کے نیچے ذرا سے خم کھائے نتھنے میں جگ مگ کرتی لونگ بھی مسکرا رہی تھی۔ شگوفہ کے ذہن میں ماں صاحب کا موجودہ سراپا گھوم گیا۔ تصویر میں چہرے کے حسن کو دوبالا کرنے والی مسکراہٹ سے پیدا ہونے والی حسین قوس اب گہری جھری بن کر، جبڑے کے سکڑنے اور دانتوں سے سہارا ٹوٹ جانے کے سبب لٹکتے ہونٹوں کو اور نیچے لٹکاتی چہرے کا سب سے زیادہ غیر جاذب حصہ معلوم ہوتی تھی۔ تصویر کے مہندی رچے ہاتھوں میں اب بے شمار چھوٹی بڑی نسیں ابھر ابھر کر وقت کے اپنی رفتار سے چل کر خاموش ستم برپا کرنے کی بے رحم داستاں سنا رہی تھیں۔ تصویر میں پہنے کلائیوں میں پھنسے جا رہے بڑے بڑے دو منقش کڑے اب وضو کے وقت ہاتھ اوپر تک دھوتے ہوئے ماں صاحب کی کہنیوں تک جا کر چپ چاپ لوٹ آتے ہیں۔ پتلیوں کی چمک برسوں پہلے کھو گئی تھی۔ بلکہ داہنی آنکھ کے آپریشن کے بعد سے اس پتلی پر ماں صاحب کی آنکھوں کے کمزور پٹھے اپنا قابو کافی حد تک گنوا بیٹھے تھے اور صحت مند آنکھوں میں کتھک کی ہم رکاب رقاصاؤں کی طرح مشترکہ رخ پر تھرکنے والی پتلیاں اب بھینگی ہو گئی تھیں۔ دہائیوں سے نتھنے میں پڑی مکئی کے دانے جتنی بڑی لونگ کے بوجھ سے نیم بند سا ہو رہا نتھنا اب ان کی شناخت بن گیا تھا۔ چہرے پر رفتہ رفتہ بنتی ہوئی جھریاں اب گہرا گئی تھیں۔ ان سے پیدا ہونے والی سلوٹوں میں بھی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ رخساروں کی چربی ختم ہونے سے ڈھیلی پڑنے والی جلد نے ناک کو سہارا دینا چھوڑ دیا تھا اور ناک ہونٹوں کی طرف جھک آئی تھی۔ دانتوں کے غائب ہونے سے مسکراتے وقت ہونٹ دہانے کے اندر گم ہو جاتے تھے اور ناک اور ٹھوری کے درمیان کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔

شگوفہ نے ایک گہری سانس لی۔

ایسا ہر سن رسیدہ چہرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لئے بڑھاپے میں لوگوں کی شکلیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں۔ گو کہ ماں صاحب کے صاف رنگ اور دبلے سے سراپے کے

ساتھ اب بھی ایک الگ طرح کی خوبصورتی اور ایک مخصوص سا وقار جڑا تھا۔ مگر تصویر والی ماں صاحب اور اس وقت کی ماں صاحب دو الگ انسان معلوم ہوتیں تھیں۔

اس خیال کے آتے ہی شگوفہ البم سے نظریں ہٹا کر ذرا پیچھے کو جھکی کہ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے ہو جائے مگر اسے اپنا چہرہ پورا دکھائی نہیں دیا۔

اب کے برس بھیج۔۔ ساون میں لیجو۔۔

وہ دوبارہ تصویروں کی طرف پلٹ آئی کہ بھاری بھرکم بدن سے اٹھ کر آئینہ دیکھنا اتنا ضروری نہ تھا اور دوسرے آئینہ دیکھنے کا خیال بھی کہیں لاشعوری طور پر ابھر اڈوبا تھا۔

کیوں ہوتا ہے انسان بوڑھا۔

وہ تصویریں پلٹتی رہی۔

اور کیوں بڑھ جاتا ہے اس کا وزن۔

اس کے سامنے ایک اور تصویر کھل گئی جس میں وہ خرم کے ساتھ کھڑی کیمرے میں دیکھ رہی ہے۔ زندگی سے لبریز آنکھوں میں مستقبل کی متوقع مسرتیں لئے اپنے حسن اور کھڑے رہنے والے باوقار انداز سے مکمل واقف۔

زندگی گزارنے میں ہر طرح کے ضابطوں کی پابند ماں صاحب، جب بدل کر ایسی نظر آسکتی ہیں تو شگوفہ ایسے لاپروا لوگ کیسے لگیں گے۔

وہ پھر آئینے کی جانب جھکی۔ اس وقت بھی اسے اپنا آدھا ہی چہرہ نظر آیا۔ وہ جلدی جلدی البم پلٹنے لگی۔ ماں صاحب کی اور بھی کئی تصویریں تھیں۔ خرم کے دیو قامت والد کے ساتھ۔ چھوٹے سے خرم کے ساتھ۔ جوان خرم کے ساتھ، اور خود شگوفہ اور خرم کے بچوں کے ساتھ۔ ادھیڑ ہو رہے بیٹے بہو کے ساتھ ماہم کی شادی کی تصویریں۔ حج کی تصویریں اور عمرہ کی۔

ماں صاحب دھیرے دھیرے بالکل بدل گئی تھیں۔ نہیں بدلا تھا تو ان کے روز و شب کا معمول۔ باغیچے میں کچھ کام۔ مگر پہلے سے کچھ ہلکا۔

عبادت پہلے سے ہی انداز میں ہوتی۔ یعنی شگوفہ کی طرح بیٹھ کر نہیں۔ ہمیشہ کی طرح

کھڑے ہو کر اور باقاعدہ رکوع میں جھکنا، دوزانو بیٹھنا بھی ویسے ہی یعنی سب پہلے کی طرح۔

اب ماں صاحب بچہ سی ہو گئی تھیں۔ بچے کی طرح ناراض اور روٹھنے اور پھر مان جانے والی۔ گویا وہ ایک ضعیف بچہ ہوں اور یہ بات بھی اب گھر کے سب لوگوں کے سمجھنے کی تھی۔ اب وہ جو بات کرتیں عام طور پر ان کی اپنی ہی ضرورت کی ہوا کرتی۔ خوراک، دوائی یا شکایت۔ چھوٹے بچے کی طرح۔ خرم کا مگر اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا کبھی۔ وہ اپنا فرض نبھانے میں خوش ہوتا تھا۔ خود شگوفہ اسے ان کا بزرگانہ بچپن جان کر خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کرتی۔

اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

''ماں صاحب کتنی سیلفش ہو گئی ہیں ماما۔۔''

قیصر نے ماں صاحب کا جملہ سن لیا تھا کہ وہ ابھی بچہ ہے اور انہیں اس کی ٹریننگ سے زیادہ اپنے تیسرے عمرہ کی فکر ہے۔

بھاری بدن کا داہنے بائیں جھکتا توازن سنبھالے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی شگوفہ کے پیچھے پیچھے ہفتہ بھر پہلے لوٹا قیصر بھی کمرے کے اندر داخل ہوا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے بیٹا۔۔''

شگوفہ مسہری کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

''تو پھر کیسا ہے مام۔۔ سنا نہیں ابھی کی کہہ رہی تھیں ڈیڈ سے۔۔ اب اگر عمرہ کا پروگرام بنا تو میرا تو سال برباد ہو گیا نا۔۔ آئی نیڈ منی ماما۔۔ میں ڈیڈ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔۔ ایک سکالر شپ تو مجھے ملے گا ہی۔۔ پوار ڈیڈ۔۔ پہلے سے انہوں نے لونز لے رکھے ہیں۔۔ اور پھر کچھ سیونگ بھی تو چاہئے نا۔۔ ریٹائر بھی ہونے والے ہیں۔۔''

تم اس کی فکر مت کرو۔۔ وہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہو رہا ہے۔۔ اور نہیں ہوگا تمہارا سال برباد، انشا اللہ۔۔ دوسرا وظیفہ بھی میرے ذہین بچے کو ہی ملے گا۔۔''

''مگر اب ماں صاحب کو کتنے عمرہ کرنے ہیں ماما۔۔ یہ تو کوئی حکم نہیں۔ یہ کیسی

عبادت ہے۔۔''

''ایسا نہیں کہتے بیٹا۔۔ پھر انہوں نے کیا نہیں کیا ہم لوگوں کیلئے۔۔ وہ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔۔ ہم اپنے ہیں ان کے۔۔ کتنے دن رہتے ہیں بزرگ زندہ۔۔''

''کتنے دن۔۔؟۔۔ اتنی ہیلدی ہیں وہ اپنی عمر کے لحاظ سے۔۔ ہر چیز میں ڈسپلنڈ۔۔ بوڑھے تو آپ اور ڈیڈ لگتے ہیں۔۔ شی از ابسلیوٹلی فٹ۔۔ اینڈ آئی اپریسیٹ دیٹ آف کورس۔۔ کوئین مدر کی طرح۔ فیڈل کاسترو کی طرح۔۔ وقت کو پیچھے چھوڑنے والی۔ وہ تو اچھا ہے۔۔ مگر ایسے میں تو لوگ خود گدیوں تک سے دست بردار ہو جایا کرتے ہیں چھوٹوں کی ضروریات اور خوشیوں کا خیال کر کے سب ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔۔ مگر ان کے شوق ہی ختم نہیں ہوتے۔۔''

''یہ شوق نہیں ہے بیٹا۔۔ وہ ایک بچے کی طرح ہو گئی ہیں۔۔''

''ہاں صرف اپنی پڑی رہتی ہے انہیں ہر وقت۔۔ بالکل چینج ہو گئی ہیں، آئی کانٹ بلیو کہ یہ وہ ہی ماں صاحب ہیں جو ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں۔۔ اب تو انہیں ہماری فکر ہی نہیں۔۔''

''اب بھی پیار کرتی ہیں بیٹا۔۔ یہ سب بڑھتی عمر کے سبب ہے۔۔''

''خاک پیار کرتی ہیں۔۔ آپ کو ان کا اٹچوڑ برا نہیں لگتا۔۔؟''

''لگتا ہے کبھی کبھی۔۔ مگر پھر سوچتی ہوں کہ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور کتنے دن جئیں گی۔۔ کوئی حسرت نہ رہ جائے۔۔''

''حسرت۔۔؟۔۔ یہ ہر سال عمرہ کریں گی۔۔ حج کو جائیں گی اور کبھی ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہوگی۔۔ کچھ jealous سی بھی ہو گئی ہیں۔۔ اگر انہیں کوئی چیز نہیں چاہئے تو اس کو کریٹسائز کرتی ہیں۔۔''

قیصر نے اپنا سر جھٹکا۔ شگوفہ اس کے بالوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ صحت مند بال لہرائے تھے تو ایک ایک بال ہوا میں الگ الگ اڑتا نظر آیا تھا۔

''نہیں بیٹا۔۔ ایسا کچھ نہیں۔۔شی از لائیک اے چائلڈ۔۔ جسٹ اے چائلڈ۔۔''

''ماما۔۔آپ بچہ نہ کہئے انہیں۔۔ یہ لوگ بڑے پریکٹیکل اور میٹر آف فیکٹ ہو جاتے ہیں۔۔وہاں ایک گرینڈ مدر نے اپنی پوتی کا مرڈر کروادیا تھا پتہ ہے۔۔؟''

''ری اے لی۔۔''

''ہاں ماما۔۔وہ جاب کرتی تھی تو ان کے پاس اپنے پیسے جمع رکھا کرتی تھی۔اس نے اپنی شادی کیلئے وہ پیسہ ان سے مانگے تو انہوں نے نہیں دیے۔۔جھگڑا ہوا لڑکی نے دادی کو پیٹ دیا۔۔''

''ہاتھ اٹھایا دادی پر۔۔؟''

''جی ہاں۔۔اور پھر دادی نے کسی سے اس کو قتل کروادیا۔۔''

''گڈ گاڈ۔۔مگر۔۔ایسا کیسے ممکن ہے۔۔؟''

''اٹ از ٹرو مام۔۔اور پھر یہ نہیں کہ سیلف ڈیفینس میں مارا ہو۔۔جیسے لڑکی نے اٹیک کیا ہو تو انہوں نے اپنے بچاؤ میں یہ فوری قدم اٹھالیا ہو بے سوچے سمجھے۔۔شی پلینڈ اٹ لائیک اے کریمنل۔۔باقاعدہ منصوبہ بنا کر۔۔آپ سوچ سکتی ہیں۔۔؟''

''نہیں۔۔ہاں۔۔یہ تو باقاعدہ کسی مجرم کی طرح۔۔کیا پتہ لڑکی نے اس وقت کہا ہو کہ وہ اس کی جان لے لے گی۔۔جو ہاتھ اٹھا سکتی ہے۔۔جانے کیسی ہو وہ۔۔کیسی تربیت ہو اس کی۔۔دادی ڈر گئی ہوگی کہ اگر وہ اسے نہیں مارے گی تو لڑکی اسی کی جان لے لے گی۔مگر پھر بھی جان سے مارنے کا کیسے سوچ سکتا ہے کوئی۔۔اور اپنی اولاد کو ہی۔۔کیا پتہ دادی پہلے سے ہی ایسے کام کرتی ہو اور پکڑی نہ گئی ہو۔۔یا سزا کاٹ چکی ہو۔۔مگر اپنی پوتی۔۔''

''وہی تو ماما۔۔اس ایج میں انسان اگر اپنے دماغ اور جسم کو ایکٹو نہ رکھے تو بہت لیزی ہو جاتا ہے۔۔اور دوسروں پر ڈپینڈنٹ ہونے کی وجہ سے صرف اپنے ہی بارے میں

سوچتا رہتا ہے۔۔اسے بس اپنی ہی فکر ہوتی ہے۔۔اور پھر وہ دوسروں سے لاتعلق۔۔اور شدید معاملات میں اتنا خودغرض ہو جاتا ہے کہ جان تک لے سکتا ہے کسی کی۔۔"

"نہیں تم سب کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔۔یہ انسان کی بچپن کی تربیت پر منحصر ہے۔۔چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا ہو۔۔ناراض ہوگا۔۔عاق کردے گا۔۔مگر جان صرف وہی لے سکتا ہے جو اسی نیچر کا ہو۔۔تخت کیلئے لوگوں نے کیا قتل نہیں کروائے۔۔؟ باپ کا قتل کروادیا۔۔بھائی کو مارڈالا۔۔اب بھی کرسی کیلئے قتل ہوتے ہیں۔۔وہ تو الگ معاملہ ہے۔۔اور پھر وہ جرائم پیشہ ذہنیت ہوتی ہے۔۔کریمنل لوگوں کی بات تو الگ ہے۔۔"

"مگر اس ایج کا انسان۔۔ایک بزرگ۔۔؟"

"کیا معلوم اس کی نفسیاتی حالت کیا رہی ہوگی۔۔اس عمر میں ذہن کو اگر بیدار نہ رکھا جائے تو degeneration کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے۔۔پھر اس کا بلڈ پریشر زیادہ ہو۔۔اور کوئی بیماری ہو۔۔یادداشت بھی متاثر ہوتی ہے۔۔اور لیزی ہو جانے والا آدمی اس عمر میں کچھ زیادہ بھولنے لگتا ہے۔۔کئی فیکٹرس ہو سکتے ہیں بیٹا۔۔"

"ہاں یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔"

"پھر بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔۔بچوں کو بھی تو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔۔بھوک لگے تو روتے ہیں۔۔پیٹ بھرے تو ہنستے ہیں۔۔کھلونا نہ ملے تو روٹھ جاتے ہیں۔۔مل جائے تو مان جاتے ہیں۔ان کی ان اداؤں پر ہمیں پیار آتا ہے۔۔اور بوڑھوں پر غصہ۔۔جنہوں نے ہماری انہی اداؤں پر ہمیں کبھی کتنا پیار کیا ہوگا۔۔ہم یہ بھول جاتے ہیں۔۔"

اس نے قیصر کے ماتھے پر آرہے بال پیچھے کو سنوارے۔

"شکر ہے کہ اس عمر میں اپنے ہاتھ پیر استعمال کر پاتی ہیں۔۔نہیں تو سوچو ہمیں ہی کتنی پریشانی ہوتی۔۔ہے نا۔۔ہم اولڈ ہومز میں رکھنے والے لوگ تو ہیں نہیں۔۔"

''جی مام۔۔وہ تو ہے۔۔مگر۔۔''

''مگر کچھ نہیں بیٹا۔۔سب ٹھیک ہوگا۔۔چلو۔۔تمہاری پسند کے اچار کیلئے انہوں نے بہت سے سبزیاں منگوائی ہیں۔۔ان کے پاس بیٹھتے ہیں۔۔اور ان کی ہیلپ بھی کرتے ہیں۔۔دیکھو ابھی بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہیں۔۔کرنا چاہتی ہیں۔۔انہیں وقت دینا بھی ضروری ہے۔۔شی شڈ ناٹ فیل ان وانٹڈ۔۔اٹس ویرے امپارٹنٹ۔۔''

شگوفہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''او کے مام۔۔بے چاری ماں صاحب۔۔''

قیصر دھیمے سے مسکرایا اور ماں کا بازو تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''چلئے۔۔''

وہ کمرے سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ خرم داخل ہوئے۔کشادہ سی پیشانی پر جو سامنے سے بال اڑنے کے سبب مزید کشادہ نظر آنے لگی تھی، کئی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا ڈیڈ۔۔آپ بھی پریشان ہیں۔۔ہیں نا۔۔؟''

قیصر والد کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا ان کے قریب چلا گیا۔

''میں بھی۔۔مطلب۔۔؟۔۔کہو کہ میں ہی۔۔''

بیٹے کے اس محبت بھرے عمل سے پل بھر میں ماتھے کی شکنیں غائب سی ہو گئیں اور وہ بھی مسکرائے۔

''تم لوگوں نے تو اس وقت ان کا یہ برتاؤ دیکھا ہے نا۔۔میں صبح سے اپ سیٹ ہوں۔۔''

''اپ سیٹ ہونے والی کوئی بات نہیں ہوا کرتی اس عمر کے لوگوں کو لے کر۔۔یہ تو بچے ہو جاتے ہیں۔۔مگر ایسا کیا ہوا۔۔؟''

شگوفہ نے مسکرا کر کہا تو خرم بھی مسکرائے۔

''کتنی ذہین ہو گئی ہیں آپ ہماری کمپنی میں۔۔''

''کیا ہوا تھا ڈیڈ۔۔''

خرم باپ کے جملے سے محظوظ ہو کر مسکرایا۔

''صبح میں اتنے اچھے موڈ میں ان کے پاس اپنا خواب سنانے گیا کہ ہمیشہ سے ہم سب ان سے ہی تعبیریں پوچھتے ہیں کہ اچھی تعبیریں سنا کر دل خوش کر دیتی تھیں۔۔''

''تو۔۔؟''

''تو کچھ نہیں۔۔ میں تو وہی یاد رکھے تھا کہ ماں صاحب کا کہنا ہے کہ کسی ہمدرد کو خواب سنانا چاہیئے کہ سب سے پہلے جو تعبیر کی جاتی ہے۔۔ وہی سچ ہو جاتی ہے۔۔''

''وہ تو ڈیڈا یسے ہی پیار میں کہتی ہوں گی۔۔ ایسا سچ تھوڑی ہوگا۔۔''

''اب جو بھی ہو بیٹا۔۔ میں نے دیکھا کہ علی الصباح کسی نے ایک روپہلی سینی میں بہت سے سرخ سرخ سیب بھیجے ہیں۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ کس نے بھیجے ہیں۔ اور وہ آدمی کہتا ہے آپ کے کسی ہمدرد نے اور چلا جاتا ہے۔ میں خواب میں ہی سوچتا ہوں کہ ماں صاحب کیلئے رکھیں گے کہ اس موسم میں ابھی سیب اتنے سرخ نظر نہیں آتے، اور جا کر کشتی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہوں۔ جاگا تو ماں صاحب کو خواب سنایا کہ کچھ اچھی تعبیر سے کوئی امید بندھوا دیں گی۔ یہ اتنے سارے لونز۔۔ ان بڑے بڑے خرچوں نے تھکا دیا ہے۔ سب نپٹانے میں سال بھر لگ سکتا ہے۔ کچھ دل کا بوجھ ہلکا ہوگا ماں صاحب کی باتوں سے۔ بھلے جھوٹی تسلی ہی صحیح۔ مگر۔۔''

''پھر کیا بولیں ڈیڈ۔۔؟''

''غور سے خواب سنا اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے نہیں۔۔ بڑی سنجیدگی سے۔۔ پھر بولیں کہ میرے تو دانت ہیں نہیں جو سیب کھا سکوں۔۔''

شگوفہ اور قیصر زور سے ہنسے۔

''اور آگے بولیں کہ تعبیر اس کی یہ ہی ہے کہ تم مجھے عمرہ کیلئے لے جاؤ گے اور مسکرانے لگیں۔۔ آئی ونڈر۔۔ وہ شفیق، محبتوں سے بھری۔۔ دوسروں کی خوشی کیلئے اپنی

ضرورت کی قربانی پر تیار ماں صاحب کہاں چلی گئیں۔۔''

''پھر آپ نے کیا کہا ڈیڈ۔۔؟''

قیصر نے آنکھیں پھیلائیں۔

''انہوں نے کیا کہا ہوگا میں بتاتی ہوں مگر پہلے آپ لوگ یہ سمجھ لیجئے کہ ماں صاحب کہیں نہیں گئیں۔۔بس بڑھاپے نے ممتا کو کہیں دبا دیا ہے۔۔جو کبھی کبھی ابھر آتی ہے۔۔ کمزور ہوتا ہوا جان و جسم ہر حال میں اپنا دفاع چاہتا ہے۔۔وہ سمجھتی ہیں کہ ان کے علاوہ سب اپنا خیال رکھ سکتے ہیں۔۔اس میں حیران ہونے والی بات کوئی نہیں۔ڈوبنے والا پانی سے باہر آنے کیلیئے اکثر اسے ہی دھکے دیتا باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے خیال نہیں آتا کہ خود بچانے والا ہی اس کی اس حرکت سے ڈوب سکتا ہے۔۔یا کبھی اگر انسان خطرے میں اچانک گھر جائے تو اس وقت وہ گود کا بچہ پھینک کر جان بچانا چاہتا ہے۔۔اسے کچھ سیکنڈ کے بعد ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بچہ کہاں ہے۔۔جب پھر وہ چلاتا ہے کہ میرا بچہ کہاں ہے اور واپس بھاگتا ہے۔۔یہ ہی بات ایسے معاملوں پر بھی صادق آتی ہے۔۔''

''مگر پھر بھی بھئی۔۔انسان کی کچھ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔۔اپنوں سے۔۔''

''وہ امیدیں آپ کو ایک ایسے انسان سے جس کی عمر پچاسی کے آس پاس ہو رہی ہو، اور جو تھوڑی جسمانی اور زیادہ دماغی کثرت سے، یعنی مینٹل ورک سے نہ جڑ ارہے، نہیں لگانی چاہئے۔۔یہ ان کی نہیں ہماری غلطی ہے۔۔اس عمر میں انسان غیروں سے اولاد جیسی محبت کر سکتا ہے اور ناپسندیدہ اولاد سے نفرت۔یا پھر اسکے اچھے سلوک کی وجہ سے سب بھول بھال کر دوبارہ پہلے سی محبت۔۔ہمیں انہیں صرف اور صرف ایک معصوم بچہ سمجھ لینا چاہئے جو کبھی کبھی اپنے بچپن سے نکل آتا ہو ورنہ اکثر اسی میں رہتا ہو۔۔''

''یہ بھی تم ٹھیک کہتی ہو۔۔''

اب میں بتاتی ہوں آپ نے ماں صاحب سے کیا کہا ہوگا۔۔؟ شگوفہ نے قیصر کی طرف دیکھا۔

''انہوں نے کہا ہوگا۔۔بہت اچھا ماں صاحب۔۔انشا اللہ۔۔ایسا ہی ہوگا۔۔''

شگوفہ مسکرائی۔

''ایسا کہا تھا ڈیڈ۔۔؟''

قیصر ہنسا۔

''ہاں یار یہی کہا۔۔''

خرم نے گردن کاندھے کی طرف خم کی اور مسکرا دیا۔

ماں صاحب

دانش اثری، مئو

اردو فکشن کے قومی منظرنامے پر ترنم ریاض کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ چناروں کی سرزمین کشمیر سے اٹھنے والی یہ آواز اپنے نسائی بیانیے میں نہ صرف منفرد بلکہ کافی بے باک واقع ہوئی ہے۔ مختلف موضوعات پر مختلف انداز سے کہانیوں کے در و دیوار کھڑے کرنا اور قاری کو ان کے درمیان لا کر طلسم ہفت در کا لطف مہیا کرنا ترنم ریاض کو بخوبی آتا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی تانیثیت اور نسائی مسائل کے تئیں ان کی حساسیت ہے۔ بعض بعض مقامات پر ان کا قلم کچھ زیادہ ہی کھردرا ہو جاتا ہے۔ موضوعاتی سطح پر ان کے یہاں تنوع بھی ہے اور انفرادیت بھی، لیکن غالباً تانیثی مکتبہ فکر سے جڑنے کا یہ اثر ہے کہ ان کے یہاں تانیثی کردار نسبتاً زیادہ اور حاوی ہوتے ہیں۔ سماجی فسادات کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں علم ہوگا کہ اس فساد اور بگاڑ میں ہر دو صنف کی شراکت ہوتی ہے، ہاں تناسب مختلف حالات اور ماحول کے لحاظ سے کم زیادہ ہوتا رہتا ہے، لیکن کوئی بھی تخلیق کار جب کسی ایک مکتبہ فکر سے جڑ جاتا ہے تو اپنے منشور کے مدنظر وہ صرف انہی مسائل پر توجہ مرکوز رکھتا ہے، معاملات و مسائل کا دوسرا پہلو اس کی نگاہوں سے یکسر مخفی رہ جاتا ہے۔ ترنم ریاض کی روش عام سے بیزاری اور اپنے انفرادی راستے کی تعین کا احساس تو ناقدین ادب کو پہلے ہی ہو چکا تھا لیکن اس کے اعتراف سے جو چیز مانع رہی

اس کی وضاحت کرتے ہوئے وارث علوی نے لکھا تھا:

''ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھ کر احساس یہی ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہیں لیکن کوئی ناقد یہ شناخت قائم کرتا نظر نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ نقاد کے دل مین ایک خوف سا ہے کہ اگر انہوں نے اس خاتون کو دوسروں سے الگ کیا یا بہتر بتایا تو دوسرے ناراض ہو جائیں گے اسی لئے عافیت اسی میں ہے کہ انہیں ساتھ ساتھ ہی چلنے دو یعنی فہرستی ریوڑ سے الگ نہ کر دو۔ اس رویے سے دوسرے افسانہ نگاروں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن ترنم ریاض کو نقصان ہو جاتا ہے ان کی انفرادیت قائم نہیں ہو پاتی۔''　　　(گنجفہ باز خیال۔ وارث علوی۔ ص۔ ۱۲۱)

یہ بات درست ہے کہ ناقدین فن نے ترنم ریاض کے مقام کی تعیین میں تساہل سے کام لیا ہے، لیکن جب ادب کا تربیت یافتہ قاری ان کے افسانوں اور دیگر تخلیقات سے جڑتا ہے تو اسے تعیین قدر کے لیے کسی ناقد کی رائے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی بلکہ وہ خود ان کے مقام و مرتبہ کی تعیین کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے جن افسانوں کے سبب ان کے فن نے اپنی اہمیت کو تسلیم کرایا ان میں ایک افسانہ ''ماں صاحب'' بھی ہے۔ ''ماں صاحب'' ترنم ریاض کے ایسے ہی افسانوں میں سے ہے جن میں انھوں نے عورت کے مضبوط کردار کو ماں کے وسیلے سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مضبوطی اخلاقی، معاشرتی، نظریاتی اور مذہبی سطحوں پر یکساں نظر آتی ہے۔ جبکہ اسی کے بالمقابل مرد کے کردار بغیر کچھ کہے ہوئے، صرف خدشات کے حوالے سے ضرب لگانے کی کوشش کی ہے۔ دراصل اس افسانے میں ایک طرف تو انھوں نے مردوں کی ظاہر پرستی اور عیش کوشی کے بالمقابل عورت کی ذمہ داری، تحمل اور صبر کو دکھانے کی کوشش کی ہے وہیں ایک عورت کی تربیت اور اس کے فیضان نظر کا جادو بھی جگایا ہے، تیسری سمت میں جہاں ایک مؤنث کردار ذرا سا لڑکھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اسے ماضی کا آئینہ دکھا کر سنبھالا دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش اس بات کو ظاہر

کرتی ہے کہ اگر عورت کہیں ڈگمگاتی بھی ہے تو ماضی و مستقبل کے افکار، یا پھر کوئی چھوٹا موٹا حادثہ ہی اس کے سنبھلنے کے لیے کافی ہوتا ہے جبکہ مرد عموماً ابتداء میں بہت مضبوط نظر آتا ہے لیکن پھر وہ دھیرے دھیرے ٹوٹنے لگتا ہے۔ دراصل یہاں صبر کا توازن تناسب اور اس کی رفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ افسانے کا آغاز جانماز پر بیٹھی تسبیح فاطمہ کا ورد کرتی ماں صاحب سے ہوتا ہے، جو اپنے بیٹے خرم سے تیسرے عمرے پر روانہ ہونے کی خواہش کر رہی ہیں۔ لیکن انھی ایام میں خرم کے بیٹے قیصر کو تعلیمی اخراجات کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت تھی۔ خرم خود قرض میں ڈوبا ہوا تھا، اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ماں کی خواہش کا احترام کرے یا بیٹے کے مستقبل کو اہمیت دے۔ ماں صاحب نے اس مسئلے کا تصفیہ اپنے انداز میں بایں طور کیا:

> ''خدا اس کی عمر دراز کرے بیٹا۔۔ ابھی معصوم بچہ ہے۔۔ اگلے برس چلا جائے گا۔۔ عمر پڑی ہے اس کی۔۔ میں۔۔ میں کتنے دن اور زندہ رہ لوں گی۔۔'' [ص:۱۴۸]

اور خرم نے ہامی بھر لی۔ اس سے قبل بھی جب انھوں نے عمرہ پر جانے کی خواہش ظاہر کی تھی، یا اس سے قبل حج پر جانے کی اس وقت بھی خرم مالی طور پر بہت زیادہ کشادگی کی حالت میں نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے ان کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی بلکہ انتہائی خوش دلی سے ان کے حکم کی تعمیل میں جٹ گیا تھا۔ یہاں بذات خود ماں صاحب کا تربیتی فیضان نظر آتا ہے کہ انھوں نے کس طرح سے اولاد کی تربیت اور پرورش و پرداخت کی تھی کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی بزرگوں کی خواہشوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔

افسانے کی مکمل کہانی سے واقفیت کے لیے کرداروں کا توسط ہی سب سے مناسب راستہ ہے۔ افسانے میں بنیادی طور پر چار کردار متحرک ہیں یعنی ماں صاحب، خرم، شگوفہ اور قیصر۔ ان چار کرداروں کے علاوہ جزوی طور پر کچھ دیگر کردار بھی موجود ہیں خورشید، بیگم خورشید، ثاقب، زیبا اور نادرہ کی بیٹی وغیرہ۔ اگرچہ ان کرداروں کا کہانی سے براہ

راست تعلق نہیں ہے لیکن زیریں سطحوں پر یہی کردار کہانی کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ماں صاحب جو ایک بیوہ ہیں اور بیٹے خرم کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتی ہیں یہاں کہ وہ ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے، شگوفہ ان کی بہو ہے اور بذات خود ایک آفیسر ہے، جبکہ قیصران کا پوتا یعنی خرم اور شگوفہ کا بیٹا ہے۔ کہانی انہی چاروں کے گرد گھومتی ہے۔ خرم کا کردار یہاں بہت زیادہ مضبوط اس لیے نظر نہیں آتا کہ افسانہ نگار نے ابتداء ہی سے اس کی پرورش و پرداخت میں ایک ایسا سلیقہ اور قرینہ دکھایا ہے کہ اس کی تابعداری اور اس کا احساس ذمہ داری صرف اور صرف تربیت کا مرہون منت نظر آنے لگتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ جب شگوفہ ماں صاحب کے مطالبات کافی زچ ہو کر خرم سے شکایت کرتی ہے:

"آخر ماں صاحب کیوں نہیں سمجھتیں ہماری پریشانیاں...... کتنے تو لونز لے رکھے ہیں ہم نے بینکوں سے......" (ص:171)

تو خرم کوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتا نہ ہی ماں صاحب کے مطالبات کا کوئی منطقی جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ایک سیدھے سادے اور فرمانبردار بیٹے کی طرح صرف اتنا کہتا ہے:

"کیوں پریشان ہوتی ہو...... یہ معمولی باتیں ہیں...... ماں صاحب کوئی غیر تو ہیں نہیں...... ان ہی کی دعاؤں کے طفیل گھر پھل پھول رہا ہے...... جو ہے سب ان کا ہی تو ہے۔" (ص:172)

لیکن شگوفہ کا کردار خرم کے مقابلے میں زیادہ مضبوط نظر آتا ہے، کیونکہ وہ جھنجھلاتی ہے، چڑ جاتی ہے، لڑکھڑاتی ہے اور پھر خود سے سنبھلنے کی کوشش کرتی ہے اور جب وہ خود سے سنبھلتی ہے تو پھر ماں صاحب کے ہر عمل کا منطقی جواز اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔ پہلے پہل شگوفہ کے اندر بھی روایتی بہوؤں والی فکر نمو پا رہی تھی اور اسے یہ خیالات آنے لگے تھے کہ ماں صاحب بھولے بھالے بیٹے کی تابع داری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں:

"........... ہاں وہ تو ٹھیک کہتے ہیں آپ..... مگر ایک تھوڑا سا

کنسرن ہوتا ہے اپنوں کی طرف......انھیں تو جیسے اور کچھ......"

(ص:172)

یہاں اگر چہ بگڑتی ہوئی صورت حال کو خرم سنبھال لیتا ہے لیکن شگوفہ کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ چکی تھی کہ ماں صاحب اپنے کنبے کی طرف مرتکز نہیں ہیں بلکہ ان کی ساری توجہ اپنے ذاتی مفادات کی طرف ہے۔ جب خرم نے شگوفہ کو ماں صاحب کے ماضی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی اور پھر کچھ تلاش کرتے ہوئے اسے شادی کا البم ملا اور اس نے تصویروں کے دریچے سے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کی تو اسے اپنا مستقبل نظر آنے لگا۔ اس نے ماں صاحب کے ماضی اور حال کا موازنہ کرنے کے ساتھ ہی اپنے حال اور مستقبل کا موازنہ بھی کیا اور اس وقت اسے احساس ہوا کہ ماں صاحب کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ غیر منطقی یا مفاد پرستی پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری عمل ہے جس سے اسے بھی ایک روز گزرنا ہے اور اس کا گزارہ تو ماں صاحب کے بالمقابل مزید سختی کے ساتھ ہوگا۔ مستقبل کے اس خیال نے اس کے دل میں وسعت پیدا کردی اور پھر اس کے پاس ماں صاحب کے ہر عمل کا منطقی جواز آن موجود ہوا۔ چنانچہ جب قیصر نے ان کے عمل پر اعتراض ظاہر کیا:

"ماں صاحب کتنی سیلفش ہوگئی ہیں ماما......"

تو شگوفہ نے اسے بہت رسان سے سمجھانے کی کوشش کی:

"نہیں ایسا نہیں ہے بیٹا......!"

"تم اس کی فکر مت کرو......وہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہو رہا ہے......اور نہیں ہوگا تمھارا سال برباد ان شاء اللہ......دوسرا وظیفہ بھی میرے ذہین بچے کو ہی ملے گا......" (ص:181)

کہانی وہیں جا کر ختم ہوتی ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی پورا افسانہ فلیش بیک میں چلتا رہا ہے اور انتہاء میں آ کر یہ راز کھلتا ہے کہ دراصل ہم تو یہاں کھڑے

تھے اور پیچھے جو کہانی گزری ہم اس کہانی کے ساتھ نہیں چلے بلکہ وہ کہانی تو پہلے ہی موجودہ صورت حال تک پہنچ چکی تھی۔ تکنیکی سطح سے آگے بڑھ کر کہانی کا موضوع جیسا کہ ذکر کیا گیا اپنے اندر ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اسے متحرک سماج کے اندر صالح افکار کی نشو ونما اور اگلی نسل کو پچھلی نسل کا سچا جانشین بنانے کی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے ایک چیز جو کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ترنم ریاض کے افسانے بظاہر تو ہمیں صرف ایک ادبی فن پارے سے زیادہ معلوم نہیں ہوتے لیکن در حقیقت انھوں نے اپنے فن کو ایک اوزار Tool کی طرح استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے مقصدی ادب کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن جیسا کہ ناقدین کی جانب سے بار بار اس تحریک پر یہ الزامات عائد ہوتے رہے ہیں کہ اس تحریک نے ادب کو پروپیگنڈ ا بنا کر رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے یہاں سے ادبیت کی چاشنی مفقود ہو گئی اور ادب کے نام پر صرف چیخ پکار اور کھینچ تان ہی باقی رہ گیا لیکن ترنم ریاض کا فن ایسی کسی تحریک کا نمائندہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے صالح سماجی اقدار کی نشو ونما اور معاشرے کی تعمیر کا قصد وارادہ بھی کیا ہے تو اسے اپنے فن پاروں کی سطح پر رکھ کر فن پارے کو پروپیگنڈا نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم زیرِ نظر افسانہ ''ماں صاحب'' کی بات کریں تو اس افسانے کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں قطعی طور پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہاں کہانی بیان کرنے کے پیچھے کوئی اور مقصد بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔ جب ہم افسانے کے بین السطور اترتے ہیں اور گہرائی میں جانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کی زیریں سطحوں پر ہمیں سماجی سروکار میں اصلاح کی دبی دبی خواہشوں کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔

ترنم ریاض نے افسانے میں لفاظی یا لفظی جادوگری سے کام لینے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ بالکل سادہ سی نثر میں اپنے تخیلات کو قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس میں کوئی پیچ نہیں، کوئی گھماؤ نہیں، کوئی ژولیدگی نہیں بلکہ راست انداز میں قاری افسانے سے جڑتا ہے اور دھیرے دھیرے اختتام تک پہنچ جاتا ہے۔ کہیں کہیں ہلکا سا مزاح بھی شامل ہے جو قاری کے لبوں پر بے ساختہ ایک ہلکا سا تبسم بکھیر جاتا ہے:

''...........تو میں کون سا کسی غیر کے ساتھ ہوں گی...... نادرہ کی

بیٹی ساتھ ہوگی......''

''نادرہ کی بیٹی کا نام کیا ہے ماں صاحب......''

شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا تو خرم جلدی سے بولا۔

''اس کا نام نادرہ کی بیٹی ہے'' (ص:173)

افسانہ معاصر زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے۔ آج کے دور میں جبکہ اولڈ ہومز اور آرام گھروں کا چلن عام ہو گیا ہے، جہاں بوڑھے والدین نئی نسل کو بوجھ لگنے لگے ہیں، جس صارفیت زدہ اور مصروف دور میں انسان کو اپنے بزرگوں کی خیریت پوچھنے کی بھی فرصت نہیں بلکہ انھیں عضو معطل سمجھ کر خود سے علیحدہ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہوں، اس عہد میں ایسے نوجوانوں کی تربیت انتہائی اہم معلوم ہوتی ہے جو بزرگوں کی حیثیت اور ان کی قدر و منزلت سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ انھیں ان کا جائز حق دینے کی کوشش کریں اور ان کے مسائل کو سمجھیں، انھیں وقت دیں۔

افسانہ فنی لوازم سے بھرپور ہے اور ترنم ریاض نے کسی بھی سطح پر کوئی خامی نہیں چھوڑی ہے۔ ان کا انداز فلسفیانہ نہیں، لیکن مابعد جدید عہد زندگی کے ایک انتہائی اہم مسئلے کی توجہ مبذول کرانے کے لیے کسی فلسفیانہ اسلوب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ چونکہ قارئین کے بھی مراتب ہیں اور افسانوں یا کسی بھی تخلیقات کے اسالیب کی درست تعیین اس کے قارئین کو سامنے رکھ کر ہی کی جاتی ہے۔ اگر ہمیں ادب پسندوں کے اعلیٰ طبقے کے لیے کچھ لکھنا ہے تو ہم وہاں منطق و فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، اقتصادیات اور دنیا کے چاہیں جتنے علوم بھی چاہیں زیر بحث لا سکتے ہیں، جو اسلوب بھی چاہیں اختیار کر سکتے ہیں کیونکہ تربیت یافتہ قاری پہلی قرات میں نہ سہی، دوسری تیسری قرات میں تخلیقات کی عقدہ کشائی تو کر ہی لیتا ہے۔ اگر ہم ادبی عوام کے لیے کچھ لکھ رہے ہیں تو بھی مرصع نثر کی گنجائش برقرار رہتی ہے، تشبیہات و استعارات، مجاز و کنائے سے ہم بات کر سکتے ہیں لیکن جب گفتگو مطلق عوام

(یعنی سیاسی عوام جس میں تعلیم یافتہ، واجبی تعلیم یافتہ اور بسا اوقات صرف پڑھ پانے کی حد تک تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں) سے ہو تو وہاں ترصیع وتحسین نثر کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ عبارت آرائی کے شوق میں مدعا کے فوت ہو جانے کا اندیشہ برقرار رہتا ہے۔اس بات سے ترنم ریاض بخوبی واقف ہیں یہی سبب ہے کہ انھوں نے ایک عوامی موضوع اٹھایا تو اسی کی مناسبت سے لفظوں کا انتخاب کیا، اسی کی مناسبت سے سادہ اسلوب اختیار کیا اور اپنے مفہوم و مدعا کی ترسیل میں پوری طرح کامیاب ہوئیں۔ مجموعی طور پر اس افسانے کو اگر ہم اردو کے شاہکار افسانوں میں نہ بھی شامل کریں تو بھی یہ ترنم ریاض کے بہترین افسانوں میں لازماً شمار ہوگا۔

چار دن

گاڑی کے قریب پہنچتے ہی نہایت خوبرو اور خاصے تند خو، نبیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، بلکہ ہونٹوں سے اٹھ کر سرخ وسفید چہرے پر سیاہ چمکیلا حاشیہ بناتی داڑھی مونچھ پر سے پھسلتی ہوئی، سیدھی اوپر جا کر آنکھوں کی پتلیوں یں تھرکتی، شانے تک بڑھائے ہوئے لمبے بالوں میں بھی لہرانے لگی۔ اس نے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا اور ڈرائیونگ سیٹ کے قریب سے بڑی سی زرد گیند، جس پر سیاہ حاشیوں والے پنچ کونے خانے بنے تھے، دوسری طرف اچھال دی جسے کریکیٹ کی گیند کی طرح کیچ کر کے نو سالہ رونق زور سے ہنس پڑا۔ اس کے موتیوں ایسے سپید دانت، سر پر بندھے چھوٹے سے جوڑے کو ڈھکنے والے رومال کی طرح ہی چم چم کر رہے تھے۔ رومال کے چاروں کونے اوندھے رکھے ہوئے چار پتیوں والے سفید پھول کی طرح پھیلے تھے۔ نبیل نے چھت کے اوپر سے لمبی بانہہ آگے کر کے اس کے بڑھے ہوئے ننھے سے ہاتھ کو بغرضِ مصافحہ چھونے کی ناکام کوشش کی۔ رونق نے دبلی سے کمر کے بائیں اور کے خم میں سے گیند اٹھا کر داہنی جانب دھری اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بایاں ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔ اتنے میں کتوں کے زور زور سے بھوکنے کی آوازیں آئیں تو دونوں ہنستے ہوئے سر گھما کر دیکھنے لگے۔ اکھل اور نکھل کتوں کی کامیاب نقل اتارتے، کھیلنے کے جوتے پہنے، لمبے لمبے موزے تانے ان کی طرف آرہے تھے۔ اکھل اپنے بارہ سالہ بھائی سے دو برس بڑا تھا۔ اس نے لپک کر رونق کو اوپر اٹھا لیا اور وہ

نبیل سے ہاتھ ملا کر باغ باغ ہو گیا۔ اس وقت تک کرن بھی ہانپتا دوڑتا پہنچ گیا۔

''یار۔۔سوری۔۔لیٹ ہو گیا۔''

اس نے نبیل کی طرف دیکھ کر ذرا جھجکتے ہوئے اپنے دس سالہ مگر پچاس کلو وزنی بدن پر روزانہ دیر سے آنے کے باعث طاری گھبراہٹ کو اپنی جانب سے عام لہجے میں چھپانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے یار۔۔تو تو۔۔''

نبیل بھی اس کے لہجے کا بھرم رکھ کر ہم عمر دوستوں والے انداز میں بولا۔ پھر ربر کا چھلا (جو اس نے ماما کی سنگھار میز سے اٹھایا تھا کہ یہ چھلا سیاہ کپڑے میں بنا گیا تھا، عام ربر کے چھلوں کی طرح بال کھینچ کر توڑتا نہیں تھا اور لڑکیوں کے استعمال کے چھلوں سے قدرے پتلا تھا اس لئے کوئی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس نے زنانہ چھلا بالوں میں پہن کر رکھا ہے) شہادت کی انگلی کے گرد سے نکال کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور بالوں کو اس میں پرونے لگا۔ بال پونی ٹیل کی صورت اس کے چوڑے شانوں کے بیچ لہرایا کئے۔

''اب کے پھر چھوٹے کٹواؤں گا بال۔۔بہت ہو گا فیشن یار۔۔''

اس نے گاڑی سٹاٹ کی۔

''نہیں بھیا۔ ابھی کچھ اور دن رہنے دیجئے نا۔ اتنے اچھے لگتے ہیں۔''

نکھل نے باقی لڑکوں کی طرف دیکھا۔

''ہے نا۔۔''

اس نے تائید چاہی۔

''ہاں بھیا۔۔''

اکھل نے فوراً کہا۔

''آپ ہیرو لگتے ہو۔۔''

رونق مسکرایا۔

''وہ تو میں ویسے بھی لگتا ہوں۔۔''

نبیل نے قہقہہ لگا کر گردن موڑی اور سب کے چہروں کو دیکھ کر کہا تو چھوٹی سی ٹیم بھی قہقہے لگانے لگی۔

بے سبب کی خوشی ان کے چہروں سے چھلکے پڑتی تھی۔نبیل نے ونڈ سکرین پر لگے چھوٹے سے آئینے میں ان کے چہروں پر ایک اور نظر ڈالی تو اس کے ہونٹوں پر مزید کئی لمحے تک مسکراہٹ چھائی رہی۔

انجن کی آواز بلند ہوئی۔گاڑی کے نیچے لیٹا کچھ کچھ سیانا ہو چکا چھوٹا سا بھورا کتا باہر آ گیا اور دم ہلاتے ہوئے بڑی بڑی، سیاہ اور پیار سے لبریز تھرکتی ہوئی کالی پیلی پتلیوں سے گاڑی کی کھڑکیوں کو دیکھنے لگا۔گاڑی چلی، وہ پیچھے دوڑا اور کچھ دور جا کر لوٹ آیا۔گویا وداع کرنے گیا ہو۔ پیچھے کی نشست پر بیٹھے کرن نے مسکرا کر اس کی ہلتی ہوئی وفادار دم کو ایک نظر دیکھا اور سامنے کی اور پلٹ کر مزید کئی لمحے مسکراتا رہا۔

کتا واپس اسی مقام پر پلٹ آیا کہ اور پہلے صبح جب گاڑی دھلی تھی تو پانی گاڑی کے نیچے کی پختہ گلی کی زمین کو اچھی طرح سیراب کر گیا تھا۔

اور مئی کی تپتی گرمی کی اس صبح میں بھورے رنگ کے کچھ کچھ سیانے اور شب بیداری سے مخمور کتے کو آرام کرنے کیلئے فی الحال اس سے زیادہ آرام وہ جگہ دوسری نظر نہیں آئی۔وہ زمین پر پڑے لکڑی کے گھوڑے کے طرح چاروں ٹانگیں پھیلائے معصومیت سے پلکیں جھپکتا لیٹا رہا۔

برآمدے کے جنگلے سے لگی نیلوفر گاڑی روانہ ہو جانے کے دو ایک منٹ بعد تک وہیں ایستادہ رہی پھر پلٹ کر کرسی پر آ بیٹھی۔ٹہنیوں سے بنی گئی گول میز پر لگے گول کانچ پر رکھا چینی کا بڑا سا مگ انگلی کے پوروں سے چھوا۔چائے ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ چلئے کچھ فائدہ تو ہوا اس گرم صبح کا۔چائے کی شوقین نیلوفر نے اطمینان سے مگ ہاتھ میں لے کر ٹیک لگالی۔ایسا کرنے سے اس کی گردن اوپر کو ہو گئی۔گولر کا درخت گول گول سرخی مائل سبز پھلوں

سے لد گیا تھا اور پتوں جیسے سبز رنگ کے پروں والی ایک چھوٹی سی چڑیا شاخوں میں ادھر ادھر اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کے پر اتنے مہین تھے جیسے کسی نے موقلم سے دیوار پر روغن کیا ہو یا جیسے کوئی پلاسٹک سے بنا پرندہ ہو۔

دھلی گاڑیوں کا پانی بہہ کر کنارے کے دو ایک چھوٹے چھوٹے گڈھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ وہاں ایک کوا پانی پی رہا تھا۔ ہوا چلنے سے اس کی گردن کے پروں میں بھنور سا پڑ جاتا تھا۔

کہیں سے بادلوں کی گرج کانوں میں پڑی۔ نیلوفر آسمان کی جانب دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ پانی کا ایک مٹا سا قطرہ اس کے پاؤں پر گرا۔ اس کے چہرے پر حیرت بھری خوشی چھا گئی، اور لبوں پر ایک پرسکوں سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔ اس نے دونوں پاؤں پھیلا کر دوسرا پیر بھی بھیگنے کیلئے آگے کر دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ پل میں ایسی ہی بیت گئے۔ شاید بہت سے پل، کہ جب آنکھیں کھول کر وہ اپنی نشست سے کھڑی ہوئی تو اس وقت تک پوری گلی جل تھل ہو چکی تھی۔ نیم کے پیڑ کے نیچے آنے والے راستے پر ہوا سے بکھری بے شمار پیلی پیلی نمکولیاں سرسوں کے پھولوں سی لگ رہی تھیں اور پلاش کے بڑے بڑے باوقار، حسین اور کئی روز سے الٹے لٹک رہے سرخ پھولوں کو اب موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنی لمبی لمبی ڈنڈیوں سے ہمیشہ کیلئے قطع تعلق کر کے راستے پر سجنے کیلئے آزاد ہو جائیں۔

نیلوفر نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان لمحوں کے اندر کئی اور تبدیلیاں بھی ہو چکی تھیں۔

ہری ہری تبدیلیاں، کہ درختوں کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ نیم کے چمکیلے پتوں کی ہریالی دھل کر روشنی منعکس کرنے سے ہلکی ہری نظر آتی تھی۔ پیپل کا گہرایا ہوا سبزہ گھنی شاخوں کے درمیان پہنچتے پہنچتے سیاہی مائل ہرا ہو جاتا تھا۔ گولر کے پتے بھیک کر نیل گوں ہرے نظر آنے لگے تھے اور گھاس کچھ مسکراتی ہوئی سی ہری، جو نیم کے پتوں سے کچھ گہری اور پیپل کے پتوں سے کچھ ہلکی ہری تھی۔

کنکریٹ کی گلی نما سرمئی سڑک پر پانی کی بے شمار لکیروں کے عقب سے تار کول میں پھنس کر راستے کا حصہ بن چکے رنگ برنگے کنکر دھل دھل کر شفاف ہو گئے تھے۔ نہائی ہوئی گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑی سکون سے بھیک رہی تھیں، اور یہ نظارہ اس وقت تک ویسے ہی حسین رہنے والا تھا جس وقت تک بارش یوں ہی یکسوئی سے برستی رہنے والی تھی اور کوئی منظر کو بدلنے کیلئے راستے سے گزرنے والا نہ تھا۔

کوا (غالباً بہت سا پانی پینے اور باقاعدہ بھیگنے کیلئے) کہیں اڑ چکا تھا۔

نیلوفر کی نگاہیں دوبارہ درختوں میں بھٹکنے لگیں تو مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔ ہرے سبز پتوں میں گھنی سیاہ داڑھی سے لگے سرخ صحت مند لبوں کے ساتھ موتی سی قطار ایسے دانت ہنس پڑے۔ سیاہ سیاہ پتلیاں جو اکثر سنجیدگی کے زیر اثر نظر آتیں چمک چمک کر مسکرا اٹھیں۔ نیلوفر کے لبوں پر مسکراہٹ واضح ہوگئی لیکن پیشانی پر کچھ لکیریں بھی ابھر آئیں۔

اتنی مشابہت؟ وہی پشت پر ہلکی سی گولائی لئے چوڑے شانے۔ ویسا ہی صاف رنگ لیکن کھیل کود میں دلچسپی کے باعث نکھرا اور سرخی مائل۔ مگر ناک پر یہ غصہ۔ مرضی کے خلاف کچھ ذرا ہو جائے تو آسمان سر پر اٹھالے۔ گلاس کے کانچ کی شفافیت میں دھندلا پن نظر آئے تو ملازم کے سر ہو جائے۔ اس کی عدم موجودگی میں کوئی اس کا کمرہ صاف کرنے کی کوشش کرلے تو طوفان کھڑا کر دے۔

مگر دل ہیرے کی کنی سا صاف۔ کالنی کے بچوں کا دوست، کپتان، استاد، لیڈر اور جانے کیا کیا کچھ کہ جس سے وہ محبت بھی کریں اور جس کا ان پر رعب بھی ہو۔

مگر وہ۔ کیا وہ بھی نبیل کی طرح صاف دل تھا۔ گو کہ نبیل کی ہی طرح ہر معاملے میں اپنی سی کرنے والا۔

''نیلی! تم یہ حساب کتاب چھوڑو۔۔اور مجھ سے شادی کرلو۔۔''

جمیل نے ایک دن حساب پڑھنے آئی اپنے والد کے دوست کی بیٹی سے دفعتاً کہا تھا اور قلم پر ڈھکن لگا دیا تھا۔

”کیوں یہ نازک سا سر کھپا کھپا کر مزید کمزور کر رہی ہو“۔

اس نے نیلی کا سر داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہلایا اور بائیں سے حساب کی کھلی کتاب بند کر دی۔

”کیا کہہ رہے ہیں سر۔۔ میرا سر کمزور ہے یا آپ کا پڑھانے میں دل نہیں لگتا۔“

جمیل سے کوئی چار برس چھوٹی نیلی نے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

”میرا دل نہیں لگتا یا تمہارے دماغ میں حساب سماتا ہی نہیں۔ یہ تو ہم جیسے ’رف اینڈ ٹف‘ لڑکوں کا کام ہے۔۔ تم دھان پان سی لڑکی۔۔ ہوم سائنس پڑھو۔ لٹریچر پڑھو، موسیقی پڑھو، سائکولوجی پڑھ لو، اور شادی کیلئے ہاں کرنے کا فیصلہ لرلو۔ ویسے بھی تم سے شادی کرے گا کون۔ تم سودے سلف کا حساب، دھوبی یا دھوبن کا حساب، بچوں کی فیس وغیرہ کا حساب تک رکھ نہیں پاؤ گی۔ ایسی صورت میں شوہر کا ریاضی دان ہونا نہایت ضروری ہو جاتا ہے اور یہ میرے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے۔“

جمیل نے اپنے بالوں میں ہاتھ پرویا اور کمال سنجیدگی سے نیلی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایسے بھی میرا ’سی، اے‘ یعنی چارٹرڈ ایکاؤنٹنسی‘ پورا ہونے ہی والا ہے۔ اور ویسے بھی گھر والے میرے لئے لڑکی تلاش کرنے ہی والے ہیں۔ اور میں ان سے تمہارے بارے میں کہنے ہی والا ہوں۔ اور۔۔ اور تم ہاں کرنے والی ہو۔۔“

نیلی نے کچھ لمحے اس کی بات سمجھنے میں لگائے اور پھر ہنس پڑی۔

”آپ تو سر۔۔ ایک تو میں اتنی ریسپیکٹ کرتی ہوں آپ کی اور آپ ہیں کہ گرو اور ششیہ کے رشتے پر دھبا لگانے پر تلے ہیں۔“

نیلی نے سنجیدہ شکل بنالی۔

”اور دوسرے آپ کا رنگ گورا ہے۔“

نیلی نے حساب کی کتاب کھول کر وہ ورق سامنے کیا جس سے کچھ دیر قبل کام ہو رہا تھا۔

''مطلب۔۔؟ رنگ گورا ہونا جرم ہے کیا۔تمہارا تو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔۔''

جمیل نے کتاب دوبارہ بند کر کے ہاتھوں میں تھام لی۔

''اسی لئے تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ کسی سانولے لڑکے سے نسبت آئے گی تو وہاں کروں گی۔ مجھے اپنا رنگ بالکل پسند نہیں۔''

''اشی لی یے تیو۔''

جمیل نے سر ہلاتے ہوئے آواز باریک بنا کر نقل اتاری۔

''آج سے دعا کروں گا کہ تم کو ایسا شوہر ملے کہ پتہ ہی نہ کر پاؤ چہرہ کہاں ختم ہو ااور بال کب شروع ہوئے۔ وہ تمہاری طرف دیکھ رہا ہو اور تم سمجھو پیٹھ موڑ کر بیٹھا ہے۔کافر نعمت۔۔ناشکری لڑکی۔۔محسن کش۔۔میں تو تمہارے بھلے کی کہہ رہا تھا۔۔اور۔تم ہو کہ۔۔ ابھی بھی وقت ہے۔۔پھر نہ کہنا آخری بار نہیں پوچھا۔۔''

جمیل اس کی طرف دیکھتا رہا۔وہ انگلی رخسار پر دھرے گویا کچھ سوچ رہی ہو۔کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے۔

''اب کچھ کہو بھی نیلی۔۔''

جمیل کی آواز میں ہلکی سی سنجیدگی گھل گئی۔ نیلی نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

نیلی نے اسے جو کہا تھا سچ کہا تھا۔خوش مزاج ہونے کے باوجود جمیل کے گورے رنگ اور کچھ بھاری جثّے نے اسے اس انداز سے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا کہ نیلی کو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال آیا۔مگر ایک انسان کے ناطے اس کی جمیل کے بارے میں اچھی رائے تھی۔اس وقت اچانک جمیل کو سنجیدہ محسوس کر کے وہ کچھ سوچتی سی کافی دیر ایسے ہی اس کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر ایک نظر فرش کی طرف ڈالی اور فوراً اوپر دیکھا۔

''اور سر آپ کی اگر مونچھ ہوتی نا۔۔تو۔۔''

وہ کچھ لمحے خاموش رہی پھر بغیر مسکرائے دبی دبی شوخی سے بولی۔

''تو۔۔؟ تمہاری خاطر بھی نہ منڈواتا۔۔''

جمیل نے آواز اونچی کر کے گویا سنجیدگی سے کہا۔ نیلی کو ہنسی آئی۔

''نہیں وہ بات نہیں۔۔اس صورت میں۔۔میں۔۔شاید کچھ سوچ سکتی تھی۔۔''

''بس۔۔؟ رکھ لی مونچھ۔۔داڑھی بھی رکھنا ہوگی آقا؟''

اس نے ہاتھ باندھ کر سر جھکایا۔

''نہیں۔ ہوسکتا ہے آپ پر اچھی نہ لگے۔۔اور۔۔میرا ارادہ پھر بدل۔۔''

''نہیں کوئی ارادہ وِرادہ نہیں۔ میں جارہا ہوں ڈرائنگ روم میں۔۔تمہارے 'ڈیڈ' سے رشتہ مانگنے۔ وہ وہیں بیٹھے ہیں اس وقت پاپا کے انتظار میں۔تم۔۔تم مذاق سمجھتی ہو؟''

وہ اٹھا اور سچ مچ ہی ڈرائنگ روم میں جا گھسا اور نیلی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

زندہ دل حسین نیلی بڑی دلنواز اور ناز بردار بیوی ثابت ہوئی۔ مگر جمیل اچھا شوہر نہ بن سکا۔ شادی کے سال بھر بعد ہی دوسرے شہر سے آئی اپنی چچازاد کے ساتھ تقریباً ہر شام گزارنے لگا۔ سنگھار میز پر نہایت مشک بیز خوشبوئیں اور عمدہ شیولوشنز جمع ہونے لگے۔ غسل خانے سے پہروں گنگنانے کی آوازیں انے لگیں۔

نیلی کے ساتھ اس کا دوستانا سا سلوک خاموش سے رشتے میں بدل گیا۔ ویسے عام طور پر اس کے شب وروز میں کوئی خاص تبدیلی بھی رونما نہیں ہوئی۔ بس وہ ذرا خود میں گم معلوم ہوتا۔

نیلی نے یہ تبدیلی شدت سے محسوس کی تھی۔

جب وہ کبھی کبھی بلاسبب مسکرایا کرتا تو نیلی مسکرانا بھول سا جاتی تھی۔

وہ بچے کو باپ سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے گھر نہیں توڑا۔ وہ اداس رہی۔ اس نے موسیقی نہیں سنی۔ اس نے نئے ملبوسات نہیں خریدے۔ اسے بے خبر نیند نہیں آئی۔

وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے سے بڑی باتیں کرنے لگی۔

''آپ کو پتہ ہے بیٹا۔۔ماماں کتنی اپ سیٹ رہتی ہیں۔''

وہ اس کے بال بنا رہی تھی۔

''ہاں پتہ ہے۔''

ہاں کہتے وقت اس نے سر کو بالکل خم نہ کیا مبادا ماما کو دوبارہ مانگ نکالنی پڑے۔

''کیوں ہیں اہم اپ سیٹ۔۔''

وہ اس کی ٹھوڑی تھام کر کانوں کے پاس نرمی سے کنگھا کرنے لگی۔

''اس لئے کہ پاپا کا اپنی کزن سے افیئر چل رہا ہے۔۔''

وہ سامنے کے تازہ تازہ گرے دو دانتوں کے خالی مقام سے 'افیئر' کی 'ف' پر زور لگا کر بولا۔ نیلی زمین پر اس کے قد کے برابر بیٹھی حیران سی دیکھتی رہ گئی۔

''اسی لئے نا۔۔''

اس نے بغیر کسی تجسس کے کہا۔ گویا اطلاعاً کہا جا رہا ہے۔ نیلی نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اسے گود میں اٹھا لیا اور ٹہلنے لگی۔ وہ اس کی گردن میں باہیں پروئے، کمر کو ٹانگوں سے جکڑے قدموں کی رفتار کے ساتھ کمرے میں بدلتی چیزوں کو دیکھا کیا۔

اپنی ہنسلی کے ہلکے سے گڈے میں ننھی سی ٹھوڑی کا میٹھا سا دباؤ محسوس کرتی نیلی اس کے پھول سے جسم کا بوجھ سنبھالے، کہ وہ نسبتاً کمزور بچہ واقع ہوا تھا، خود اعتمادی سے کسی کام میں لگ جاتی۔ گویا ایک ہمراز پا کر دل کو قدرے بہتر محسوس کرتی ہوئی۔

مگر ہم راز صاحب بڑے موڈی واقع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ننھے ننھے معاملوں میں الجھے ماما کے اندر کی بے قرار ہرنی کو گھاس تک نہ ڈالتے اور نیلی ایسے میں پیلی پڑ جاتی۔ خود ان کے بھی کچھ عجب مسئلے ہوا کرتے جو عمر کے ساتھ بدلا کرتے، اور عمر تھی کہ تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

''ماماں۔۔میں یہاں ہوں نا آپ کے پاس۔۔''

سکول کی کتاب سے سر اٹھایا گیا۔

''جی ہاں ۔۔اور کیا میری جان ۔۔''

''بس میں صرف یہاں ہی ہوں یا ۔۔اور بھی کہیں ہوں ۔۔''

وہ پنسل والے ہاتھ کی بند انگلیوں سے، ماتھے پر آرہے بالوں کو سر کی جانب سنوارتے ہوئے نہایت چمکیلی سیاہ پتلیوں والی گہری گہری آنکھوں سے پل بھر کیلئے نیلی کو دیکھ کر پوچھا کئے۔

''یعنی ۔۔اور کہیں؟ ۔۔اور کہاں؟''

ممتا کی تشویش بھری صدا ابھری۔

''کہیں بھی ۔۔سکائی پر ۔۔کوس موس میں ۔۔ اوزون کے پاس ۔۔ سپیس میں ۔۔ٹائم کے بعد ۔۔یا ۔۔ٹائم سے پہلے ۔۔''

سوال عام سے انداز میں کیا گیا اور سر پھر کتاب پر جھک گیا۔

نیلی کرسی سے نیچے کو آویزاں، نکر میں چھپی تپلی تپلی مگر کچھ لمبی ہو چکی ٹانگوں کی مسکین پنڈلیوں کو دیکھتی حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔

یہ چھوٹی سی عمر اور یہ بڑوں سے بھی کچھ اُدھر کے سوال۔

یہ رائی سا جسم اور یہ پہاڑ سی باتیں۔

وہ سر جکا کر پھر ہوم ورک کرنے میں مشغول ہو گیا، اور نیلی اسے دیکھتی ہوئی سوچوں میں غرق سی ہو گئی۔

اس ضرورت سے زیادہ حساس اور معصوم ذہن کو والدین کے مابین تناؤ سے بچانا ہو گا۔آگے چل کر وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تو؟

اُسے تو ماں اور باپ دونوں ہی مکمل چاہئیں۔ ورنہ۔ یہ جواب کھوجنے والا دل جواب نہ پاکر پریشان ہو جائے گا۔

نیلی کتاب پر جھکے چہرے کو دیکھتی رہی۔

چھوٹا سا دانشور۔ پڑھتا کچھ اور، سوچتا کچھ اور ہے۔

سارا فساد ہی لاجواب سوالوں کا ہے۔

خود نیلی بھی بچپن میں عجب سوال کرنے پر خاندان بھر کے بچوں میں مذاق کا نشانہ بنا کرتی۔ ایسے ہی اس کے سوالوں کا بھی کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہوا کرتا۔

'بابا جب دنیا نہیں تھی تو۔۔تو کیا تھا۔۔'

'کیا تھا۔ کچھ نہیں تھا۔'

فورسز آفیسر صاحب فورس فلی جواب دیتے۔

'اور۔۔ کچھ نہیں سے پہلے کیا تھا۔۔؟'

بابا صرف ایک نظر اسے دیکھتے اور دوبارہ اپنے کسی کام میں مصروف ہو جاتے، مثلاً اخبار پڑھنا یا فون پر بات کرنا یا کچھ ویسا ہی۔

'بابا۔۔ جب دنیا ختم ہو جائے گی۔۔تو کیا رہے گا؟'

بابا بڑی خود اعتمادی سے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات طاری کر دیتے جیسے اس وقت کیا کرتے جب نیلی نے الٹے جوتے پہن رکھے ہوں۔

'بابا۔ جہاں ساری کائنات کا آخری کنارہ ہے۔ اس کے بعد کیا ہے؟'

وہ ذہن و دل کے اندر خوفناک سی اتھل پتھل مچاتے سوالات کی زیر اثر خود کلامی کے انداز میں کہتی گویا اسے معلوم ہوتا کہ بابا کے پاس اس کے سوالوں کا جواب نہیں ہے، اور خود ہی سوال آگے بڑھاتی۔

'کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے نا۔۔تو پھر۔۔'

پھر سوال جوں کے توں رہ گئے۔ اپنی حیرت انگیزیوں اور ڈراؤنے پن کے ساتھ۔ جب تک کہ عمر نے کائناتی سوالات کی نوعیت بدل کر دنیاوی کر دی۔

وہ بیٹے کے عجیب سوالات کا اس کے والد سے ذکر کرتی، اور والد صاحب نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کس طرف دیکھتے۔ نیلی سوچتی کہ برسوں سے تارکول کے گرم گولے کی طرح سانسوں میں اٹکے اپنے غم کا مداوا بھی پوچھ لے۔ مگر اس کے اندر بسی خوددار

عورت نے اپنے تعلق سے سوال کرنا اپنے شایانِ شان کبھی نہ سمجھا۔ سو، موم سی نیلی سلگتی پگھلتی رہی۔

عم زاد، ہم زاد کی صورت تین چار برس ساتھ رہے، یعنی جب تک وہ شہر میں رہی۔ خدا خدا کر کے کہیں سے پیغام آیا اور وہ گئی۔ مگر نیلی کی زندگی کے کچھ اہم سال ساتھ لے کر۔ جب کہیں جا کر مستقل اندیشوں کی تباہی کے تصور کی قید سے نیلی کا وجود رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگا۔

نبیل بھی بڑا ہو گیا تھا۔

'ماماں۔۔ جو ہوتا ہے۔۔ وہ تو ہوگا ہی، ہمارے سمجھے یا نا سمجھے بغیر بھی۔ مگر جو ہم کر سکتے ہیں۔۔ وہ ہمیں کرنا چاہئے۔۔ گمشدہ سوالوں کے جواب کھوجنے سے بہتر ہے کہ۔۔ جو سامنے ہے اس کی فکر کی جائے۔۔'

زندگی کو ذمہ داری اور دیانتداری سے گزارنے کے طریقوں پر باتیں کرتا وہ نیلی کو بہت سمجھدار معلوم ہوتا۔

باقاعدگی سے کثرت کر کے اس نے اپنے کمزور جسم کو چست اور مضبوط بنا دیا تھا۔ کھیل کود کا رسیا تھا۔ اس کے دوستوں میں کھلاڑی ہی ہوا کرتے۔ وہ بھی بغیر عمر کے کسی تصور کے۔ بس کھیل میں دلچسپی شرط تھی۔ وہ صرف ایسے ہی موضوعات پر خوشی سے بات کرتا۔

''سٹیڈیم۔۔ پلے گراؤنڈ نا۔۔ ماماں۔۔ زندگی کا میدان ہے میرے خیال سے۔۔ جسم کو جینے کا طریقہ سکھانے والا۔۔ کھلے آسماں کے نیچے کھیلتے ہوئے لوگ۔۔ صحت کی عزت کرتے ہوئے لوگ کس قدر خوش ہوتے ہیں۔۔ یہ جسم جو ہماری روح کو ملا ہے، نیچر کا گفٹ ہے۔۔ ایک بار ملتی ہے یہ زندگی انسان کو۔۔ اسے اپنی زندگی سے محبت کرنی چاہئے۔۔ ان ہیلدی آدمی کو آپ کبھی خوش نہیں دیکھیں گی۔ جسم کے ساتھ اس کا ذہن بھی بیمار ہوتا ہے۔ دوسروں کو وہ کبھی خوش دیکھ سکتا ہے نہ خوشی دے سکتا ہے۔ بیمار رہ کر اپنا مائنڈ اور بوڈی ہم برباد کر دیں، یا تندرست رہ کر اس جسم سے ہر خوشی حاصل کر لیں، وہ ہم پر

ڈیپینڈ کرتا ہے۔۔"

ایک صبح کھیل سے جلد لوٹ کر وہ برآمدے میں لگی کرسی پر بیٹھ کر ماں سے باتیں کرنے لگا۔

'خوشی اصل میں اچھی صحت ہی ہے۔ یہ چائے کب چھوڑیں گی آپ ماماں۔۔ یہ بھی ایک طرح کی سلو پوائزننگ ہے۔۔ یو کین ڈائی اِف یو ہیو اے فیو ہنڈریڈ کپس ایٹ اے سٹریچ یو نو۔۔ اور ڈیڈ نے تو گولف کلب جانا چھوڑ ہی دیا۔۔"

"میں نے کم کر دی ہے چائے بیٹا جب سے آپ نے کہا ہے۔ جلد چھوڑ دوں گی۔ اور سیر بھی تو کر رہی ہوں نا روز صبح۔ آپ کے بیدار ہونے سے پہلے۔۔"

"تو سچ بتائیے کیا آپ خود کو ایکٹو محسوس نہیں کرتیں۔۔ خوش رہتی ہیں نا پہلے کی نسبت۔۔"

"آف کورس بیٹا۔۔ چاق و چوبند محسوس کرتی ہوں خود کو۔ لگتا ہے جیسے زندگی میں کچھ اہم کرنے کو حاصل ہو گیا ہو۔۔ جو پہلے نہیں تھا۔۔ انتظار رہتا ہے صبح کی سیر کے وقت کا۔۔ دن بھر کے کام میں میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔۔ بھرپور زندگی جینے کا احساس ہونے لگا ہے مجھے۔ اینڈ دِس کریڈٹ گوز ٹو یو مائی چائلڈ۔"

"یس۔ مائی۔ مام۔۔"

اس نے مسکرا کر تین بار سر اثبات میں ہلایا اور کرسی پر بیٹھے پہلو بدلا پھر باہر کی جانب دیکھنے لگا۔

طویل قامت دھوبن سر پر استری کرنے والے کپڑوں کی گٹھری سنبھالے، پانچ چھے سالہ بچی کو انگلی تھمائے گلی کے دوسرے موڑ پر ایستادہ پیپل کے درخت کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ جہاں اس نے ادھر ادھر سے اینٹیں گارا جمع کر کے ایک چھوٹا سا چبوترا بنا لیا تھا۔ آگے آگے اس کا سات سال کا بیٹا اپنے دونوں ہاتھوں میں باری باری وزنی آہنی استری اٹھاتا چل رہا تھا۔

''یہ رگھو بہت پیتا ہے۔ کملی کام کرتی ہے اور یہ۔۔ بلڈی ایلکو ہولک۔۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔

''مرجائے گا ایک دن جلد ہی۔۔''

اس کی غصیلی آواز میں دکھ شامل ہو گیا۔

''نہیں بیٹا خدانہ کرے۔۔ بیچاری کملی کا کیا ہوگا۔ دو بچے اکیلی کیسے پالے۔۔''

''ابھی بھی پال رہی ہے اکیلی۔۔ اس کو بھی پال رہی ہے۔۔ اور یہ کھانے کی بجائے پینے میں لگا ہے۔۔ کتنی کوشش کی تھی اس کو ہسپتال لے جانے کی ہم سب نے۔۔ وہاں اس کی یہ عادت چھڑوادی گئی ہوتی۔۔ مگر۔۔''

اس کا لہجہ درشت سا ہو گیا۔

''اب جو بھی لت ہے پاگل کو۔۔ مگر بچوں کا باپ تو ہے نا۔۔''

''ہاں وہ ان کا باپ ہے بس۔ بٹ ہی اِز ڈائنگ۔ آئی کین سی دیٹ۔''

اور اگلے دن ہی رگھو کو خون کی قے ہوئی اور شام تک چٹ پٹ ہو گیا۔

نیلوفر نے سنا تو دھک سے رہ گئی۔ دو تین سال پہلے تک بھلا چنگا تھا۔ کملی پریشان رہتی تھی کہ پینے لگ گیا ہے۔ پھر کہتی کہ روز پیتا ہے۔ پھر یہ کہتی کہ اب دن میں بھی اسے دارو چاہیے۔ اس کی لت اور ضد سے عاجز کملی اسے خود بھی منگوادیتی کبھی جب کولونی کے کسی گھر کا کوئی ملازم بازار جارہا ہو۔ رگھو نے کام کرنا نہ کے برابر کر دیا تھا۔ بس کسی دن کچھ کپڑے جیسے تیسے استری کر دیتا کہ ان پیسوں سے شراب کا ایک پیکٹ خرید سکے، پی کر پڑ رہتا وہیں پیپل کے درخت کے نیچے۔ جب تک کملی دوسرا پیکٹ خریدنے کے برابر اسے پیسے دے نہ دیتی۔ بہت سی دیر ایک ہی انداز میں بیٹھا رہتا۔ کبھی نیم دراز، کبھی گھٹنے پیٹ لگائے پیڑ کے تنے سے ٹکا ہوا۔ منہ اٹھائے کسی جانب دیکھتا ہوا۔ بچوں کی طرف۔ استری کر رہی بیوی کو یا راستے کی اور۔ اس کی ناک لمبی تھی، آنکھیں چھوٹی اور دہانہ چوڑا تھا جس میں سے، کبھی جب وہ کام سے پہلے پیسے مانگتے وقت خوشامدانہ ہنسی ہنستا تو پورے بتیس دانت نظر آتے۔

دبلی ہو چکی گردن پر آگے کو اٹھا ہوا سر ایسا لگتا جیسے کسی دیسی نسل کا تربیت یافتہ مگر بے ضرر کتا مستعدی سے چوکیداری کر رہا ہو یا مالک کے حکم کا منتظر ہو۔

چھوٹے بچوں اور جوان بیوی کا پہرے دار اب نہیں رہا تھا۔ نیلوفر نے ایک لمبی سانس لی۔

نبیل کھیل سے اسی وقت لوٹ رہا تھا کہ کملی کے چبوترے پر کوئی دوسرا آدمی کپڑوں پر استری کرتا نظر آیا۔ نبیل نے گاڑی روک کر پوچھا تو رگھو کے بارے میں پتہ چلا۔

''اس آدمی کو بہت پہلے گولی مار دینا چاہیے تھی۔۔''

اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔''

کیوں نہیں کہتے مام۔۔ نیگیٹو اثر پڑتا ہے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بھولے انسانوں پر۔۔ انہیں قدرت نے تھوڑی کوئی بیماری دی ہے۔۔ نشے سے خود کو خود بیمار کر دیتے ہیں ایسے احمق لوگ۔۔ سرکار کو ایک ایسی ہی پالیسی بنانا چاہئے۔۔ کہ صرف سانس لینے کی خاطر سانس لیتے ہوئے یہ کیڑے مکوڑے، یا تو اپنے سدھار میں کوآپریٹ کریں ورنہ۔۔ ورنہ ان کو کسی دور دراز جزیرے پر جبراً زیر علاج رکھا جائے۔ جہاں یہ اپنے عزیزوں کی صورت تک نہ دیکھیں جوان کی شراب نوشی کی وجہ سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔

''سچ نہیں ہے کیا۔۔ آپ بتائیں۔۔ ایک انسان دوسرے کو انفلنس کر سکتا ہے نا۔۔ نیگیٹو ہو یا پوزیٹو۔۔ اثر تو پڑتا ہے نا۔۔ میرے دوست یہ بچے۔ جو میرے ساتھ کھیلتے ہیں بڑے ہو کر بلکہ اس وقت بھی اور لوگوں کو ہیلدی طریقے سے جینا سکھائیں گے۔۔ انہیں دیکھ کر سیکھیں گے لوگ۔ ہر ایک کی لائف پریشس ہے۔ اسے ضائع کرنا کون افورڈ کر سکتا ہے۔ خود صحت مند زندگی گزارنا اور دوسروں کو انسپائر کرنا کیا سب سے بڑا کنٹر بیوشن نہیں لائف کی طرف۔۔ اب کملی کے یہ بچے۔۔ یہ کچھ کچھ ہوش مند بچے باپ کو یاد کر کے

رویا کریں گے۔۔"

وہ اداس ہو گیا۔ اور ایک گہری سانس لے کر دوبارہ پہلو بدلنے لگا تو کراہ اٹھا۔

ماں قانوں پڑھ رہے بیٹے کو، زندگی موت کے بارے میں اس طرح باتیں کرتے غور سے سن رہی تھی کہ اس کی تکلیف سے سٹپٹا سی گئی۔

"کیا ہوا۔۔؟"

وہ جلدی سے بولی۔

"میرے پاؤں میں آج پھر موچ آ گئی ماماں۔۔"

اس نے ماں کے چہرے پر ابھر آئے پریشانی کے تاثرات دیکھ کر فوراً کہا۔ اور کرسی کا سہارا لے کر بمشکل کھڑا ہوا۔

"بڑی مشکل سے ڈرائیو کیا۔۔ سب نے جیبوں سے رومال نکال کر باندھ دئے۔۔"

"یہ دیکھئے۔"

اس نے کہا۔ پھر ایک آدھ بار زور سے کراہ کر گھر کے اندر کی طرف مڑا۔ ماں باہیں سیدھی کر کے سہارا دینے کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں بڑا ہو گیا ہوں مام۔۔ آپ کیسے سنبھالیں گی۔ الٹا دونوں گر جائیں گے۔۔ ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

اس نے گردن موڑ کر کہا اور زور کا قہقہہ لگایا۔

"ہا۔۔ ماما۔"

دوسرا پاؤں فرش پر رکھتے ہی اونچی آواز میں چلایا اور پھر ہنسا۔ اس کے بعد دیوار کے سہارے اندر کی جانب چلا گیا۔ اس کے عقب میں نیلوفر بھی اس پر نظریں ٹکائے آہستہ آہستہ اس کے کمرے تک جا کر اس وقت تک دروازے کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی جب تک آہستہ آہستہ وہ مسہری پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر سے فون پر بات کرنے لگا تھا۔

بیگم نیلوفر خان برآمدے میں بیٹھی سوچوں میں ڈوب گئی تھی۔

نبیل بالکل جمیل جیسا نظر آنے لگا تھا۔

اپنے باپ جمیل احمد خاں جیسا۔

مگر اب جمیل احمد خاں ویسے نہیں رہے تھے۔ پہلے جیسے زندہ دل۔ اب وہ لباس بھی کچھ سادہ پہننے لگے تھے ادھر دو چار سال سے۔

بدن کچھ اور بھاری ہو گیا تھا۔ بال چھدرے ہو گئے تھے۔ اب نیلی کے خریدے کپڑے پہن کر مطمئن نظر آتے۔ ہوش رہا خوشبوؤں اور شیو کے بعد لگانے والے لوشنوں کی وہ اچھی خاصی تعداد جو خوابگاہ کی سنگھار میز یا غسل خانے میں نصب بڑے بڑے آئینوں کے ساتھ لگے طاقچوں پر سجا کرتی، رفتہ رفتہ غائب ہو چکی تھی۔ لباس کے ساتھ میچ کرنے والے یا بسیار سوچ کے بعد خوبصورت تضاد پیدا کرنے والے جوتے، کمر بند، ٹائیاں اور اوپری جیب کے رومال، قیمتی گھڑیاں، چشمے کے فریم اور مختلف شکل اور ساخت کے بیش قیمت قلم اب اپنی اہمیت کافی حد تک کھو چکے تھے۔ شام ڈھلے سیدھے گھر آجانا اور ہر بات حکم کی طرح مان لینا بھی معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔

جیسا کوئی شخص جانے پہچانے راستے پر کتاب پڑھتا ہوا چلتا ہو۔

یا جیسے اپنی غلطی کی تلافی کر رہے ہوں۔ گویا اب جمیل احمد خاں کیلئے چیزوں کا ہو جانا ہی زندگی ہو، اور چیزوں کے ہو چکنے پر ہی زندگی منحصر ہو اور اگر نہ ہو چکنے پر نہ بھی منحصر ہو تو کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

بے رنگ سے جمیل احمد خاں کچھ ایسے لگنے لگے تھے جیسے کوئی قیمتی لباس دھونے کے بعد اپنی چمک کھو دے۔

نیلوفر نے نظریں اوپر کی جانب ڈالیں۔ مہین ہرے پروں والی چڑیا ڈال گھوم رہی تھی۔ درخت کی سب سے بلند شاخ کے سرے پر جانے کس طرح اپنا توازن برقرار رکھے بیٹھی ایک بلبل چہک چہک کر اپنے اطراف دیکھ رہی تھی یا اطراف دیکھ دیکھ کر چہک رہی تھی۔

کیسے لگ رہے تھے جمیل احمد خاں دوروز پہلے جب نیلوفرا چانک غسل خانے میں شیمپو رکھنے گئی تھی۔ انہیں غسل خانہ اندر سے بند کرنے کی کبھی عادت نہ تھی۔ شاور سے پانی کی پھواریں جاری تھیں اور وہ زمین پر بیٹھے بال رگڑ رہے تھے۔ گول ہونے کی بجائے تکونے ہو چکے ان کے مظلوم سے کولھے زمین سے خاصے اوپر اٹھے ہوئے تھے کہ پیٹ ان کے اوران کی اکڑوں بیٹھی ٹانگوں کے درمیان نبیل کی زرد رنگ گیند کی صورت تنا، فاصلہ کئے ہوئے تھا۔ مگر جسم پر بال کم ہو جانے کے سبب پیٹ پر گیند کی طرح کی کوئی کالی لکیر واضح نہیں تھی۔ بھیگے بالوں نے خشک سر کے تمام اسرار طشت از بام کر دئے تھے اور سر کی پیلاہٹ مائل سفید جلد یہاں وہاں سے جھانک رہی تھی۔ موڑے ہوئے موٹے گول گھٹنوں سے لگی پنڈلیاں ٹخنے تک آتی ہوئی ہو بہو مرغِ مسلم کی ٹانگ کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

نیلوفر نے پھواروں سے بچتے ہوئے عجلت سے شیشی، کانچ لگے تین طاقوں والی منقش چوبی الماری کے اوپر طاقچے پر رکھی اور اندر کا منظر ساتھ لئے باہر آ گئی۔

اس نے ایسی صورت بنائی جیسے بغیر شکر ملائے لیمو والی چائے کا گھونٹ بھر لیا ہو۔

جمیل احمد اس دن بھی حسب معمول نہیں گنگنائے تھے اور جلدی سے نہائے تھے۔

کیا جمیل ناخوش ہیں، اس لئے اب گنگناتے نہیں؟

کیا جمیل 'ان ہیلدی' ہیں اسلئے ناخوش ہیں؟

یا ناخوش ہیں اس لئے صحت کی طرف سے لاپرواہ ہیں؟

بیمار رہ کر اپنا 'مائنڈ' اور 'بوڈی' برباد کر رہے ہیں؟

انہیں 'انسپائر' کرنا زندگی کی طرف سب سے بڑا 'کنٹر بیوشن' ہوگا۔

نیلوفر درختوں میں دیکھتی ہوئی نبیل کی کہی باتیں سنا کی۔

مگر جمیل احمد خاں تو کسی اور کیلئے خوش رہتے تھے۔

ان دنوں بلا ناغہ گولف کھیلا کرتے تھے، اور اب کبھی کبھی مہینوں اور اکثر ہفتوں ہو جاتے ہیں انہیں، گولف کورس کا رخ کئے۔

شادی کے پہلے سال نیلوفر بھی جاتی تھی جمیل کے ساتھ۔ جب نبیل امید بنا گولف کی، سفید، گڈوں والی چھوٹی سی، سخت گیند سے بھی چھوٹا مگر بے حد نرم اس کے ساتھ گولف کلب کے ریستوراں کے منفرد سینڈوچ بانٹ کر کھایا کرتا تھا، نظر نہ آتے ہوئے بھی۔ اور وہ اپنے ساتھ اس کی موجودگی کے تصور سے محفوظ، کہیں ایک الگ دینا میں شاد رہا کرتی تھی۔ کلب کی خاص دارجلنگ چائے کے خوشبو سے حساس تیکھی ناک کے اوپر پرسکون آنکھوں سے درختوں کی شاخوں میں نظریں دوڑادوڑا کر آخرکار پرندوں کو ڈھونڈ نکالتی۔ ان کی معصومیت کو پہروں نہارنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہاں ہی نیم کے درخت پر اس نے پہلی بار کوئل کو کتے دیکھا تھا۔ نیم کی شاخوں کے نیم خمدار پتوں میں بنے بے شمار بھنور جب ہوا کے تیز جھونکوں سے یہاں وہاں کو جھکنے لگتے، جب جا کر کہیں پردہ نشین کوئل کی جھلک ملتی۔ وہ بلبل کی طرح درخت کی سب سے بلند شاخ پر بیٹھ کر علی الاعلان برہا کا گیت نہیں الاپتی۔ سیاہ پروں اور سفید سی منقار والی کوئلیا، جومنا سا گلا پھاڑ کر یوں چلاتی کہ اس کے کالے جسمانی پس منظر میں چونچ کے اندر کی گلابی دنیا، گرم چیز سے ہاتھ چھو جانے کے سبب اچانک رواٹھے افریقی بچے کے دہانے ایسی معلوم ہوتی۔

نیلوفر مسکرادی تھی۔

جانے کیا تکلیف ہوتی ہوگی کوئل کو۔ شاید اسے سرد موسم پسند ہو۔ یا شاید اسے کوئی تکلیف نہ ہو اور وہ ہوک کی طرح کوکتی اصل میں چہکتی ہو۔۔ کسی کو پکارتی ہو۔ دور سے سنائی دیتی اس کی کوک اچھی لگتی ہے۔ سیاہ ساری کے آنچل سے سر اوڑھنے والی دوشیزہ کی طرح لگنے والی بی کوئل۔ یا شاید آم کے موسم سے جڑی ہونے کی وجہ سے آم کے شوقین لوگوں کیلئے کسی خوش کن پیشگوئی سی معلوم ہو۔

اُن دنوں جمیل احمد بیرونِ ملک سے لوٹتے وقت 'اڈیڈاس' کا نیا 'گولف کٹ' لے آئے تھے۔ پہلے کا سرخ اور سبز خانوں والا نہایت عمدہ اور نرم ریگزین کا اور اس کے علاوہ 'لاویا' کا بیش قیمت کٹ ہوتے ہوئے بھی۔ کیا ضرورت تھی بھلا اتنا مہنگا اضافی کٹ

خریدنے کی، جب دو پہلے سے ہی موجود تھے۔ اب ایک نیچے لابی کے ایک کونے میں ملازموں کے جھاڑ پونچھ کا کام بڑھانے کیلئے کھڑا رہتا ہے دوسرے دو اوپر کتابوں کی الماریوں کے درمیان دیوار سے لگے ایسے ساتھ ساتھ کھڑے کئے گئے ہیں جیسے تازہ تازہ بالغ ہوئے وہ ضرورت سے زیادہ صحت مند طلبا کو استاد نے کھڑا رہنے کی سزا دی ہو۔

مگر اب انسانی حقوق کا زمانہ ہے، یہ تشبیہ کچھ مناسب نہیں۔

نیلوفر مسکرا کر سوچا پھر دوبارہ کچھ سنجیدہ ہوگئی۔

اور شام کو بتی جلانے سے پہلے اگر یم تاریک کتب خانے میں نظر ڈالیں تو انسان دو دو گولف کٹ اچانک دیکھ کر کچھ پل کیلئے خوفزدہ ہونے سے خود کو روک نہیں پاتا کہ دو بڑے بڑے سروں والے جڑواں چور حملے کی تاک میں کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔

نیچے کمرے میں گولف کے تین کلب نظر آیا کرتے ہیں۔ چھوٹے غلاف کے اندر کونے میں۔ اکثر ہی بے حس و حرکت پڑے۔

جمیل صحت کی طرف دھیان دیں گے تو نبیل کو خوشی ہوگی، اور وہ صحت کی طرف جب ہی دھیان دیں گے جب خوش ہوں گے۔

خوشی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ مگر جمیل احمد نے اپنے لئے خوش ہونا سیکھا ہی کہاں تھا۔ خوش رہے کیلئے انہیں کسی اور کا سہارا چاہیئے۔

نیلوفر کی نظریں درختوں سے ہوتی ہوئی آسماں کی جانب اٹھ گئیں۔

خدا۔۔ خدا خوش رکھے۔۔ انہیں۔۔

نیلوفر کے دل نے دعا دی تو وہ چونک کر مسکرا اٹھی۔ پھر کچھ پل بعد اس کی مسکراہٹ اداس ہوگئی۔

ان کو خوش رہنے کی دعا دینا خود غمگیں ہونے کی بددعا ہو جائے تو؟

کہ وہ کسی اور کی خاطر ہی خوش رہیں گے۔

یعنی کسی اور کیلئے گنگنائیں گے۔

کسی اور کے ساتھ کہیں جائیں گے۔

شام کو دیر سے آئیں گے۔

تو۔۔؟

اچانک نیلوفر کو حلق کے بیچ تارکول کا گرم گرم گولا اٹکا محسوس ہوا۔

گھر۔۔دیر سے۔۔آئیں گے۔۔نبیل کی جانب سے لاپرواہ ہو جائیں گے۔۔

اور نبیل اپنی ماں کو اداس دیکھ کر۔۔

مگر نبیل اب بڑا ہو گیا ہے۔۔

گلے میں اٹکا گولا جیسے نرم پڑ گیا۔

اس نے غیر ارادی طور پر چائے کے مگ کو چھوا۔ حالانکہ اس میں کوئی چائے نہیں بچی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نبیل کھیلنے گیا ہے۔

نیلوفر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

نبیل اپنی بچہ گاڑی پارک لے گیا ہے۔

لوٹنے والا ہو گا میرا بچہ۔۔میری بچہ گاڑی۔

مسکراہٹ کچھ اور واضح ہو گئی۔

نیلوفر اندر کی طرف چل دی۔ مسکراتی ہوئی۔

کمرے میں آئی ٹھٹک گئی۔

جمیل صاحب نے سنگھار میز کے آدھے سے کچھ ہی کم حصے پر خوشبوؤں کا خاصا سامان کر رکھا تھا۔ متصل غسل خانے سے ان کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

تو۔۔جمیل اب پھر۔۔پھر کہیں مصروف ہو رہے ہیں۔۔ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اداس سی ہونے لگی تھی کہ پھر ایک خیال نے اسے پنی

طرف متوجہ کر دیا۔

یعنی جمیل ۔۔زندگی میں دلچسپی لینے والے ہیں۔

اور زندگی ۔۔ایک بار ملتی ہے۔

اور نبیل کہتا ہے کہ ۔۔

اور نبیل سچ کہتا ہے ۔۔

اس نے میز پر سے پان کے پتے کی ساخت کی گہرے نیلے رنگ کے کانچ کی ایک تازہ وارد شیشی ہاتھ میں لی اور ڈھکن کھول کر اسے اپنی ناک کے قریب لے گئی۔ خوشبو نہایت دلنواز تھی۔

'پیکو رے بین' برینڈ کی 'مردوں کیلئے خاص پرفیوم'۔

'ارمانی' کا حال ہی میں ڈیزائن کیا گیا سیاہ چشمہ سنگار میز کی خوش رنگ قیمتی پتھروں سی چمکتی ہوئی چیزوں کے درمیان کوہِ نور ہیرے کی مانند نمایاں تھا، اور پاس ہی 'بیل مین' کی نفیس گھڑی کا سرخ لو گو اپنی انفرادیت کا اعلان کر رہا تھا۔

قریب دو نئے 'کف لنکس' پڑے تھے اور ان کے پاس سیاہ رنگ کا 'موں بلاں' کا قلم رکھا تھا۔

یعنی کوٹ کی اوپر کی چھوٹی جیب سے جھانک کر چشمے کو مزید وقار عطا کرنے کیلئے، یا چشمے کے ساتھ نظر آ کر اپنا وقار بڑھانے کیلئے۔ اس نے آنکھیں میچ کر ایک بار پھر شیشی کو ناک سے چھوا اور آنکھیں کھول دیں۔ پھر چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔ چشمہ آنکھوں کے باہری گوشوں سے ہوتا ہوا کان تک کا حصہ ڈھکتا تھا۔

نیلوفر کے دادا جان ایک تصویر میں ایسا ہی چشمہ پہنے ہیں۔ نئے ڈیزائن اصل میں پرانے ڈیزائن ہوتے ہیں۔

اس نے گویا اپنے آپ سے کہا اور چشمہ اتار کر خود کو آئینے میں دیکھا۔

اسے معلوم ہوا کہ وہ اداس نہیں ہے۔

خوشی خود سے وابستہ رکھنے کی چیز تھی، وہ کہاں اسے جمیل احمد میں کھوجتی رہی۔

چار دن کیلئے ملی زندگی کو داؤ پر ہی لگا دیا۔

عمر عزیز کا ایک طویل حصہ کسی اور کیلئے ضائع کر دیا جب کہ ہر ذی روح کی ایک جدا دنیا ہوتی ہے جسے وہ اپنی ہی مرضی سے چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نے جمیل احمد کے انتظار میں اداس رہنا پسند کیا۔ جمیل احمد نے کسی اور کیلئے خوش رہنے کو ترجیح دی۔

اب جمیل احمد پھر زندگی میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

انہیں اپنے طور پر خوش رہنے کا حق ہے۔

مگر کسی اور کی خاطر؟

چلئے۔۔ کسی بہانے سہی۔

ایک انسان۔۔

کوئی انسان زندگی سے محبت کرنے لگا ہے۔

نیلوفر کچھ لمحے چپ چاپ آئینے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر دفعتاً پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔

☆☆

چار دن

انور ظہیر رہبر، برلن جرمنی

ترنم ریاض ایک معروف اردو افسانہ نگار، نقاد شاعرہ، مضمون نگار اور مترجم تھیں۔ وہ سرینگر جموں وکشمیر بھارت میں پیدا ہوئیں اور وہیں تعلیم پائی۔ انہوں نے افسانے، تنقید، شاعری اور ترجمہ کی پندرہ سے زائد کتب لکھی ہیں۔ بھارت کی کئی جامعات میں طلباء وطالبات نے اُن پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ترنم ریاض ہندوستان اور بیرون ملک فن اور ادب کے معزز اداروں میں لیکچر بھی دیتی رہی ہیں۔ ان کی کتابیں ہندوستان کے مختلف تعلیمی اداروں کے نصاب میں بھی موجود ہیں۔ اتنی جہت کی کسی شخصیت پر قلم اُٹھانا ہر کس وناکس کا کام نہیں ہے۔ مجھے محترم زاہد ظفر صاحب نے ترنم ریاض صاحبہ کا ایک افسانہ بھیجا ہے اور حکم صادر کیا ہے کہ میں ترنم ریاض کے افسانے پر تبصرہ لکھوں۔ انہوں نے جس خلوص ومحبت سے مجھے کہا اُس سے انکار ناممکن ہے۔ جب میں ترنم ریاض کی تخلیقات اور اردو ادب میں اُن کے بے شمار کارہائے نمایاں سے واقف ہوا تو بے اختیار مجھے بشیر بدر کا یہ شعر یاد آ گیا۔

تمہارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے
تمہارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا

اردو ادب کا باغ ایک سے ایک ادیبوں شاعروں اور افسانہ نگاروں سے سجا ہوا ہے جن کی خوشبو ہمارے ذہنوں کو معطر اور ہمارے قلم کو متحرک کرتی ہے۔ ترنم ریاض جنکی

تحریروں میں ترنم اُن کی اپنی مسلسل ریاضت سے ملاتھا اُس کے بعد ہی وہ ترنم ریاض بنیں اور اردو ادب میں اپنی ایک خوبصورت جگہ بنائی۔

مولانا آزاد اردو یونورسٹی لکھنؤ کی اسیسٹینٹ پروفیسر ڈاکٹر عشرت ناہید ترنم ریاض پر رقم طراز ہیں:

> ''اردو فکشن جو کہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی میں پوری طرح خواتین کے قلم کی گرفت میں نمو پا رہا ہے۔ان خواتین قلم کاروں میں ترنم ریاض ایک ایسا نام رہا ہے جس نے تخلیق کی مختلف جہات کو اپنی مخروطی انگلیوں کی جنبش سے خوبصورتی ہی نہیں عطا کی بلکہ سخت اور تلخ حقائق کو بھی تحریر کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کے بدلتے روپ کی عکاسی کی ہے کہ وہ صرف حسن وعشق کا مجسمہ نہیں جیتی جاگتی زندگی ہے جس پر حالات جب اثر انداز ہوتے ہیں تو وہ انہیں ضبط نہیں کرتی بلکہ ان آنسوؤں کو حروف کی شکل میں دنیا کو سونپ دینے کی جسارت بھی رکھتی ہیں۔''

ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھنے پر علم ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات زندگی کے روزمرہ کی کہانیاں ہیں۔کہیں وہ عورت کے استحصال کو اپنا موضوع بناتی ہیں تو کہیں انسانوں کے کچلے طبقے کے حالات ومسائل کو اپنے افسانے میں ڈھال دیتی ہیں۔آپ کے پاس سماج کے ہر رنگ کو جانچنے کا ڈھنگ موجود ہے۔

ان کے افسانے ''چار دن'' میں مجھے جو بات سب سے اہم نظر آئی وہ ہے آپ کی منظر کشی۔وہ اتنی عمدگی سے کی گئی ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس منظر میں ہی پاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی اس منظر کا کوئی حصہ ہے۔افسانے کے کرداروں کی ظاہری اور باطنی خوبیاں بھی یہاں بہت مرعوب کرتی ہیں۔سماج کا دردان کے اس افسانے میں ہر روپ میں نظر آرہا ہے۔افسانہ قاری کو آخر تک کئی سوالات میں الجھائے رکھتا ہے آخر میں جا کر

کہانی کھلتی ہے کہ انسان کی خوشی اس کے اندر بسنے والی ایک خوشی ہوتی ہے اور جو اپنی خوشی میں خوش رہنا چاہتا ہے اسے رہنے دینا چاہیے۔ میاں بیوی کا رشتہ ایک مضبوط رشتہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی اس میں دوری آجاتی ہے اس دوری کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن ضروری ہے کہ اگر اس دوری میں بھی کوئی خوش ہے تو اس کی خوشی کو اپنا لینا ہی اصل بات ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں جمیل کے کردار کو خوب تراشا گیا ہے۔ افسانے کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں:

"اب جمیل احمد پھر زندگی میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔
انہیں اپنے طور پر خوش رہنے کا حق ہے۔
مگر کسی اور کے خاطر؟
چلیئے۔۔ کسی بہانے سہی۔
ایک انسان۔۔۔
کوئی انسان زندگی سے محبت کرنے لگا ہے۔
نیلوفر کچھ لمحے چپ چاپ آئینے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر دفعتا پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔"

ان لائینوں کی خوبصورتی قاری کو ترنم ریاض کے اسلوب سے خوب آگاہی دیتی ہے اور سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ زندگی کا نام صرف حاصل کرنا ہی نہیں ہوتا کسی کو کچھ دے دینا بھی تو زندگی ہے۔ اس افسانے کے درمیان میں افسانے کے کردار نیلوفر کی جو گفتگو اپنے بیٹے سے بیان کی گئی ہے اس میں بھی عورت کی اپنے شوہر سے وفاداری بیان کی گئی ہے جب ہی وہ بیٹے کو بھی باپ کے احترام ہی کی تلقین کرتی نظر آتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی چلتی پھرتی کہانی ہے جسے ترنم ریاض نے بہت ہی خوبصورتی سے قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔

کسی بھی قلم کار کے صرف ایک ہی افسانے کو پڑھ کر اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے اس لیے میں نے ترنم ریاض کے اور بھی مختلف افسانوں کو پڑھا اور اچھے سے سمجھنے کے کوشش کی کہ ان کی تحریر ان کو کیوں منفرد بناتی ہے۔ ان کے مختلف افسانوں کو

پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ آپ کے افسانوں میں بہترین پلاٹ سازی، جذبات نگاری اور جزیات نگاری قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے اور ایک کامیاب افسانہ نگار کی یہی خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہ انسانی غم کو اپنا غم بنا کر پیش کرتی ہے اور یہی فن ان کو اپنے ہم عصروں میں منفرد بنا دیتا ہے۔ اور ترنم ریاض بلاشبہ افسانہ نگاری کی منزلیں اپنے قارئین کو دکھا دیتی ہیں۔

برآمدہ

''شہلا۔۔۔دو کپ چائے لے آنا یہاں اسٹڈی میں۔'' جنیدؔ کی آواز دل میں کلی سی چٹخا گئی۔بس ایک پل کے کسی حصے میں۔ جیسے ہوا سے جھولتے پودے کی شاخ پر جگنو چمک کر گم ہو جائے۔

مگر میرا دل جانتا ہے اور ایمان بھی کہ جنیدؔ کے تئیں میری نیّت ہمیشہ نیک رہی ہے۔اور اس بات کی گواہی کے لئے وہ شامیں موجود ہیں جو میں نے سہیل کے گھر میں نہ ہونے کی صورت میں اپنے کمرے کی جالی والی بند کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر باہر برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے تنہا گذار دیں کہ جالی سے لگ کر کھڑے ہونے میں میرے نظر آجانے کا احتمال تھا۔

برآمدہ بہت خوبصورت ہے۔قوس کی شکل میں بنا گیا ہے۔ درمیان میں تین کشادہ سیڑھیاں، سامنے مخملیں گھاس لئے ہوئے بڑے سے باغیچے کے چاروں کناروں پر گلاب کی کئی قسموں، رنگوں اور جسامتوں کی کیاریاں لگی ہوئی ہیں کہ ہر موسم میں باغیچہ گلوں سے مہکتا رہے۔ باغیچے کے عین درمیان میں کیکر کا چھاتا نما پیڑ اُگا ہوا ہے جس کے تنے کے پاس سفید رنگ کے پلاسٹک کی چار چھ کرسیاں اور ایک میز ہر وقت موجود رہتی ہیں۔

سہیل کہتے ہیں کہ باغیچہ میں نے خوب سجایا ہے۔جنید نے بھی یہی کہا تھا جب

کچھ مہینے پہلے وہ آیا تھا۔ وہ پھولوں میں خاصی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور پھر گلابوں کی توڑی گئی قلموں کی جگہ پولیتھین بندھا ہوا دیکھ کر یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ باغیچے کی برابر دیکھ بھال ہوا کرتی ہے۔ اصل میں میں نے کئی رنگ کے پھول ایک ہی پودے پر لگائے ہیں۔ ایسا کئی جگہ کیا ہے میں نے، کہیں دو طرح کے پھول کہیں تین طرح کے۔ کوشش رہتی ہے کہ کھل جائیں۔

جنید کو برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھنا بہت پسند ہے۔ دن کے کسی بھی پہر۔ وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کو ضرب کے سے نشان کی صورت گھٹنے موڑ کر، دیوار کے کونے سے ٹیک لگا کر، سگریٹ پیتا ہوا۔ ادھر ادھر دیکھتا کچھ سوچا کرتا ہے۔ یا کبھی دھوئیں کے مرغولے بنا کر باغیچے کی مشرقی دیوار کی طرف پھینکا کرتا ہے۔ شاید بے خیالی میں۔

مشرقی دیوار کی دوسری طرف، دوسری منزل کے سفید پینٹ کیے ہوئے بر آمدے کے بیچوں بیچ الگنی پر ایک سفید رنگ کی مہین شفون کا مقیش لگا دوپٹہ اکثر لہراتا ہے۔

میں بھی بے خیالی میں کئی کام کر دیا کرتی ہوں، ایک عجیب سی، مستقل سی گھٹن سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔ کبھی کچن گارڈن میں گوبھی کے ایک پودے کے پتّوں کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ ادھر ادھر ہٹا کر درمیان میں اُگ رہے گوبھی کے ایک پودے سے پتوں کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ ہٹا کر درمیان مین اگ رہے گوبھی کے پھول کا جائزہ لیتی ہوں۔ یا کبھی کھیرے کی بیلوں کو سہارے دینے والی لمبی لمبی لکڑیوں کو نکال کر دوبارہ ٹھیک سے گاڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یا پھر دیوار کے ساتھ ساتھ مستطیل شکل کے چمن میں اُگی سڑابیری کی ننھی ننھی کیاریوں کے ہرے ہرے خوبصورت پتوں میں چھپی قرمزی اسٹرابیریاں ڈھونڈا کرتی ہوں یا پھولوں اور سبزیوں پر آتے جاتے پرندوں کا مشاہدہ کرتی ہوں۔ مجھے کچن گارڈن میں مصروف دیکھ کبھی کبھی جنید بھی کمرے سے نکل کر میرے آنچل کے کونے میں بندھی اسٹرابیریز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر مسکرایا کرتا ہے۔

آج کل سہیل پھر سے مصروف رہنے لگے ہیں۔ ہمارا رشتہ آٹھ، نو برس پرانا ہے۔ ابھی سال بھر پہلے تک سہیل۔۔۔ دو، دو سال کے دو مصروف تین ادوار کے بعد تیسری

دفعہ چار برس تک مستقل مصروف رہنے کے بعد کچھ فارغ ہوئے تھے۔ پہلی بار ہماری شادی کو کچھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ وہ اچانک دفتر میں زیادہ وقت گزارنے لگے۔ میں اپنی نئی نویلی دنیا سنوارنے میں خوش تھی۔ سمجھ لیا کام کی زیادتی ہے۔ اپنی پسند کی خوشبو چھڑک کر، پالش کیے جوتوں کو اور زیادہ چمکانے کے خیال سے اپنے دوپٹے کے کنارے سے دو ایک ہاتھ مار کر، آیت الکرسی دم کر کے انہیں وداع کرتی اور بے فکر ہو کر گھر جنت میں جٹ جاتی۔

دو برس بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ مصروفیت کسی طویل رخصتی کی خالی جگہ عارضی طور پر پُر ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ میں نت نئے پکوان بنایا کرتی کہ قوت پذیر غذاؤں کے ہمیشہ شوقین رہے ہیں وہ۔ گفتگو کا موضوع عام طور پر غذا ہی ہوا کرتا۔ ورنہ وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے۔ میرے اندر بھی خاموشی ٹھہر سی گئی۔

ادھر پھر کچھ وقت سے وہ پھر مصروف ہو گئے۔ اس دفعہ جم (Gym) میں ہی۔ اب وہ دن میں دو وقت جانے لگے تھے صبح بھی اور شام بھی۔ کھلی ہوا، بدن اور کسرتیں۔

جانے جم پہنچتے بھی تھے مگر جاتے جم ہی تھے۔ یہ بات بھی عرصہ بعد معلوم ہوئی تھی۔ میں گھر کی ہو گئی تھی اور باہر لے جانے کے لئے ان کے پاس وقت نہ تھا۔

رات گئے گھر آتے۔ میرے بنائے کھانوں کو پسندیدگی سے نوش کرتے۔ میرا وجود رشتے کے تقاضے کا احترام جھیلتا۔ وہ خوابوں میں محو ہو جاتے۔

خود میں نے دن کے سبھی پہروں میں سے شام کو ہمیشہ سے ہی بہت پسند کیا۔ جب پرندے پرسکون سے چہچہائیں، جب گھاس اور پتے بھیگ جائیں، جب ہوا میں ہریالی کی خوشبو مل جائے، میں نیم تھکی کسی دیوار کے سہارے کھڑکی سے آسمان کے کسی حصے میں کسی اکیلے بادل کے ٹکڑے کو تیرتا ہوا دیکھوں اور کوئی پرندہ میرے کان کے پاس سے کچھ کہہ کر پھر سے گزر جائے

مگر اکثر میری شامیں اداس ہوتیں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میری شام اگر اداس نہ ہوتی تو شاید مجھے اس درجہ اپنی نہ محسوس ہوتی۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ہر شام اپنے ساتھ

رات لے آتی اور سیدھا دل کو چھیدتی ہوئی روح میں اتر جاتی۔ ڈھلتے چاند کی سیاہ، وسوں سے بھری تنہارات۔ مگر یوں بظاہر میرے پاس س خلش کا کوئی جواز نہ تھا۔ جانے خلا کہاں تھا۔

اور دو برس اور گزر گئے۔ یعنی ناطہ ۴ برس پرانا ہو گیا تھا۔ سہیل کا دیر سے گھر آنا میں ان کی عادت سے تعبیر کرتی۔ زندگی کچھ تنہا سی گزار رہی تھی میں۔ وہ پنی زندگی سے مطمئن تھے۔ مجھے محنت اور انتظار نے تھکا دیا تھا۔ چہرہ مرجھا گیا تھا۔

بچپن سے ہی گھر، اور باہر، دونوں جگہ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ قدرت نے مجھے نہایت فراخ دلی سے بنایا ہے۔ مجھے شاید اپنے وجود کے ہر طرح سے مکمل ہونے پر اس قدر اعتماد تھا کہ میں اپنی نام ونہاد گھر جنّت میں یہ سوچ کر مطمئن رہ سکنے پر بضد تھی کہ انہیں کبھی کوئی صورت بھائے گی ہی نہیں۔

اور اب میں اس موضوع پر سوچ کر اداس رہنے لگی تھی کہ وہ گھر آ گئے۔ پورے تین مہینے کے لئے۔ میں حیرت میں پڑ گئی میں انہیں ایک پیدائشی غیر گھریلو قسم کا لاپرواہ انسان اور غیر ذمہ دار شوہر سمجھ کر صبر کرنے کی کوشش میں غرق ہوا چاہتی تھی کہ وہ ایک ذمہ دار انسان کی طرح نظر آنے لگے۔ ان تین مہینوں میں، میں نے انہیں ایک محبت کرنے والے شوہر کی صورت میں ایک مخلص ساتھی کی شکل میں پایا۔ میں نے ان کا یہ انداز پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ امیدیں وہ خواب، جو نئی زندگی کے ساتھ، شوہر کی وساطت سے وابستہ تھے اور شادی کے کچھ مہینوں کے اندر ہی اپنی دل آزار تعبیر لئے سامنے آ گئے تھے، میں فراموش کر چکی تھی۔

بیاہتا زندگی کے سکھ کا اتنا ہی سرمایا یہ ہے میرے پاس۔ وہ تین مہینے۔ اور میں یہ بھی سمجھ گئی کہ سہیل کو ذمہ داریاں سنبھالنا آتی ہیں۔ رشتے نبھانے بھی جانتے ہیں وہ۔

تین مہینے گزر گئے۔

دفتر میں ایک پروجیکٹ پر کچھ کام شروع ہوا۔ کچھ سہیل کو تجربہ تھا کچھ انہیں نئے لوگوں کو کام سکھانا بھاتا بھی تھا۔ وہ کام میں ایسے جٹے، جیسے کام ان کے دفتر کا نہ ہو کر ان کا ذاتی ہو۔ اور وقت پھر سے پرانی رفتار سے گزرنے لگا۔ بلکہ اس دفعہ اس میں کچھ نئی ترمیمات

بھی ہونے لگیں۔ یکا یک انہیں گھر سے تمام دلچسپیاں ختم ہوگئیں۔ یعنی وہ جو تین مہینے پہلے اچانک پیدا ہوئی تھیں اور اب گھر رات کے ٹھہرنے کے لیے ایک سرائے ہوکر رہ گیا کہ رات کا انتظار ان کے کھانا کھا کر گھر آنے پر ختم ہوتا۔

میں سکون کی وادیوں میں سوئی ہڑ بڑا کر جاگ اُٹھی۔ ویرانی طبیعت کا مفہوم اچانک میری سمجھ میں آنے لگا۔ خالی پن کا احساس واضح ہوگیا۔ گزشتہ تین مہینے اگر انہوں نے میری زندگی سے متعارف نہ کرائے ہوتے تو میں شاید اس دفعہ بھی اس تبدیلی کو گذشتہ دو تبدیلیوں کی طرح سنجیدگی سے نہ لیتی۔ کچھ ایسا ہوا تھا جیسے زیست کے بے کراں ریگستان میں اچانک کوئی چشمہ پھوٹ پڑے اور چھوٹی سی ندی کی صورت، رفتار کے ساتھ صحیح سمت میں بہتا ہوا رہبری بھی کرے اور ٹھنڈک بھی پہنچائے، اور اچانک بیچ راستے میں دفعتاً ابلتے لاوے میں تبدیل ہو جائے۔ یا پھر طویل مسافت میں کوئی ہرا بھرا پیڑ کچھ دیر کے لئے اپنی چھاؤں میں لے کر تازہ دم کردے اور پھر اچانک آگ برسانے لگے۔

میں بے سکون و بے چین ہو اُٹھی تھی۔

''آپ بہت دیر سے آتے ہیں آجکل؟'' ایک دن جب وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے تو میں نے ضمناً بات کرنے کے انداز میں سوال کیا تھا۔

''کام بڑھ گیا۔۔۔ بہت۔'' وہ کہیں اور دیکھ کر بولے۔

''رات تک چلتا ہے کیا دفتر آپ کا؟'' میں نے آواز کی لغزش کو جو غصہ دبانے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی، قابوں میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''لوگوں سے ملنا بھی تو پڑتا ہے۔ یہ کیا کام کا حصہ نہیں ہے۔'' وہ بے تاثر آواز میں بولے جیسے انہیں معلوم ہو کہ میں یہ سوال کروں گی۔ اور انہوں نے جواب سوچ رکھے ہوں۔ کہ میری آواز کے اس انداز پر بھی وہ پُرسکون رہے۔

میں خاموش ہوگئی۔ میں گھر میں ایسی الجھی یا الجھائی گئی تھی کہ مجھے ان کی باہری دنیا کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ کس بنیاد پر بحث کرتی ان سے۔

کچھ دن اور بیت گئے۔ شک اور یقین کی جنگ میں، میں پریشان سی رہا کرتی کہ ایک دن ہماری رہائش گاہ کی مغرب کی جانب والے گھر کی ننھی سی بٹیا مجھ سے گلہ کرنے لگی کہ میں کل سہیل کے ساتھ گاڑی میں کہیں جارہی تھی اور اس کی مسکراہٹ کا میں نے جواب نہ دیا بلکہ اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ میں تو تھی نہیں گاڑی میں۔ گھر سے نکلے دنوں ہو گئے۔

اب سہیل کو مسئلہ حل ہوتا دکھائی نہ دیا تو قسموں کا دور شروع ہو گیا اور میں قسموں کا سچا جان کر کچھ وقت بغیر روئے گذارنے میں کامیاب ہو گئی۔

یہ سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا کہ سہیل اس مہارت سے جھوٹ بولتے تھے کہ دوسرے جھوٹ تک ان پر شک کرنے کا کوئی جواز نظر نہ آتا تھا۔ اور اب سوچتی ہوں کہ اگر انہیں جھوٹ بولنے پر اتنا ملکہ حاصل نہ ہوتا اور میں ان کے جھوٹ کو سچ نہ سمجھتی تو شاید اتنے برس کا تناؤ جھیلنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ سچ کے اندر سے جھوٹ نکال کر اس کامیابی سے پیش کرتے کہ جھوٹ ہی سچ معلوم ہوتا یا پھر جھوٹ اور سچ کے پھیر میں پڑ کر ایسا کنفیوژن پیدا ہو جاتا کہ ذہن کسی فیصلہ پر نہ پہنچ کر بے قرار بھٹکتا اور اصلیت کی تھاہ کو پانے میں ناکام بھی۔ روح بے درپے داغی جانے والی قسموں کے وار سے نڈھال ہوتی جاتی اور عمر عزیز نکلتی جاتی۔

ایک دن ان کے آفس البم میں کچھ تصویریں دیکھی۔ مختلف تقاریب کی۔ ساتھ ساتھ لگی ہوئی، کئی کئی زاویوں سے لی گئی تصویریں، میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سہیل اگر کسی گناہ میں گرفتار تھے تو یہ یقیناً گناہ بے لذت تھا۔ شکل وصورت میں کوئی بات نہ تھی۔ کسی بھی لباس میں کوئی جسمانی نقش دکھائی نہ دیتا۔ بازوؤں میں صرف کہنیوں کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ ساڑی میں بدن ایسا معلوم ہوتا جیسے بانس پر کپڑا لپیٹ دیا گیا ہو۔ نوعمری والی بات بھی نہ تھی۔ پھر کیا تھا میرے ساتھ دوست واحباب بھی حیران تھے۔

اور خودی بضد کہ محض کام کا تعلق ہے۔ پھر بھی، برسوں۔۔۔۔ میری نیند اور بھوک تقریباً ہر روز غائب ہو جاتی۔ اور پھر نئی یقین دہانیوں کے بوجھ سے دب کر میں نڈھال سی ہو جاتی کبھی کھا لیتی کبھی تکھن سے چور ہو کر میری آنکھ لگ جاتی۔

اور یوں سوتے جاگتے مرتے جیتے۔ روتے اور اداس ہوتے ہوتے چار برس اور بیت گئے کہ سہیل کو اچانک ٹھہرنا پڑا۔

پروجیکٹ جو مہینوں کا تھا بہر حال برسوں میں مکمل ہوا۔

انہوں نے حالات کے آگے سر جھکایا تو اپنے آپ کو وہیں پایا جہاں سے چلے تھے۔ مگر اس سے انہیں کوئی فرق پڑنے والا نہ تھا کہ سفر وہ منزل تک پہنچنے کے لئے نہیں کرتے تھے۔ خالی الوقت ہو کر الٹا وہ اپنے آپ کو نئے نویلے سفر کے لئے تیار پاتے

آج کل ان کی مصروفیات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ گھر جلد آتے ہیں سہیل۔ کہتے ہیں آفس میں زیادہ کام نہیں ہوتا۔

دراصل ہماری نئی پڑوسن پر ایک سانحہ گذر گیا ہے۔ اس کا تین برس سے علیل شوہر چل بسا ہے۔ اور وہ اپنی چھوٹی سی بچی لئے اکیلی رہ گئی ہے۔ ہم نے ہمیشہ اچھا ہمسایہ ہونے کی کوشش کی ہے۔ ہم سب کی یہ ہی خواہش تھی کہ فاخرہ کوئی کام وغیرہ کر کے نئی زندگی شروع کرے۔

سہیل بہت کوشش کر رہے ہیں اس کے لئے۔ اصل میں فاخرہ بارہویں جماعت سے آگے نہ پڑھی تھی۔ سہیل نے اسے کمپیوٹر سیکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کام کے لئے وہ اسے اپنی گاڑی میں لے جانے کو بھی تیار ہیں۔ گو کہ اسے کمپیوٹر کلاس کے قریب چھوڑ کر انہیں دوسری طرف سے گھوم کر دفتر کے لئے آنا پڑے گا۔ بہر حال انسان کی مدد کے لئے وہ ان معمولی چیزوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ اس نیک کام کے لئے انہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

فاخرہ کی مُنّی چار سال کی ہے۔ مگر روتی بہت ہے۔ اسے دن بھر میرے پاس رکھا جاتا ہے۔ سہیل کہتے ہیں کہ فاخرہ کی نوکری لگنے کی دیر ہے کہ مُنّی بھی اسکول جایا کرے گا۔

مُنّی جنید سے بھی مانوس ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی سے جنید جلد آجایا کرتا ہے۔ پھر مُنّی کے ساتھ باغیچے میں تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

جنید جب ہنستا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ خاموش پُرسکون باغیچے میں اس کا زندگی

سے بھرپور قہقہہ، دیر تک فضا میں گونجتا رہتا ہے۔ تب میں باورچی خانے کی کھڑکی پر آ کر باغیچے میں دیکھا کرتی ہوں۔

جنید کالج میں میرا جونیئر تھا۔ وہ میری دوست آرزو کا منگیتر ہے۔ ان کی منگنی نہیں ہوئی ہے انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھی ہو جانا خود ہی طے کیا ہے۔ جنید کی پی۔ ایچ۔ ڈی آخری مراحل میں ہے۔ جنید بھی میری طرح سہیل کے پسندیدہ طلباء میں سے تھا۔ جنید اور آرزو نے تعلیم جاری رکھی۔ میری سہیل سے شادی ہوگئی۔ پھر راستے الگ ہوگئے۔ جنید اسی شہر میں ہوسٹل میں رہنے لگا، آرزو اپنے شہر میں پڑھتی رہی۔ اب پڑھانے لگی ہے۔ پچھلے سال جب جنید اس سے ملا تو ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہوسٹل سے جنید کبھی کبھی سہیل سے کچھ علمی مدد لینے آتا رہا ہے۔ اب سہیل نے اسے گھر بلا لیا ہے کہ اب اس کے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ تھیسس داخل کرنے کے لئے۔ جنید سہیل کو بہت مانتا ہے۔ ویسے وہ اچھا ڈرائیور بھی ہے۔ مجھے گھر کی خریداری کے لئے جانا ہوتا ہے تو وہ ساتھ آتا ہے۔ سہیل کے کئی کام بھی کر ڈالتا ہے۔ میں جنید کے ساتھ ہوتی ہوں تو اپنے ہی قہقہوں کی آواز پہچان نہیں پاتی۔ بہت زندہ دل اور ہنس مکھ ہے وہ، مگر میں اس کے سامنے سنجیدہ رہنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہوں۔ کچھ مہینے بعد جنید چلا جائے گا تو۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔؟ ہاں تو پھر پھر منّی کس کے ساتھ کھیلے گی۔

ہمارے گھر کی ساخت کچھ اس طرح سے ہے کہ شام کے اختتام سے ہی میں چڑھتے اترتے چاند کو ہری ہری گھاس پر چاندنی بکھیرے اپنا منتظر پاتی ہوں۔ جنید اپنے کمرے میں جلدی چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی میز کے بلب کی روشنی دیر تک کھڑکی کے پردوں پر اس کا سایہ بنائے رکھتی ہے۔ جو میں سبزے پر ٹہلتے ٹہلتے دیکھا کرتی ہوں۔

جنید کے کمرے کی روشنی گل ہونے کے بعد فضا میں چاندنی کے ساتھ ساتھ اداسی بھی واضح ہو جاتی ہے۔ بجھی ہوئی روشنیوں والا گھر اور باغیچے میں تنہا چاندنی دیکھ کر میں کمرے میں آ جاتی ہوں۔ ویسے میری خوابگاہ میں مسہری اس زاویئے سے رکھی ہے کہ چاندنی زیادہ

سے زیادہ دیر تک میرے پاس رہے۔ جب سہیل آتے ہیں تب اکثر تھکی ہاری چاندنی کھڑکی کے ایک کونے پر ٹک کر، کچھ دیر ستانے کے بعد لوٹ جاتی ہے۔

جنید نے چائے کا ایک کپ مانگا ہے۔ میں ابھی نہا کر نکلی ہوں۔ چائے مجھے بھی پینی ہے۔ جبھی تو جنید نے دو کپ کہے ہیں۔ مگر یہ بالوں کا ڈھیر جو میری پیٹھ بھگو رہا ہے، کچھ نچڑ جائے، ذرا ہلکا ہو جائے تو۔ غسل خانے کے آئینے میں، میں نے ابھی ابھی نہا کر اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ عرصے بعد کھِلا کھِلا سا۔ جی چاہتا ہے کہ کسی سے پوچھوں کیا واقعی میں حسین لگ رہی ہوں آج، جیسے پہلے لگا کرتی تھی۔ یا کہ آج ہی میں نے خود کو غور سے دیکھا ہے۔ بہت پہلے سہیل بتایا کرتے تھے، پھر میں سہیل سے پوچھا کرتی تھی۔۔۔ اب کبھی کبھی فاخرہ بتایا کرتی ہے۔۔۔ کہ کس لباس میں میں کیسی لگتی ہوں، مگر اب فاخرہ کمپیوٹر کلاسز میں مصروف ہو گئی ہے۔ حوا کی ایک ضرورت مند بیٹی۔

فاخرہ کا قد کچھ چھوٹا ہے، بدن کچھ بھاری۔ بال چھوٹے، گھنے، گھنگھریالے۔ کچھ گول مٹول سی، کچھ نرم نرم سی ہے۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر جیسے کچھ تلاش کیا کرتی ہیں۔ فاخرہ ہلکے رنگ پہنتی ہے تو اس کی شخصیت میں وقار آ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ کبھی کبھی جب فاخرہ کی کلاس نہیں ہوتی تو وہ اور جنید دونوں منّی سے کھیلتے ہیں۔ جنید منّی کو لینے فاخرہ کے وہاں چلا جاتا ہے۔ اور بعد میں فاخرہ منی کو لینے ہمارے ہاں آ جاتی ہے۔ میں باغیچے کی میز پر چائے لگا دیتی ہوں۔ وہ دنوں خوش گپیاں کرتے چائے پیتے ہیں تو میں کچھ سنیکس بنا لاتی۔ جنید جب فاخرہ سے باتیں کرتا ہے تو باتوں میں ہی گم ہو جاتا ہے۔

ایک دن جب میں چائے کا پانی کیتلی میں انڈیل رہی تھی تو جنید باغیچے میں فاخرہ کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کا ہاتھ دائیں ہاتھ میں لیتا کبھی بائیں میں۔ کبھی ایک ہاتھ پر غور کرتا کبھی دوسرے پر۔ پھر کبھی شرارت سے مسکراتا ہوا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر جانے کیا کہتا کہ وہ زور سے ہنس دیتی۔ اس دن ابلتا پانی میرے ہاتھ پر گر گیا تھا۔ میں نے ہاتھ ٹھنڈے پانی کے نل تلے چھوڑ دیا تھا اور کھڑکی سے باہر باغیچے میں دیکھتی رہی تھی۔ جنید فاخرہ

کے دونوں ہاتھوں کو الٹ کر دیکھ رہا تھا۔۔۔۔فاخرہ مستقل مسکرا رہی تھی۔

ادھر آرزو جنید کے تصویر سے باتیں کر کے مسکرا رہی ہوگی۔۔۔۔مجھ سے جنید نے چائے مانگی ہے۔۔۔دو کپ اسٹڈی میں۔۔۔یعنی مین بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں۔۔۔وہ پڑھتے پڑھتے بور بھی تو ہو جاتا ہے۔کبھی کبھی برآمدے میں آجاتا ہے۔۔۔۔وہاں دونوں ٹانگوں کا کراس بنا کر زینے کی اوپری سیڑھی پر بیٹھ کر سگریٹ پھونکتا ہوا باغیچے کی مشرقی دیوار کے اُس طرف دوسری منزل کی بالکنی کو دیکھا کرتا ہے۔ جہاں فاخرہ کے ہلکے ہلکے رنگوں کے دوپٹے سوکھا کرتے ہیں۔ ہلکے رنگ پہننے کا مشورہ میں نے ہی دیا تھا اسے۔

پچھلے اتوار کو جب فاخرہ اور جنید باغیچے میں منی کے پیچھے دوڑ رہے تھے، تو سہیل اخبار چھوڑ کر باہر آ گئے تھے۔

''تمہارے پاس اتنا وقت ہے کہ تم اس کو یوں ضائع کرو؟'' انہوں نے اونچی آواز میں سہیل سے کہا تھا۔

''ذرا منی سے کھیل رہا تھا۔'' جنید نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

''فاخرہ تم یا تو اندر آجاؤ ورنہ جا کر آرام کرلو۔صبح تازہ دم ہو کر چلنا ہے کلاس میں تاکہ یکسوئی سے کچھ سیکھ سکو۔اپنے مستقل کے تئیں ذرا سنجیدہ ہو جاؤ تم۔'' سہیل جب یہ باتیں فاخرہ کو سمجھا رہے تھے اس وقت انکے پیچھے سے جنید نے فاخرہ کو دیکھ کر کچھ اس انداز سے جھک کر آداب کیا تھا کہ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ سہیل کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہوں نے ایسا کیا کہہ دیا جو وہ ہنس رہی ہے۔ پھر وہ یکلخت پیچھے مڑے مگر تب تک جنید اندر جا چکا تھا۔ پھر بھی مجھے سہیل کی آنکھوں میں غصے کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی ۔ فاخرہ بھی سر جھکائے منی کو انگلی تھمائے گیٹ کی طرف چل دی۔

دوسری صبح جب سہیل، فاخرہ کو ساتھ بٹھائے جا رہے تھے۔تو میں گیٹ میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ فاخرہ کو پچھلی سیٹ پر بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔مگر میں سہیل کا جواب جانتی تھی۔ وہ ضرور یہ کہتے کہ میں اس کا ڈرائیور نہیں ہوں۔شجر ممنوعہ کے ازلی طلبگار میرے ذہن میں یہ

جملہ بنا سوچے گونج اُٹھتا۔

میں گیٹ بند کر کے اندآ گئی اور عشق پیچاں کی بیل کے پاس سوکھ کر گرے ہوئے پھول چننے لگی۔ کچھ دیر بعد جنید لباس تبدیل کیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ یونیورسٹی جانے والا تھا۔

''غلام کو بھی کبھی خدمت کا موقع عطا فرمایا کریں۔ آخر یہ چھ فٹ کا جن کس دن کام آئے گا۔ میرے آقا۔ آپ اپنا لباس خراب نہ کریں۔ مجھے حکم دیں۔'' وہ کسی فلمی جن کی طرح ادب سے سر جھکائے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اس کام کے لئے طویل قامت کی نہیں کسی کوتاہ قد کی ضرورت ہے۔ جو یہاں کیاریوں کے پیچھے آسانی سے سما جائے۔'' میں نے مشرقی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں شہلا۔ وہاں تو ساری کی ساری خوبصورتی آپ کے پاؤں جتنی بھی نہیں ہے۔'' اس نے جھک کر میرا داہنا پاؤں چھو کر کہا۔ میں نے اس کے ایستادہ ہونے سے پہلے اس کے بال خراب کر دیئے۔ اس نے انہیں دوبارہ انگلیوں سے کنگھا کر کے سر کو ایک خاص انداز سے جھٹک کر سنوار دیا۔

''سہیل صاحب سے کہیے گا کہ ان کی اجازت ہو تو میں کل سے فاخرہ کو اپنے اسکوٹر پر کلاس چھوڑ دیا کروں۔ میرے تو راستے میں ہے۔ اور پھر کچھ پڑوس کا حق مجھے بھی تو ادا کرنا چاہئے۔ کچھ ثواب میں بھی تو کما لوں۔'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا

''خود کہنے میں ڈر لگتا ہے کیا۔'' میں نے شرارت سے کہا۔

''ہاں''۔ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ اور ہاتھ لہرا کر ہائے کہتا ہوا چلا گیا۔

اس دن میں دن بھر سوچتی رہی۔۔۔۔۔۔ اب جنید بھی۔۔۔۔۔

جنید نے چائے منگوائی ہے۔ وہ پڑھتے پڑھتے تھک گیا ہوگا۔ اس نے قلم رکھ کر سر کے بال دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے رگڑ کر بکھیر دیئے ہوں گے۔ اور ایک ہاتھ کے

انگھوٹھے اور لمبی انگلی کو دونوں آنکھوں کے باہری کونوں سے اندر کی طرف لاکر ناک کی جلد چٹکی میں بھر کر چھوڑ دی ہوگی۔ اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں ہوں گی۔ اس کی قمیض کا اوپری بٹن کھلا رہتا ہے۔ پنکھے کی ہوا سے اس کے گریبان میں سیاہ بال لہراتے ہوئے نظر آرہے ہوں گے۔ کچھ پل بعد وہ سگریٹ جلا کر کھڑکی سے باہر دیکھے گا۔ اس نے کرسی کا رُخ مشرق کی جانب کر رکھا ہے۔

میں نے چائے بنالی ہے۔ دو کپ چائے ٹرے میں سجا کر گیلری سے گزرتے ہوئے میں دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں اپنے سراپے کو ترچھی نظر سے دیکھ ڈالا۔ ہرے لباس میں، میں سدابہار پودے کی شاخ لگ رہی ہوں۔

جنید سے کہوں گی کہ اگر وہ کرسی کی پشت مشرق کی طرف کردے تو گیلری میں لگے آئینے میں سے میں اسے باورچی خانے میں دکھائی دیا کروں گی۔ پھر اسے چائے کے لئے آواز نہیں لگانا پڑے گی۔ صرف اشارہ کرنا ہوگا۔ مجھے جنید کا یوں سگریٹ پی کی دھوئیں کے دائرے باہر مشرقی دیوار کے رُخ پر پھینکنا ذرا بھی پسند نہیں۔۔۔۔ پتہ نہیں مجھے زیادہ کون سی بات ناپسند ہے ان دونوں میں سے۔ بہر حال وہ میری بات نہیں ٹالے گا۔ اور کرسی کو میز کے سامنے سے اُٹھا کر میز کی دوسری طرف رکھ دے گا۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔ ورنہ میں آرزو کو کیا جواب دوں گی۔

جب میں چائے کی کشتی لے کر کمرے میں داخل ہونے لگی تو وہ بڑی محویت سے کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اور دھوئیں کے دائرے بنا بنا کر باہر کی طرف اڑاتے ہوئے ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا۔۔۔۔ یعنی بالکنی میں۔۔۔۔

کچھ دیر دروازے پر رک کر میں کمرے میں داخل ہوگی۔ اسے میری آمد کا علم نہیں ہوا تھا۔ اور میں ذرا سی دیر میں سمجھ گئی کہ اس کے سگریٹ نوشی کرنے اور دھواں کھڑکی سے باہر پھینکنے میں سے مجھے کون سی بات ناپسند ہے۔

میں نے اسے متوجہ کرنے کے لئے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور میز تک چلی گئی۔

چائے کی کشتی میز پر رکھ دی۔ لگاتار اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور بغیر باہر کی طرف گردن موڑے میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھٹ سے بند کر دیئے اور باہیں پھیلا کر کھڑکی کے سامنے تن گئی۔

''اگر تمہیں کھڑکی کھولنی ہے تو آ کر مجھے یہاں سے ہٹا لو۔'' میں نے جنید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر کہا۔۔۔

اس نے سلگتی ہوئی سگریٹ، ایش ٹرے کے کونے پر ٹکا دی اور جب وہ آنکھوں میں شرارتیں لئے کرسی سے اٹھنے لگا تو پل بھر کو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ مگر اگلا لمحہ ضائع کیے بغیر میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

جلدی سے زینہ طے کر کے اپنی خوابگاہ کی پناہوں میں پہنچتے ہوئے میں یہ سوچ رہی تھی کہ۔۔۔ آرزو کو تو کوئی نہ کوئی جواب مل ہی جائے گا۔۔۔

اور خود مجھ کو۔۔۔۔؟

برآمدہ

نیلوفر ناز نحوی

ترنم ریاض ریاست جموں وکشمیر کی ایک مایہ ناز ہستی ہے جس کو بیک وقت ایک شاعرہ، ایک مصنف ایک افسانہ نگار اور ایک ناول نگار گردانا جاسکتا ہے۔انکی شاعری کی طرح ان کی افسانہ نگاری بھی بہت خوبصورت اور دلکش مانی جاتی ہے۔ان کے افسانوں میں جہاں داخلی کرب ودرد ملتا ہے وہاں ہی نفسیاتی پیچیدگیاں بھی دیکھنے کوملتی ہیں۔ان کے افسانوں میں منظرکشی بھی ہوتی ہے اور فطری احساس بھی پایا جاتا ہے۔ان کے افسانوں میں عورت کا کردار مختلف طبقوں سے ابھر آتا ہے اور اکثر طور پر عورت کی تنہائی اور مرد کی نظر اندازی اسکے افسانوں میں دیکھنے کوملتی ہے۔اس کے افسانوں کا مرکزی کردار اکثر عورت ہے۔اس نے عورت کا مطالعہ بغور کیا ہے اور اسکے اندروں سے واقف ہے۔

زیرنظر افسانہ اسکے افسانوی مجموعے 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' کا ایک بہترین افسانہ ہے۔اور یہ افسانہ عورت کی تنہائی اور مرد کی بے اعتنائی اور لاپروائی پر مشتمل ہے۔

اس افسانے میں تین مرکزی کردار ہیں۔شہلا، سہیل اور جُنید۔اور دو ذیلی کردار ہیں فاخرہ اور مُنی۔یہ افسانہ شہلا کی زبان سے ادا کیا گیا ہے اور واحد متکلم میں ہے۔سہیل شہلا کا شوہر ہے اور جُنید سہیل کا بھائی۔یہ افسانہ چائے کی دو پیالیوں سے شروع ہوتا ہے جو جنید شہلا سے مانگتا ہے۔یہ افسانہ اس لڑکی کی کہانی ہے جس کا شوہر سالوں سے ایک دفتر

میں کام کرتا ہے۔ابھی شادی کو کچھ مہینے ہی گذر گئے تھے کہ وہ اچانک دفتر میں زیادہ وقت گذارنے لگا۔اور اسکی نئی نویلی دلہن گھر کو سجانے اور سنوارنے میں لگتی ہیں۔ جب تک دو سال کا وقت گذر جاتا ہے۔

''میں اپنی نئی نویلی دنیا سنوارنے میں خوش تھی۔سمجھ لیا کام کی زیادتی ہے۔اپنی پسند کی خوشبو چھڑک کر، پالش کئے جوتوں کو اور زیادہ چمکانے کے خیال سے اپنے ڈوپٹے کے کنارے سے دو ہاتھ مار کر، آیت الکرسی دم کر کے انہیں وداع کرتی اور بے فکر ہو کر گھر جنت میں جٹ جاتی۔''

پھر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی اور میں دلچسپیاں لیتا پھرتا ہے اور بے چاری اسکی بیوی گھر میں نئے نئے پکوان پکاتی ہے۔ پوری آٹھ نو برس کی شادی میں اس نے صرف تین مہینے اا اسکے ساتھ اسطرح گذارے جیسے وہ ایک مخلص انسان تھا اور ایک محبت کرنے والا شوہر۔اسکے بعد پھر کام کی مصروفیت ایسی ہوئی کہ گھر رات گئے کھانا کھانے کے بعد آتے تھے۔پھر اسکی بیوی کو ایک ننھی بچی کے گلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے ساتھ گاڑی میں کوئی اور لڑکی تھی جب وہ ننھی بچی اسکو کہتی ہے کہ آپ نے میری مسکراہٹ کا جواب کل نہیں دیا جب آپ گاڑی میں تھی۔تب اسکو سمجھ آتا ہے کہ دفتر میں کام ایک بہانہ ہے۔وہ گھر سے نکلتا ہے اور ایک عرصہ تک باہر رہتا ہے۔ بیوی سے جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ اسکے بعد تب اسکا جھوٹ کھل جاتا ہے جب دفتر کی کسی لڑکی کے ساتھ البم میں اسکی تصویریں پائی جاتی ہیں۔

''یہ سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا کہ سہیل اس مہارت سے جھوٹ بولتے تھے کہ دوسرے جھوٹ تک ان پر شک کرنے کا جواز نظر نہ آتا تھا۔''

مردوں کی کس بات پر بھروسہ کیا جائے۔ جب انکی مصروفیات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔انکی نئی پڑوسن پر ایک سانحہ گذر جاتا ہے کہ اس کا تین سال سے علیل شوہر گذر جاتا ہے۔اور وہ چھوٹی سی بچی کے ساتھ اکیلی رہ جاتی ہے۔شہلا کے شوہر سہیل کے دل میں اچانک اسکی محبت جاگ جاتی ہے۔وہ اس کو روز اپنی گاڑی میں لے جاتا ہے تاکہ وہ کہیں

جا کر کمپیوٹر سیکھے اور زندگی اسکی آسان ہو جائے اور اسکی بچی کو شہلا کے پاس چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور اب اسکے شوہر کی دلچسپی اس بیوہ جس کا نام فاخرہ ہے اسمیں بھی بڑھ جاتی ہے۔

جب عورت کا شوہر کہیں اور منہ مارتا پھرتا ہے تو قدرتی طور پر عورت کو بھی وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو ان کا خیال رکھتے ہیں۔ شہلا بھی جنید میں دلچسپی لینے لگی اور جنید بھی اسکو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ جنید کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔

''جنید جب ہنستا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ خاموش پُرسکون باغیچے میں اس کا زندگی سے بھرپور قہقہہ۔ دیر تک فضا میں گونجتا رہتا ہے۔ تب میں باورچی خانے کی کھڑکی پر آ کر باغیچے میں دیکھا کرتی ہوں۔۔۔۔۔ جنید نے چائے کا ایک کپ مانگا تھا۔ میں ابھی نہا کر نکلی ہوں۔ چائے مجھے بھی پینی ہے۔ جبھی تو جنید نے دو کپ کہے''۔

یعنی جنید بھی اس کو سمجھ رہا تھا۔

آدمی جب اکیلی عورت کو پاتا ہے تو اس کو حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ اور عورت بھی ایسے ماحول کو پا کر ادھر ادھر منہ مارنے لگتی ہے۔ اگر اس کا اپنا شوہر محبت کرنے والا ہوتا اور اسکا خیال رکھنے والا ہوتا تو اسکو دوسروں کی محبت ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

''میں نے اسے متوجہ کرنے کے لئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میز تک چلی گئی۔ چائے کی کشتی میز پر رکھ دی۔ لگاتار اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور بغیر باہر کی طرف دیکھے گردن موڑے میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھٹ سے بند کر دئے اور باہیں پھیلا کر کھڑکی کے سامنے تن گئی۔۔۔۔ اس نے سلگتی ہوئی سگریٹ کو ایش ٹرے کے کونے پر ٹکا دیا اور جب آنکھوں میں شرارتیں لئے کرسی سے اٹھنے لگا تو پل بھر کو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔''

ایک غیر مرد بھی وہ چاہے اس کا دیور ہی کیوں نہ ہو وہ بھی گھر آئی مرغی کو حلال سمجھتا ہے۔

اس افسانے میں ایک اور بات کو بھی اجاگر کیا گیا تھا کہ بیوہ پر سب اپنا حق سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ وہ مفت کا مال ہو۔ حالانکہ اس بیوہ فاخرہ کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ تاکہ سمجھ آجائے کہ فاخرہ کوئی حور یا پری نہیں تھی جس پر اسکا شوہر عاشق ہو جائے اور اسکا دیور بھی مفت کی مٹھائی کھائے۔

''فاخرہ کا قد چھوٹا ہے۔ بدن کچھ بھاری۔ بال چھوٹے۔ گھنے گھنگھریالے۔ کچھ گول مٹول سی کچھ نرم نرم سی ہے۔ فاخرہ ہلکے رنگ پہنتی ہے تو اسکی شخصیت میں وقار آجاتا ہے ورنہ نہیں۔''

جہاں تک ترنم ریاض کی زبان اور لب ولہجہ کا سوال ہے وہ زبان دان ہے اور ایسے ایسے محاورے استعمال کرتی ہے کہ کبھی انسان حیران ہو جاتا ہے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہے اور اس کے افسانے قاری پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔ اور قاری دیر تک اسکے زیر اثر رہتا ہے۔ حالانکہ اسکے افسانے طویل ہوتے ہیں اور معنی در معنی اور کہانی در کہانی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس میں مرد کی بے وفائی اور بے اعتنائی صاف دکھائی پڑتی ہے۔

برف گرنے والی ہے

''سرکار نے بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کردی ہے۔'' حاجرہ نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ چاولوں کی پیچھ لگا اخبار چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے ہوا نہیں رکے گی۔کوئی گتے کا ٹکڑا تلاش کرو۔'' خضر محمد نے بیوی کی طرف دیکھا اور چولہے میں کل رات سے پڑی راکھ میں چلم سے بندھی ہوئی چمٹی کی مدد سے انگارہ تلاش کرنے لگا کہ تمباکو کے چوبی ڈبے میں سے اسے کچھ ادھ جلا تمباکو مل گیا تھا۔اور صبح سے اس نے حقے کا ایک کش بھی نہیں لگایا تھا۔

''تو پھر میں کیا کروں امّی ؟'' جاوید دونوں ہاتھوں کو آپس میں تیزی سے رگڑتے ہوئے باری باری والدین کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اپنے بابا سے پوچھو۔تنہا اس کی محنت سے ہم چاروں کا گزارہ نہیں ہوسکتا بیٹا۔ دونوالے چاول بھی مشکل ہو جائیں گے۔''

''تم اب بچے نہیں ہو بیٹا۔ بڑے ہو گئے ہو۔ میں بھی کمزور ہو گیا ہوں۔ مستقل زکام سے میرا سر درد کرتا رہتا ہے۔۔۔پھر تمہارے ہاتھ، انگلیاں بھی بڑی ہو گئی ہیں۔''

''مگر خواجہ صاحب تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری انگلیوں میں اب بھی بڑی نزاکت و نفاست ہے۔تم نمونوں کے بھی ماہر ہو گئے ہو۔ ابھی کچھ برس اور تم قالین بننے کا کام بہ آسانی کرسکتے ہو۔وہ میری تنخواہ بھی بڑھا رہے ہیں، بابا''

''مگر ہم کیا کر سکتے ہی۔ تمہیں کوئی مزدوری کا کام کرنا پڑے گا۔ یہ جو سماجی کارکنوں کا وفد تمہاری فیکٹری آیا تھا۔ وہ دوسری ملوں اور فیکٹریوں میں بھی گھوم رہا ہے۔ پھر خواجہ صاحب تو خود ڈر رہے ہوں گے تم لوگوں سے کام کروانے میں۔'' خضر محمد چلم سے بندھی چمٹی کی مدد سے چولے میں پڑی راکھ کے نیچے دبا آخری انگارہ نکال کر چلم میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہاں بیٹا۔ کچھ دن تو زور رہے گا۔ پھر شاید کچھ دیر خاموشی چھا جائے۔ یہ اجلیئے کپڑوں والے لوگ بڑی کھوکھلی ہمدردی

جتاتے ہیں۔ کون ماں نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ پڑھے لکھے۔ مگر وہ کیا جانیں بھوک کیا ہوتی ہے۔''

اخبار کھڑکی پر نہیں چپک پایا تھا کہ کل رات پکے چاولوں کی پیچھ کا آخری قطرہ تک جاوید احمد نے صبح اپنی چھوٹی بہن کو چمچ سے پونچھ کر پلا دیا تھا۔ اور اخبار ٹھیک طرح سے نم نہیں ہوا تھا۔ حاجرہ نے کاغذ موڑ توڑ کر چولہے کی طرف اچھال دیا۔

''اب کیا ہوگا'' اس نے پاس رکھی کانگڑی میں پڑی راکھ میں انگلی ڈال کر اُسے پیندے تک ٹٹول ڈالا۔ کانگڑی میں ایک چنگاری تک نہیں تھی۔ ساری راکھ ٹھنڈی پڑی تھی۔ گھر میں کئی دن سے کانگڑیوں کے کوئلے بھی ختم ہو چکے تھے اور لکڑی بھی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ چولہے کی تھوڑی بہت آگ ہی کانگڑیوں میں استعمال ہوتی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں کو پھرن کی آستینوں کے اندر سمیٹ کر مٹّی سے پُتی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پاس ایستادہ رہنے سے اسے سردی لگ گئی تھی اور آواز میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی۔

''اب سب ٹھیک ہو جائے گا امی۔'' جاوید احمد یاسمین کو گود سے اُتار کر ماں کے قریب لے گیا۔ حاجرہ نے بچی کو پھرن کے اندر باہوں میں سمیٹ لیا۔ ماں کے پھرن کے گریبان سے بچی نے بھی اپنا چھوٹا سا سر باہر نکالا اور ماں کے رخسار کے ساتھ ٹکا کر بھائی کو

دیکھتی ہوئی مسکرانے لگی۔

''کیسے ٹھیک ہوگا، بیٹا'' حاجرہ نے جاوید احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ خود حاجرہ کی آنکھوں میں دونوں جہاں کی نا اُمیدی تھی مگر جاوید احمد کی نظروں میں قندیلیں سی روشن تھیں ۔۔۔اس کی ٹھوڑی پر چند ایک سیاہ بال نمودار ہو چکے تھے اور کچھ گنتی کے کانوں کے پاس بھی اگ آئے تھے۔اس کی ناک اور رخسار سرخی مائل تھے اور گھنے گھنے بال ابھی بھی گیلے تھے گو کہ وہ کوئی دو گھنٹے پہلے سڑک کے اس پار طویل زینہ طے کر کے جہلم میں اتر کر نہا آیا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ سردی سے گھبراتا نہیں تھا۔ پھر گرم پانی اسے میسر بھی کہاں تھا۔ایک بالٹی گرم کرنے میں کتنا خرچہ ہو جاتا ہے۔وہ سوچا کرتا۔

''بہت پہلے سے میرے پاس ایک کام کی دعوت ہے۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ مگر بابا اب کیا کروں گا۔بس ذرا احتیاط کا کام ہے۔اور پیسہ ہی پیسہ۔''

''جاوید احمد بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بولا۔

''سچ ؟ پھر تم نے اب تک کیوں یہ کام شروع نہیں کیا۔ گھر میں راشن آجاتا۔تم لوگوں کے گرم کپڑے بھی۔ برف گرنے والی ہے۔ یہ رضائی اب چھوٹی پڑتی ہے۔

ہم چاروں اس میں سماتے بھی کہاں ہیں۔ آڑھی اوڑھنے کی وجہ سے تمہارے بابا تو بمشکل چھاتی تک لے پاتے ہیں اسے۔ایک بڑا سا لحاف بنوائیں گے۔ بہت سی روئی ڈلوا کر۔حاجرہ کے چہرے سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔

''تو پھر میں جاؤں۔امی۔بابا۔''

''لیکن کہاں جاؤ گے بیٹا۔'' خضر محمد نے بجھی راکھ اور راکھ ہوئے تمبا کو والا خالی حقہ گڑ گڑایا۔

''خلیل جو کے پاس۔'' جاوید احمد نے مٹی کی دیوار میں پھنسائے گئے چھوٹے سے آئینے کے سپتے ہوئے حاشیے پر کہیں سے بھی نہ نظر آنے والی گرد پونچھنے کے بہانے آئینے میں ماں باپ کے چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ارے نہیں بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ خدا نہ کرے کہ تم کوئی ایسا کام کرو۔'' خضر محمد نے حقہ سامنے سے ہٹا دیا۔ اور تشویش ناک نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔

''خدا کے لیے بیٹا۔ تم ایسا سوچنا بھی مت'' حاجرہ نے پھرن کے اندر سے یاسیمین کو نکال کر آبی گھاس سے بنی چٹائی پر لٹا دیا۔ اور اُٹھ کر بیٹے کے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

نہ میرے لعل۔ ہمارے پیٹ کے لیے اپنی زندگی مت بیچنا۔ بھوکی جی لوں گی۔ تمہیں کھو کر زندہ نہ رہ پاؤں گی۔ میرے بچے۔'' اس نے اپنے سوکھے لب جاوید احمد کے بالوں سے لگا لیے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''ایسا نہیں ہوگا امّی۔'' جاوید احمد ماں سے لپٹ کر بولا۔'' اتنے لوگ تو کرتے ہیں کام۔ کتنے ہی ہیں۔ جنہیں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ خواہ مخواہ دل ہار رہی ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھئے اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔''

''مگر اس میں دوسروں کی جانیں بھی تو جا سکتی ہیں اور وہ گناہِ عظیم ہے۔ اتنا بڑا خطرہ۔ اپنا دوسروں کا۔ نہ بیٹا۔ نہ۔۔۔''

حاجرہ نفی میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔ ''ایسا مت کرنا میرے بچّے۔''

''خلیل جو کہتے تھے ثواب ہے۔ کچھ ہو گیا تو شہادت نصیب ہوگی۔ مگر میں اپنا خیال رکھنا جانتا ہوں بابا۔ امّی کو سمجھائیے نا۔'' جاوید احمد کواڑ کے قریب بیٹھ کر اپنے جوتوں کا جائزہ لینے لگا۔ شکر ہے ابھی برف نہیں گری۔ بائیں جوتے کا تو تلا ہی الگ ہو رہا ہے۔ اسے سِلوانا ہوگا۔ وہ موزے پہن کر باپ کو دیکھنے لگا۔ کچھ دن بعد وہ اپنے لیے نہایت عمدہ جوتے خرید سکے گا۔ جیسے خواجہ صاحب کا بیٹا پہنتا ہے۔ لمبے لمبے فیتوں والے ہلکے پھلکے سے۔

''تم۔ تم تو میرے رحمدل بیٹے ہو۔ یہ کام کیونکر کر سکتے ہو۔ زندگیاں تو سب کی قیمتی ہوتی ہیں۔'' خضر محمد بیٹے کی پیروں کی طرف دیکھتا ہوا سمجھاتے ہوئے بولا۔ پھٹے موزوں میں سے جاوید احمد کی سرخ ایڑھیاں اور انگوٹھے بچوں کے پیروں کی سی نزاکت

لیے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''ابھی کل ہی کی تو بات ہے سرخ بیر بہوٹی سا ننھا منا وجود دائی مہرو نے خضر محمد کی باہوں میں تھمایا تھا۔ اسے خضر محمد نے بیس رپے کا نوٹ انعام میں دیا تھا۔ مہنگائی بھی تو اتنی نہ تھی۔ ہاجرہ نے پچیس روپے کے اون سے اپنے منے کے موزے، سویٹر اور ٹوپی تک بنی تھی۔''

دو جوڑے موزے بھی لاؤں گا اپنے لیے۔ خواجہ صاحب کے بیٹے کو کتنا لطف آتا ہوگا ویسے عمدہ جوتے پہن کر چلنے میں جاوید احمد سوچ رہا تھا۔ ایک دن جب فیروز میاں ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں جاتے وقت جاوید احمد کی ہوائی چپلیں پہن گئے تھے تو ان کا جوتا پائیدان سے ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے جاوید احمد حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اتنا مضبوط اور بھاری نظر آنے والا جوتا اور وزن نہ کے برابر۔ فیروز میاں چلتے کیا ہوں گے۔ اڑتے ہوں گے ہوا میں۔

''کیا سوچ رہے ہو بیٹے۔ بتاؤ نا۔ یہ کام تمہارے جیسے انسان کے لیے نہیں ہے۔ کچھ اور کام دیکھ لینا۔ دیکھتے ہیں خدا کی کیا مرضی ہے۔

کچھ دن ذرا صبر کرو۔ میں چشمہ بدل لوں گا تو باریک کڑھائی کا کام پھر سے شروع کروں گا۔ آمدنی بڑھ جائے گی۔ اس موٹی کڑھائی کے کام میں کمائی بہت کم ہوتی ہے۔ بس ذرا چار پیسے آجائیں تو ڈاکٹر۔۔۔۔''

''چار پیسے۔ کہاں سے آئیں گے بابا۔ بھوکے پیٹ کتنے دن اور کس امید پر انتظار کریں گے۔

یاسمین۔ بھوکی مر جائے گی۔ جانے خواجہ صاحب کب کام پر بلائیں۔ بلائیں گے بھی کیا معلوم۔ پھر گزارہ کہاں ہوتا ہے۔ بابا۔'' جاوید احمد جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔

''مگر یہ جان کا خطرہ۔ میرے بچے۔ جب جان ہی نہ رہے گی تو بھوک کسے لگے گی۔ تمہارے بابا کچھ کریں گے۔ تم فکر

مت کرو۔''

''جب تک جان ہے بھوک لگے گی ناں ماں۔ تمہیں لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے۔
میں جلدی آؤں گا۔تم فکر مت کرنا۔ جب میں آؤں گا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤں گا۔
اور مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا۔ اچھا بابا۔ خدا حافظ۔'' جاوید احمد نے تیزی
سے باہر نکل کر کواڑ بند کر دیئے اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا بائیں جانب کی گلی میں مڑ گیا۔

''ارے بیٹا سنو تو۔۔۔'' حاجرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مگر شدید دھند میں
اسے جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا۔ البتہ کہرے سے نم راستے پر اسے پھٹے تلے والے
جوتوں کے گھسیٹے جانے کی سماعت سے دور ہوتی ہوئی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی۔
دھڑکتا ہوا دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ خضر محمد کی طرف پلٹنے لگی تو وہ بھی دہلیز تک آ چکا تھا۔

''جاوید!''

ایک پکار فضا میں ابھری تو قریب کے کسی خزاں زدہ یخ بستہ درخت کی جمے ہوئے
کہرے میں لپٹی ننگی ٹہنی پر بیٹھا کوئی کوّا بولا اور اندر سے یاسمین کے رونے کی آواز آنے لگی۔

برف گرنے والی ہے

زاہد ظفر

نثر کی دوسری اصناف کے مقابلے میں صنف افسانہ نے بہت جلد ترقی کے پائیدان طے کر لیے۔اس مقام تک پہنچنے کے لیے پہلے رومانوی سپنے دیکھے، پھر حقیقت نگاری کا لباس پہنا، ترقی پسند سیڑھیوں سے گزرتے ہوئے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا دامن پکڑا، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ افسانے نے اپنے اس سفر کے دوران مختلف تجربات کا سامنا کیا۔اور ہر دور میں مختلف موضوعات اور مسائل کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں اپنے وجود میں سما کر انہیں پیش کرنے میں کامیاب رہا۔اور بعض ایسے ادیبوں کا سہارا بھی لیا جنہوں نے موضوعات اعتبار سے افسانے کی دنیا کو مالا مال کر دیا چاہے وہ پریم چند ہو یا منٹو، کرشن چندر ہو یا عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی ہو یا ترنم ریاض ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے جذبات، تجربات اور مشاہدات کو افسانے کے نام کر دیا..

جہاں تک ترنم ریاض کا تعلق ہے تو ان کی بیشتر کہانیاں انسانی جذبات کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔انسان محض ذی شعور ہی نہیں بلکہ جذبات بھی رکھتا ہے اور یہ جذبات انسانی زندگی میں عظیم قوت محرکہ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر روز انسان جذبات کا تجربہ کرتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو انسان زندگی جینے کے احساس کو محسوس نہیں کر پائے گا اور انسان کے لئے زندگی بس نام ہی رہ جائے گا۔۔البتہ ایک کہانی کار کے یہاں جذباتوں کو محسوس کرنا اور ان کو پیش

کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ایک عام انسان سے لے کر خاص وجود کو بھی اس کہانی کار نے جذباتی شعور کی بیداری سے سماج کے اہم پہلوؤں پر سوچ بچار کرنے پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ ترنم ریاض کے یہاں انسانی زندگی سے جڑے ہوئے نجی مگر حساس موضوع اور مسائل بڑے جذباتی انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ جب یہ نجی مسائل تحریر کی شکل میں قاری تک پہنچتے ہیں تو یہ نجی نہیں رہتے بلکہ ہر فرد کو ان میں کہیں نہ کہیں اپنا وجود نظر آنے لگتا ہے۔اس کا ثبوت ان کی ایک کہانی ''برف گرنے والی ہے'' میں با آسانی مل جاتا ہے۔ یہ کہانی ان کے افسانوی مجموعے ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' میں شامل ہے۔ پانچ صفحات پر مشتمل کہانی رسالہ انشائیہ کلکتہ سے پہلی بار چھپی تھی۔ یہ کہانی چار افراد پر مشتمل ایک غریب اور مفلس کنبے کی ہے۔خضر محمد، ان کی اہلیہ حاجرہ ان کا دس، بارہ سال کی عمر کا ایک بیٹا جاوید اور ایک چھوٹی سی بیٹی۔

غربت کی وجہ سے خضر محمد کا بیٹا جاوید چھوٹی سی عمر میں مزدوری کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن سرکار کی طرف سے بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد ہو جاتی ہے اور سارا کنبہ یہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ گھر کو کیسے چلایا جائے۔افسانے کے پہلے ہی اقتباس سے ایک بہت بڑے سماجی مسئلے سے پردہ سرکتا ہوا نظر آتا ہے۔افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔۔۔۔

> ''سرکار نے بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔
> ہاجرہ نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ چاولوں کی پیچھ لگا اخبار چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا''۔
>
> (افسانہ۔ برف گرنے والی ہے)

جہاں معصوم بچوں کے ہاتھوں میں کتابیں ہونی چاہئیں تھیں وہی ہمارے معاشرے نے ان کے ہاتھوں میں اینٹ، پتھر، جھاڑو جیسی چیز تھما دیں۔لیکن وہ کر بھی کیا سکتے ہیں! غربت اور خاندان کی معاشی بدحالی نے ان بچوں کو مجبوری کی دہلیز پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں تک ہمارے ملک ہندوستان کی بات ہے یہاں بچہ مزدوری عام ہے۔یہاں کے بچے

جوتا پالش، سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی چیزوں کی فروخت کے ساتھ ساتھ جان لیوا کام بھی کرتے ہیں جیسی کہ کوئلہ اور چٹانوں کی کانوں میں کام کرنا وغیرہ، حالانکہ ملک میں بہت سارے ایسے قانون بن چکے ہیں جن میں خاص طور پر بچہ مزدوری ایک جرم قرار دیا گیا ہے۔ 2016 میں حکومت نے بچے مزدوری پر روک تھام اور ریگولیشن ایکٹ 1986 میں ترمیم کی ہے۔ یہ ترمیمی قانون چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کے ذریعے کسی بھی پیشے اور طریقہ کار میں کام کرنے پر مکمل پابندی عائد کرتا ہے۔ اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو سخت سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر دیکھا جائے ایک طرف تو حکومت ایسے قانون بنا لیتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ایسے منصوبے نہیں بناتی جس سے ان خاندانوں اور کنبوں کی معاشی بدحالی دور ہو جائے اور ان کے بچے ایسے کاموں سے نجات پا کر اسکول کی راہ دیکھیں۔ حالانکہ ملک کی بہت ساری ریاستوں میں ایسے منصوبے بنائے گئے ہیں جن سے ایسے کنبوں اور خاندانوں کی مدد کی جائے۔ لیکن وہ سرکاری دفتروں تک ہی محدود رہتے ہیں۔۔ اسی لئے جاوید جیسے بچے اپنے ننھے ہاتھوں میں اسکول کا بستہ نہیں بلکہ اینٹ گارا اور پتھر اٹھاتے نظر آئیں گے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو..

> ''ہاں بیٹا۔ کچھ دن تو زور رہے گا۔ پھر شاید کچھ دیر خاموشی چھا جائے۔ یہ اجلے کپڑوں والے لوگ بڑی خوکلی ہمدردی جاتے ہیں۔ کون ماں نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ پڑھے لکھے۔ لیکن وہ کیا جانے بھوک کیا ہوتی ہے''
>
> (افسانہ۔ برف گرنے والی ہے)

ترنم ریاض نے افسانوں میں موضوعات کو بڑے ہی مہارانہ اور تحقیقی طریقے سے پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود اس ماحول میں کچھ وقت گزار کر افسانہ تحریر کرتی ہے۔ افسانہ ''برف گرنے والی ہے'' میں انہوں نے ایک غریب کمبے کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ ہر لفظ اور جملہ قاری کو احساس کی ہتھکڑیوں میں جکڑے رکھتا ہے۔ اس بات کا ثبوت افسانے

کے ان اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

(1).. ''اخبار کھڑکی پر نہیں چپک پایا تھا کہ کل رات پکے چاولوں کی بیچھ کا آخری قطرہ تک جاوید احمد نے صبح اپنی چھوٹی بہن کو چمچ سے پوچھ کر پلا دیا تھا''

(2) .. ''برف گرنے والی ہے یہ رضائی اب چھوٹی پڑتی ہے۔

ہم چاروں اس میں سماتے بھی کہاں ہیں۔آڑھی اوڑھنے کے وجہ سے تمارے بابا تو مشکل چھاتی تک لے پاتے ہیں۔

اسے ایک بڑا سا لحاف بنوائیں گے۔ بہت سی روئی ڈلوا کر۔ حاجرہ کے چہرے سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔

(3).. ''جب تک جان ہے بھوک لگے گی ناں ماں۔۔ تمہیں لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے۔ میں جلدی آؤں گا تم فکر مت کرنا۔

جب میں آؤں گا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤں گا۔''

کہا جاتا ہے کہ واقعات کی ترتیب میں تعمیری ربط کا ہونا قصے اور افسانے کی فطری پہچان ہے۔ترنم ریاض کے اس افسانے کی یہ ایک خوبی ہے کہ اس میں واقع بڑی ہی ترتیب سے بنا گیا ہے کہیں پے بھی قاری کو کوئی جھول نظر نہیں آتا شروع سے لے کر آخر تک قاری کی روانگی برقرار رہتی ہے۔کہانی میں واقع کی ترتیب قایم ہے اسلیے قاری اودھر ادھر بھٹکنے سے بچ جاتا ہے۔اس افسانے کا پلاٹ سادہ ہے کیوں کہ اس میں مصنفہ نے واقعات کی ابتدا، وسط، اور انتہا کا خیال رکھا ہے۔اب یہ کہنا ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے کہ اس افسانے کا پلاٹ ہی اس کی جان ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کی بات کی جائے تو اس افسانے کے تین مرکزی کردار اور ایک جامد کردار ہے مرکزی کردار میں خضر محمد، حاجرہ، اور ان کا بیٹا جاوید احمد ہیں اور جامد کردار ان کی ایک چھوٹی سی بیٹی ہے۔تین مرکزی کرداروں کی گفتگو کہانی کو آگے بڑھاتے

ہوئے اختتام پر پہنچاتی ہے۔اس افسانے کا ہر ایک کردار اپنی الگ الگ پہچان بنائے ہوئے ہے۔اس افسانے کے تینوں مرکزی کردار اپنے جزبات کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور یہی اس افسانے کی کامیابی ہے۔کرداروں کے صحیح احساسات وجذبات کا اندازہ مکالمے کی مدد سے لگایا جا سکتا ہے۔مصنفہ نے اس افسانے کی تعمیر میں مکالمے کا استعمال اتنے خوبصورت انداز میں کیا ہے کہ مکالمہ ہی اس افسانے کی بنیاد مان لینی چاہیے۔ موضوعات اعتبار سے اگر چہ یہ کہانی روایتی انداز کی ہے۔لیکن مکالمہ نے اس میں روح ڈال کر ایک مکمل وجود تیار کیا جس سے افسانے پڑھنے والوں کے سامنے اس واقعے کا پورا نقشہ آجاتا ہے۔

مصنف اس افسانے میں سماج کے مختلف مسائل کو ایک ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔خضر محمد نے بھی اپنے بیٹے کی طرح بچپن سے ہی کڑھائی کا کام شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی بینائی کمزور ہو چکی تھی افسانہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو...

''میں چشمہ بدل لوں گا تو بھاری کڑھائی کا کام پھر سے شروع کروں گا-آمدنی بڑھ جائے گی اس موٹی کڑھائی کے کام میں کمائی بہت کم ہوتی ہے بس ذرا سا چار پیسہ آجائے تو ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔''

خضر محمد کا بیٹا دس یا بارہ سال کا ہو چکا تھا۔اور وہ بھی کسی فیکٹری میں کڑھائی کا کام کر رہا تھا۔لیکن سرکار کی طرف بچہ مزدوری پر روک تھام کی وجہ سے اسے فیکٹری سے نکال دیا گیا تھا۔جس کی وجہ سے گھر میں کچھ دنوں سے فاقہ کشی چل رہی تھی جاوید سے اپنی ماں اور بہن کا یہ حال نہ دیکھا گیا۔اسی لیے جاوید مجبوری میں غلط قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ایک ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس میں جان کا خطرہ ہے لیکن پیسے بہت ہیں۔افسانہ سے اقتباس ملاحظہ ہو۔۔۔۔

''جاوید احمد ماں سے لپٹ کر بولا'' اتنے لوگ تو کرتے ہیں کام۔

کتنے ہی ہیں۔ جنہیں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔

آپ خواہ مخواہ دل ہار رہی ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھے اب میں بڑا ہو گیا ہوں''

''مگر اس میں دوسروں کی جان بھی تو جا سکتی ہیں اور وہ گناہ عظیم ہے۔ اتنا بڑا خطرہ۔ اپنا بھی دوسروں کا۔ نہ بیٹا۔ نہ...... حاجرہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی. ''ایسا مت کرنا میرے بچے''

(افسانہ۔ برف گرنے والی ہے)

مصنفہ نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریب لوگوں میں جسمانی اور قانونی رسک لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سماج میں مختلف قسم کے جرائم بڑھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر ایسا کام کرنا پسند کرتے ہے جس سے ان کی وقتی حاجت مکمل ہو۔

اس سال ایک جریدہ میں بھی اس موضوع پر تفصّل میں بحث کی گئی تھی لکھا تھا۔۔۔

''جریدہ 'سائیکولوجی سائنس' کے جنوری کے شمارے میں شائع ہونے والی تازہ ترین تحقیق میں دنیا کے غریب ممالک کے لوگوں میں جسمانی، سماجی، قانونی اور مالیاتی رسک لینے کی خواہش کا اظہار ہوا ہے۔''

اس افسانے میں جاوید کی باتوں سے کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ وہ کچھ ایسا کرنے جا رہا ہے جو قانون کے خلاف ہے۔ حالانکہ جاوید احمد کے ماں باپ یہ سب کرنے سے انہیں بہت روکتے ہیں۔ وہ ان کے بڑھاپے کا سہارا جو ہے۔ لیکن جاوید اپنے ماں باپ اور بہن کو ایسی حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے وہ گھر سے نکل جاتا ہے اور گھر والوں کو یقین دلاتا ہے کہ وہ واپس آئے گا اور جب آئے گا گھر کا سارا سامان لے کر آئے گا۔۔ افسانے سے اقتباس۔۔۔

''ارے بیٹا سنو تو... حاجرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مگر شدید

دھند میں اسے جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا۔ البتہ کھرے سے نم راستے پر اسے پھٹے تلے والے جوتوں کے گھسیٹے جانے کی سماعت سے دور ہوتی ہوئی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دھڑکتا ہوا دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ خضر محمد کی طرف لپٹنے لگیں تو وہ بھی دہلیز تک آ چکا تھا۔

''جاوید!''

''ایک پکار فضا میں ابھری تو قریب کے کسی خزاں زیادہ یخ بستہ درخت کے جمے ہوئے کہرے میں لپٹی ننگی ٹہنی پر بیٹھا کوئی کوا بولا اور اندر سے یاسمین کے رونے کی آواز آنے لگی۔''

اور اس طرح یہ افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

پاکستان کی ایک معروف مصنفہ سمیرا عابد ترنم ریاض کے افسانے "برف گرنے والی ہے" کے بارے اپنی اظہار خیال کچھ اسطرح کرتی ہیں۔۔

''ترنم ریاض کے افسانوں میں جب احساس کا ترنم اور رفو گری کی ریاضت جھانکتی ہے تو وہ انہی تحریر میں دکھنے لگتی ہیں۔

زیر نظر افسانے ''برف گرنے والی ہے'' میں جہاں کشمیر کے موسم سانس لیتے ہیں وہاں غربت کا زہران سانسوں میں سرایت کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ جہاں سفید کپڑوں والے چائلڈ لیبر تو روکتے ہیں لیکن اسی بچے کے جوتے کے ٹوٹے ہوئے تلے سے سرایت کرنے والی سردی نہیں روک سکتے۔۔۔۔ دراصل یہ افسانہ نہیں، یہ ایک بارودی سرنگ تشکیل پانے کی داستان ہے۔۔۔۔ جس کی زد میں خضر محمد، حاجرہ، یاسمین اور جاوید احمد کی نوخیز جوانی سلگنے سے راکھ ہونے کا سفر طے کر سکتے ہیں۔

افسانہ پڑھتے ہوئے دل زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے آنے والی ہوا قاری کے بدن میں سرایت کرتی ہے۔۔۔ اور جوتوں کے اندر جرابوں میں لپٹے پیر جاوید احمد کی طرح سردی سے سکڑ جاتے ہیں۔ کہیں قاری کے جوتوں

میں لفظوں کی کاٹ نے سوراخ تو نہیں کر دیے۔

ترنم ریاض کی افسانہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ صرف ایک منظر پر مشتمل افسانے کو انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل کی داستان بنا دیا ہے۔ جہاں لحاف کی طلب میں گئے سالوں کی بے رحم خنکی بدن میں سرایت کرتی ہے، وہیں مستقبل میں کسی انہونی کا خوف دھڑ کنے لگتا ہے۔ اور حال۔۔۔ جو مٹھی بھر چاولوں سے خاندان کی شکم سیری کے لئے بھی ترس رہا ہے۔ ایک سلگتے انگارے کی تلاش میں ہے۔۔۔ ماضی، حال اور مستقبل کے یہ رنگ ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔

افسانے میں جزئیات نگاری عروج پر ہونے کے باوجود تفاصیل قاری کو بوجھل نہیں کرتیں بلکہ اس کا ہاتھ تھام کر تصویر کے اندر لے جاتی ہیں۔ ٹھنڈے حقے میں انگارے کی تلاش سے کانگڑی کی ٹھنڈی راکھ کا سفر لمحوں میں طے ہوا لیکن صدیوں کی مسافت پر محیط تھا۔

چاولوں کی پیچ جو یاسیمن کا پیٹ بھرنے سے لے کر کھڑکی کے پٹ جوڑنے تک کفایت کرتی تھی۔۔۔ ان کے گھر کا منظر قاری کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

کچھ الفاظ مستعمل اردو کی بجائے عام بول چال سے لیے گئے ہیں، جیسے پھرن، جسے عام طور پر فرن لکھا جاتا ہے۔ پچھ، پتے ہوئے حاشیے، پتے ہوئی دیوار۔۔۔ ان الفاظ کے استعمال نے تحریر کو اپنائیت کا رنگ دیا ہے۔

تحریر کشمیر کے پس منظر میں ہے لیکن مسئلہ کشمیر کے سیاسی پہلو سے پہلو تہی کر کے صرف انسانی پہلو کو سانے لاتی ہے۔ شاید یہ امر اس تحریر کو زمان و مکاں سے آزاد کرتا ہے۔

اور صرف یہ پیغام دیتا ہے کہ ''برف گرنے والی ہے۔''

باپ

باپ پرانی ادھ ٹوٹی ٹائیلوں والا برآمدہ طے کرر ہا تھا۔ ٹائیلوں کا رنگ زرد تھا، ان کی چمک غائب ہو چکی تھی ۔ اور قدم پڑنے سے وہ آوازیں پیدا کر رہی تھیں ۔ اور کچھ باپ کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے لڑکھڑا نہ رہا ہو بلکہ جان بوجھ کر قدم ایسے اُٹھا رہا ہو جس سے چاپ سنائی دے، غیر متوازن ہی سہی۔

باپ کے ہاتھ میں اخبار میں لپٹا ہوا ایک بنڈل تھا۔ جس کی دونوں اطراف کوئی سرخ رنگ کی گول گول موڑی ہوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ شاید کوئی کپڑا تھا۔

نہایت مختصر سے صحن کے ایک طرف لگے ہوئے نل کے پاس برتن دھو رہی ناظمہ نے ادھ منجھی تھالی نل کی چوہدی پر رکھ دی اور نل کی گردن کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی ۔ اپنے نیم لاغر وجود کو اس نے صحن کی دیوار سے ٹکا دیا۔ دیوار سے کچھ مٹی بھر بھرا کر اس کے پیروں کی ایڑھیوں کے پاس جمع ہوگئی ۔ باپ کے ہاتھوں میں سرخ بنڈل دیکھ کر اس کی بجھے دیئے جیسی آنکھوں میں مہین سی چمک لہرا گئی ۔ سرخ بنڈل کوئی گرم کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

اس موسم میں ایک شال سے بڑھ کر کیا چیز آرام دے سکتی تھی ۔ گو کہ ابھی سردیوں نے شدّت نہیں پکڑی تھی ۔ مگر ٹھنڈے پانی سے اس کے پیلے پیلے ہاتھ گلابی ہو گئے تھے ۔ دو دن سے وہ اسکول بھی نہیں گئی تھی کہ اس کے اکلوتے سویٹر کی کہنیاں گھستے گھستے کلائیوں تک آ گئی تھیں اور آستینیں کیلے کے چھلکے کی طرح لگتی تھیں۔

ناظمہ ہفتے میں دو یا تین دن ہی اسکول جا پاتی ۔ وہاں سرزنش ہوتی ، وہ گردن جھکائے کھڑی خاموش سُنا کرتی ۔ ایک پیر کی انگلیوں سے دوسرے پیر کی انگلیوں کو رگڑتی ہوئی ۔ چور نظروں سے ہم جماعتوں کو دیکھتی ہوئی ۔ جیسے اس نے اپنے چھوٹے سے وجود میں بڑے بڑے اسرار چھپا رکھے ہوں۔

اسے گھر بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ کچھ سلائی بھی کرنی پڑتی تھی۔ اسکا اپنا اختیار ہوتا تو اسکول جانا چھوڑ ہی دیتی۔ اس کے پاس پڑھنے کے لیے وقت بچتا تھا، نہ اسے اس طرح کا ذہنی سکون میسر تھا جو طالب علموں کے پڑھنے کا محرّک بن سکے۔ اس کی کوئی سہیلی تھی نہ اس کا کسی سے کسی مضمون میں مقابلہ یا شوق ۔ وہ تو بس اپنی امی کے کہنے سے اسکول چلی جاتی تھی کبھی کبھی ۔

امی روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں ۔ ابھی سال بھر پہلے خاصی تندرست اور جاذب تھیں ۔ مگر باپ نے ایک دن ایسا مارا پیٹا کہ بہت دن تک بستر سے ہل نہ سکیں ۔ اندرونی اعضاء میں چوٹ لگی تھی ۔ انہیں کہیں ۔ غذا سیال کی شکل میں چمچ سے منھ میں ڈالی جاتی ۔ ہفتہ بھر بعد ناظمہ کو پاس بلا کر اس کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کچھ ایسا کہہ دیا تھا کہ ناظمہ ہچکیاں لے کر رو پڑی تھی۔

''روؤ گی تو اپنے آپ کو اپنی بہنوں کو کیسے۔۔۔۔۔۔سنبھال سکو گی، بیٹا۔''

امی نے پاؤں فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ناظمہ کے کندھے کا سہارا لیکر چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک آنسو اُن کی پلک پر اٹکا ہوا تھا۔ وہ سیدھی کھڑی نہیں رہ پا رہی تھیں ۔ اتنی تکلیف سہنے کے باوجود ان کے چہرے کے رونق کچھ ایسے کم نہیں ہوئی تھی ۔ لگتا تھا کوئی ہرا ابھرا پیڑ طوفان کی زد میں آ کر عین درمیان سے ٹوٹا چاہتا ہوں ۔ وہ صرف ذرا کمزور لگ رہی تھیں۔ مگر جب ناظمہ انہیں غسل خانے کی چوکی پر بٹھا کر سیدھی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ان کی ٹانگوں پر سیاہی مائل سرخ رنگ کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد سے امی کے بستر کی چادر بے داغ نہ رہ سکی اور آہستہ آہستہ ان کی

صحت گرتی ہی چلی گئی۔ تب سے مہینوں گذر گئے۔ خدا جانے کتنا خون ہے ان کے جسم میں جو مہینوں سے لگاتار بہہ رہا ہے اور ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ امی اب اتنی دبلی ہوگئی ہیں کہ اگر ان کی ڈھیلی سی چارپائی پر چادر تان کر بچھا دی جائے تو معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ وہاں کوئی لیٹا بھی ہے۔ اور باپ کے لئے تو ویسے بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہوگئی تھیں۔

امی کو کتنا ارمان تھا اپنی بچیوں کی اونچی تعلیم کا۔ وہ خود ہی محنت مشقت سے ان کی پڑھائی کا خرچ پورا کرتیں۔ اس میں باپ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ باپ کو اپنے علاوہ گھر میں کسی اور کی بہبودی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہاں امی کے پٹی لگ جانے کے بعد وہ صرف ناظمہ کو ہی ہر کام کے لیے بلاتا۔

وقت بے وقت وہ باپ کے کمرے میں ہوتی۔ امی کھٹیا پر پڑی کراہتیں۔ نحیف آواز میں ناظمہ ناظمہ پکارتیں۔۔۔۔ اور ناظمہ دیر بعد سسکتی، لڑکھڑاتی آتی۔ امی کے چارپائی کی پائنتی پکڑ کر گرسی پڑتی۔ امی، باپ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ دیکھ کر جانے کیا کیا بڑ بڑاتیں۔۔۔ ہاتھ دعا میں اُٹھاتیں۔۔۔۔ آنسو بہاتی ہوئی، نقاہت بھری آواز میں سانپ سانپ چلاتیں اور بے ہوش ہو جاتیں۔ ان کے گردن ایک ہی طرف کو اس طرح ڈھلک سی جاتی جیسے گردن میں سہارے دینے کے لیے ان کی کھال کے اندر، کہیں کوئی ہڈی ہی نہ ہو۔ ڈھلکی ہوئی کھال والی یہ گردن بھی کبھی کسی صراحی کی طرح ہوگی، اس کا یقین کرنا مشکل تھا۔

باپ، امی کو کبھی ڈاکٹر کے پاس لے کر نہ گیا۔ اس کے پاس پیسہ ہی کہاں تھا۔ اس کے تو اپنے ہی اخراجات بمشکل تمام پورے ہوتے۔ ٹوٹے پھوٹے ٹرانزسٹرس (Transistors) کی مرمّت کر کے وہ اپنی مے نوشی اور ایک وقت کی روٹی کا بندوبست ہی کر پاتا تھا۔

اور امی۔۔۔۔؟ ان کی تو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں ہی ان کا مائیکا بھی تھیں اور سہیلیاں بھی۔ باپ کے ہاتھ میں بنڈل دیکھ کر شائستہ اور ساحرہ نے بھی کتابوں سے نظریں ہٹالیں تھیں۔ شائستہ سب میں چھوٹی تھی۔ کوئی دس برس کی۔ گول مٹول سی۔ بغیر کھائے پیئے بھی تروتازہ نظر آنے والی۔ امی اپنی بیماری سے پہلے اسے خوامخواہ ہنستے رہنے پر بہت ڈانٹا

کرتی تھیں۔اب امی اسے کچھ نہیں کہتیں۔اب وہ ہنستی بھی نہیں۔امّی کے سرہانے پہروں بیٹھ کر کبھی ان کے بالوں میں ننھی ننھی انگلیوں سے کنگھا کرتی، کبھی ان کا ماتھا سہلاتی۔اور کبھی ان کا سر اپنے چھوٹے سے زانوں پر رکھ کر لوری گاتی۔ایسے ہی جیسے کبھی امی گایا کرتی تھیں۔

چھوٹے سے پلنے میں سوئی ہے گڑیا
ننھے خیالوں میں کھوئی ہے گڑیا
نندیا سے بھاگے جب دیکھو جاگے
گڑیا نہیں ہے یہ آفت کی پڑیا
کوئی شرارت کرتی رہے گی
بس نیند سے صرف لڑتی رہے گی
پریوں نے آ آ کے جھولا جھلیا
بلبل نے گا گا کے نغمہ سنایا
تتلی نے پنکھوں کی پنکھی بنائی
جب جا کے اس کو کہیں نیند آئی
اک آنکھ کی بند کر کے کٹوری
دوجی سے دیکھے مگر چوری چوری

بہت پہلے جب امی آخری دو مصرعے گایا کرتی تھیں۔تو اس وقت شائستہ ایک آنکھ میچ کے، لبوں پر شرارت بھری مسکان لیے امی کو دیکھا کرتی۔اور امّی اس کا مکھ چوم کر اسے گدگدی کر ڈالتیں۔تب وہ خوب خوب ہنس دیتی تھی۔

تب بات اور تھی۔ جب وہ چھوٹی سے ہوا کرتی تھی۔مگر اب تو شائستہ اپنی امی سے بھی بڑی ہو گئی تھی۔اسے امی کی امّا ہو جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ایک سوگوار سا سکھ اس کئے منے سے دل میں ٹھہرتا۔

اس نے بہت پہلے بھی یہ چاہا تھا کہ وہ امی کو لوری سنا کر اپنے زانو پر سلا دے۔مگر

ہنستی ہوئی امی کو۔ نم نم سی آنکھوں والی اس امی کو تو وہ بس دیکھتی رہتی۔ کبھی گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر پانی کے کئی کئی چمچے پلا دیتی کبھی امی کے ہی انداز میں چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے لوری گانے لگتی۔ جب شائستہ لوری کے آخری مصرعے گاتی تو امی کی آنکھوں کو بغور دیکھا کرتی۔ امی دونوں آنکھیں بند کر دیتیں۔ ان کی آنکھوں کے کونوں سے نمی چھلک چھلک پڑتی۔ پھر امی گھنٹوں آنکھیں نہ کھولتیں۔ کم از کم شائستہ نے یہی دیکھا تھا، حالانکہ امی کے پاس سے جاتے وقت وہ مڑ مڑ کر بھی دیکھا کرتی تھی۔

باپ کی نگاہیں کبھی کبھی شائستہ کے ننھے سے بدن کا طواف کر کے اس کے بھرے بھرے رخساروں پر ٹھہر جاتیں۔ وہ منہ بھر بھر کے اس کے گالوں کے کئی کئی بوسے بھی لے لیتا۔ مگر ساحرؔہ سے وہ کبھی بات نہ کرتا تھا۔

بہت دن پہلے جب ایک دفعہ اس نے ساحرؔہ کو کسی کام سے کمرے میں بلایا تھا تو وہ وہاں کچھ سیکنڈ بعد ہی زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ ناظمہ اور شائستہ کمرے کے طرف دوڑیں تھیں۔ صحن کی کچی اینٹوں سے بنی، بھر بھری مٹی کی دیوار کے اس پار سے زہرہ خالہ نے لکڑی کی جالی دار کھڑکی کھولی تھی۔ مگر تب تک ساحرؔہ کمرے سے باہر آ چکی تھی۔ امی کی چارپائی کی چرمراہٹ میں ہڈیوں کی کھڑ کھڑاہٹ کا گماں ہوتا تھا۔ انہوں نے بمشکل تمام اپنا سر ذرا سا اُوپر کر کے غصے سے کھولتی ہوئی فتح یاب ساحرؔہ کو دیکھ کر ایک اطمینان بھری ٹھنڈی سانس لی۔

باپ اگر ساحرؔہ سے کبھی بات کرنے پر مجبور ہوتا تو نہایت گندی زبان استعمال کرتا۔ ویسے بھی وہ سارے کنبے پر سوسو تبرا تولتا اور اکثر و بیشتر ہی نشے میں ہوتا تھا۔۔۔

بنڈل دیکھ کر ساحرؔہ سمجھ گئی کہ ناظمؔہ کے لیے کوئی گرم کپڑا ہوگا شاید۔ خود اس کے پاس بھی اوڑھنے کو اس کے بستر کی چادر ہی ہے۔ جسے وہ دن میں بھی لپیٹے پھرا کرتی ہے۔ مگر باپ کی اپنے لیے نفرت وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ سمجھتی تھی اور اندر ہی اندر پھنکتی رہتی تھی۔ اس لیے دوسرے ہی لمحے اس نے سوچ کا رُخ موڑ دیا۔

نہیں چاہیے اسے کوئی سویٹر۔

باپ بھلے ہی ناظمہ سے نسبتاً کم ناراض رہتا مگر کسی کے لیے کچھ لے آنا۔۔۔؟

وہ پل بھر کو سوچنے لگی۔ پھر اس نے سر زور سے جھٹک دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

بنڈل امی نے بھی دیکھا تھا۔ بہت پہلے جب اس کی شادی باپ سے ہوئی تھی تو اسے جہیز میں ایسے ہی گہرے سرخ رنگ کا کمبل ملا تھا۔ گھر میں خوب استعمال ہوا تھا وہ کمبل ۔کبھی اوڑھنا بنا کبھی بچھونا۔ اور کبھی امی اسے کھاٹ پر پھیلاتی تو وہ چادر سے بھی خوبصورت لگتا۔ اس کے کناروں پر نیلے رنگ کی اون سے بیلیں بنی ہوئی تھیں۔

درمیان میں سے گھس گیا تو اسے دو ٹکڑوں میں بانٹ دینا پڑا تھا جو بچوں نے الگ الگ اوڑھے تھے۔ اب بھی اس کا ایک بچا کھچا ٹکڑا باورچی خانے کے پائیدان کی جگہ استعمال ہوتا تھا۔

امی کو خیال آیا کہ شاید بیدار شیطان کا خفتہ انسان جاگ گیا ہو۔ کہ امی کے پاس بستر کے نام پر ایک چیتھڑا گدّا اور ایک چادر ہی تو تھی۔ اور گھر میں سب سے زیادہ سردی اس خون نچڑے وجود ہی کو لگا کرتی تھی۔ مگر باپ سے اس طرح کی توقع کرنے کے خیال سے وہ اور گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد انہوں نے قریب سے گذرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

''کیا لائے۔۔۔؟'' جانے امّی نے یہ سوال کیسے کر دیا۔ کہ وہ تو اس کی طرف دیکھتی ہی تھی نہ بات کرتیں۔ امی کی چارپائی باورچی خانے کے باہر چھوٹی سی راہداری میں ایک طرف کو بچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے خود ہی اس جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ کمرے کے اندر انہیں دنیا سے رابطہ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ راہداری کا ایک دروازہ باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ جہاں سے باپ کے کمرے کا دروازہ نظر آتا تھا۔ دوسرا دروازہ صحن میں کھلتا تھا، جس کی سیدھ میں آنگن کا باہری کواڑ تھا۔ کواڑ کے کھلنے سے گلی کا منظر بھی نظر آجاتا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ، خوانچے، چھابڑی والے وغیرہ۔

باپ جب راہداری سے گذرتا تو امی منہ دیوار کی طرف موڑ لیتیں۔ مگر آج انہوں

نے نہ صرف باپ کی طرف دیکھا تھا بلکہ بات بھی کی تھی۔ ''کفن لایا ہوں تمہارے لیے۔''
باپ نے نفرت اور غصّے سے کہا تو اس کی کی سانسوں کے تعفن سے فضا مکدر ہو گئی۔ آواز یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے وہ کچھ چبا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ کچھ زیادہ ہی سرخ ہو رہا تھا۔ ماتھا سر کے درمیان تک پھیلا ہوا تھا۔ اور چہرے پر دو دو تین دن کی سیاہ اور سفید رنگ کی داڑھی تھی۔ قمیض کے رنگ کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا

تاہم سیاہی مائل سا کوئی رنگ رہا ہوگا۔ پتلون میں پھنسا کمر بند ڈھلک کر اتنا نیچے آ گیا تھا کہ قمیض کے نچلے ٹوٹے ہوئے دو بٹنوں میں سے اس کا پیٹ باہر کو لٹک رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہر روز دُھلا دھلایا، مرمت شدہ ٹھیک ٹھاک لباس پہن کر جاتا تھا۔ مگر جب رات کو لوٹتا تو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے بھی ہوتے اور خاصے میلے بھی۔

اس کی بات سن کرامی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''کفن۔۔۔؟ وہ تو۔۔۔ وہ تو میں سال بھر سے پہنے ہوئے ہوں۔'' امی نے یاسیت میں ڈوبی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا اور سر جھکا کر اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں کہ وہ گرم لہو جوان کی تندرست بدن میں زندگی کا غمّاز بن کر دوڑا کرتا تھا، اب ان کے بدن کے باہر رستا تھا۔ کبھی پھیل جاتا کبھی پپڑیوں کی شکل میں، پنڈلیوں پر جم کر کسی زخمی ناگن کی کینچلی کی طرح معلوم ہوتا۔ یوں بھی امی اپنے بدن میں نہیں تھیں۔ وہاں ان کی بجتی ہوئی ہڈّیوں کے اوپر ان کی نیم چتکبری کھال تھی۔

''مگر پھر بھی زندہ ہو اور لعنت بن کر سر پر سوار ہو۔'' باپ شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ پھر لڑکھڑایا اور گرنے ہی والا تھا کہ دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔

''مر کر بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دوں گی۔۔۔ شیطان۔۔۔ درندے۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔ ہو تم۔۔۔۔ اپنے ہی بچوں کو کھاتے ہو۔۔۔ سانپ۔۔۔ میری معصوم کلیوں کو۔۔۔۔ میری بچیوں پر۔۔۔۔ میری۔۔۔۔ میری۔۔۔۔''

امی کی سانسیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ ان پر غشی طاری ہونے لگی۔ ''کاش۔۔۔

۔۔۔کاش۔۔۔میں تمہیں۔۔۔میں تمہیں۔۔۔۔میں۔۔۔تمہیں کوئی۔۔۔سنگسار کیوں نہیں۔۔۔کر دیتا تمہیں کوئی۔''

امی کی آواز ڈوب گئی اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔

شائستہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ بنڈل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''اس میں۔۔۔۔کیا ہے؟'' وہ بنڈل کو چھوتی ہوئی سر جھکائے بولی۔

''اس میں۔۔۔ناظمہ سے کہو کھانا لائے۔'' باپ نے شائستہ کے گال پر چٹکی بھر کے بے تاثر آواز میں کہا۔

باورچی خانے کے دروازے کی اس طرف سے ساحرہ ماتھے کا کونا دوسرے طرف کیے، ایک آنکھ سے اندر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ باپ کی جب اس پر نظر پڑی تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ساحرہ نے ہونٹ، اتنی سختی سے دانتوں تلے دبایا کہ خون کی بونداس کی زبان نمکین کر گئی۔

ساحرہ آٹھویں درجے کی طالبہ تھی۔ اپنی کلاس کی مانیٹر تھی اور زہرہ خالہ کی چوتھی جماعت میں پڑھنے والی بیٹی کو ٹیوشن بھی دیتی تھی۔ اس کا قد اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی نکلا ہوا تھا۔ امی کو گود میں اٹھا کر غسل خانے وغیرہ تک لے جایا کرتی تو گردن خم کر کے امی کے ماتھے پر اپنا رخسار رکھے رہتی۔ کس قدر زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھی اس وقت۔ ویسے طبعاً خاموش تھی، دھن کی پکی، ذہین اور محنتی بھی تھی۔

ساحرہ بدستور باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب دونوں آنکھوں سے۔

ناظمہ تھالی میں موٹی سی روٹیاں اور کٹوری میں پتلی سی دال لے کر اندر آئی اور بغل میں دبا ہوا چیتھڑا دستر خوان نکال کر باپ کے سامنے پھیلا دیا اور کھانا پروس دیا۔

''ہری مرچ کہاں ہے؟'' باپ ناظمہ کو دیکھ کر زور سے بولا۔ ناظمہ نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس جلدی سے دستر خوان پر رکھ دیا جو اس کے بدن کی کپکپی سے چھلکا ہی چاہتا تھا۔ جب وہ اُٹھنے لگی تو باپ نے اس کے شانے کے پیچھے ایک بھاری سی تھپکی دی اور اس کی

ساری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس کے کندھے کو انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان زور سے پکڑ کر آواز دھیمی کر کے بولا'' آج ہری مرچ نہیں ہے کیا؟''

'' کچھ دنوں سے سبزی نہیں لی نا۔ مرچیں ختم ہو گئیں۔ بغیر سبزی خریدے، سبزی فروش مرچ دیتا ہی نہیں۔'' ناظمہ نے بات کرتے ہوئے کندھا آہستہ سے چھڑا دیا اور اُٹھ کر اندر جانے لگی۔

'' تم کیا لینے جا رہی ہو جب مرچ نہیں ہے گھر میں۔'' وہ ایسے گرجا جیسے بادل پھٹ گئے ہوں۔

'' میں ۔۔۔ چولہا ٹھنڈا کرنے ۔۔۔ ابھی آگ جل رہی ہے نا''۔ وہ شانہ سہلاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

'' ابھی تک آگ بجھائی نہیں ۔۔۔ حرا۔۔۔ اتنی لکڑی کہاں سے آئے گی۔ میں تم سب کو۔۔۔ تم سب کو لے جا کر میں کسی

کسی ۔۔۔ کوٹھ ۔۔۔ تم اسی لائق ہو ۔۔۔ کہ ۔۔۔ میں۔'' باپ غصے میں کانپ رہا تھا۔ اس کے بدبودار منھ سے کف

اُڑ رہا تھا۔ ایسی حالت میں جب وہ غصہ کیا کرتا تو اسکا دہانہ ایک طرف کو خمیدہ ہو جاتا۔ جیسے چہرے کو لقوہ مار گیا ہو۔ اس کا سارا چہرہ ہی ٹیڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ سرخ کنچوں جیسی گول گول آنکھیں جیسے باہر کو گرنے والی تھیں۔ ماحول خوفناک ہو گیا تھا۔

اور ۔۔۔ کسی میں ہمّت نہیں تھی کہ اس سے کہہ سکے کہ اس کے آنے میں آدھی رات کیوں نہ ہو جائے مگر اس کے لیے بار بار چولہا سلگانا پڑتا ہے کیونکہ لکڑی کی بچت کی خاطر اسے بار بار بجھایا گیا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ ایسا کہرام مچاتا ہے جس کی وجہ سے تقریباً سارے محلے نے ان سے تعلق ہی توڑ لیا ہے۔

دروازے کے پاس کھڑی ساحرہ پھیلی پھیلی مگر بے خوف آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ باپ نے اسے اس طرح گھورتے ہوئے دیکھا تو کھانے کی رکابی کھینچ کر اس

پر پھینکی۔ وہ پرے ہوگئی، نشانہ چوک گیا اور رکابی چولہے پر جا لگی۔ دال کی پتیلی چولہے سے نیچے کرتے ہوئے اپنے ساتھ ایک دو وادھ ٹوٹی انیٹیں بھی اکھیڑ لائی۔ اوپر کے طاقچے کی مٹی اکھڑ کر نیچے گر گئی اور ایک لمبی سی اینٹ دکھائی دینے لگی۔

''چلو میرے ۔۔۔ کپڑے دو۔۔۔حرا۔۔۔'' وہ غصے سے بھنّاتا ہوا کھڑا ہو کر ناظمہ سے مخاطب ہوا اور وہ تھرتھراتی ہوئی باپ کے پیچھے چلنے لگی۔

ساحرہ نے دیکھا کہ طاقچے کے اکھڑے ہوئے حصے کی اینٹ بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس کے ذرا سے ہلانے سے اینٹ اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے اینٹ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ باپ باورچی خانے میں سے گذرنے ہی والا تھا۔ سرخ بنڈل وہیں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ شائستہ نے باپ کو اندر کی طرف جاتے دیکھا تو اسے کھولنے لگی۔

یہ ایک بڑے سائز کا مردانہ اوور کوٹ تھا۔ جو باہر سے گہرے مونگیا رنگ کا تھا اور اُس کے اندر سُرخ رنگ کا دبیز اونی استر لگا تھا جو دو ایک جگہ سے شاید چوہوں نے کتر ڈالا تھا۔ باپ اسے کسی کباڑی کی دوکان سے لایا ہوگا۔

شائستہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے میں محو تھی۔ باورچی خانے سے گڑگڑاہٹ جیسی چیخ سن کر امی نے غنودگی سے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔

ناظمہ راہداری میں آئی تو کھلا ہوا اوور کورٹ، امی کے دراز بدن پر پھیلانے لگی۔

''وہ چولہے سے دال کی پتیلی اتار رہا تھا کہ چولہا ٹوٹ گیا۔ اور پر کے طاقچے کی ایک اینٹ ابھی اکھڑ کر اس کے سر پر گر گئی ۔۔۔۔ باورچی خانے میں خون پھیل رہا ہے۔ ساحرہ، زہرہ خالہ کو بتانے گئی ہے۔'' ناظمہ نے بے تاثر آواز میں کہا۔

امی نے آنکھ سے بہہ کر کان کی طرف جاتا ہوا آنسو پونچھ لیا اور آہستہ سے آنکھیں موند لیں۔

شائستہ نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔

☆☆

باپ

محمد ارشد کسانہ

اردو فکشن میں جن خواتین نے شہرت حاصل کی ہے ان میں ترنم ریاض کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تخلیقی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو انھوں نے ناول اور افسانہ کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی اپنی طبیعت آزمائی اور کمال یہ کہ تینوں اصناف میں مقبولیت حاصل کی۔ لیکن وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''یمبرزل'' اور ''میرا رخت سفر'' کے عنوانات سے شائع ہو کر ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ترنم ریاض کا تعلق اگرچہ جموں وکشمیر سے ہے مگر وہ جموں وکشمیر کے باقی ادیبوں سے کافی منفرد نظر آتی ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع اور فن میں پختگی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اچھی خاصی پذیرائی ملی۔ اردو افسانہ نگاری کے میدان میں ترنم ریاض کا شمار نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے سیاسی، سماجی، معاشی اور خواتین مسائل کے عمدہ عکاس ہیں۔ ان کا افسانہ ''باپ'' ہماری بحث کا موضوع ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ رسالہ ''نیا سفر'' الٰہ آباد سے شائع ہوا تھا اور پھر اسی سال رسالہ ''صریر'' کراچی سے بھی منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ یہ افسانہ ان کے افسانوی مجموعے ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' میں بھی شامل ہے۔

افسانہ ''باپ'' جتنا موضوعاتی سطح پر اہم مانا جاتا ہے اتنا ہی فنی اعتبار سے پختگی رکھتا ہے۔افسانہ بیانیہ تکنیک کے صیغے واحد غائب میں ہے جہاں راوی کے ذریعے پوری کہانی بیان ہوئی ہے۔افسانہ آغاز سے لے کر اختتام تک قاری کے تجسس کو برقرار رکھتا ہے۔افسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''باپ پرانی ادھ ٹوٹی ٹائیلوں والا برآمدہ طے کر رہا تھا۔ٹائیلوں کا رنگ زرد تھا،ان کی چمک غائب ہو چکی تھی۔اور قدم پڑنے سے وہ آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔اور کچھ باپ کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے لڑکھڑا نہ رہا ہو بلکہ جان بوجھ کر قدم ایسے اٹھا رہا ہو جس سے چاپ سنائی دے۔''

(افسانہ:باپ از ترنم ریاض)

افسانہ آغاز سے ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور پھر جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے قاری کے تجسس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور افسانے کے آخر میں یہی تجسس وحدت تاثر کی کیفیت کو ایسے پیدا کرتا ہے کہ قاری کے اندر ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔افسانے کے باقی فنی اجزاء کو تفصیل سے سمجھنے سے پہلے ہمیں افسانے کی کہانی اور موضوع سے واقف ہونا ضروری ہے کیوں کہ یہ دونوں کسی بھی افسانے کی بنیاد ہوتے ہیں۔

اس افسانے میں باپ، امی، ناظمہ،شائستہ اور ساحرہ کل پانچ کردار ہیں۔لیکن پورا افسانہ باپ اور اس کی بیٹی ناظمہ کے اردگرد گھومتا ہے۔باپ ایک لاپرواہ، بے رحم،شرابی اور ہوس پرست انسان ہے۔جبکہ امی ایک مظلوم اور لاچار عورت جس کو باپ نے ایک دن اتنا مارا کہ اس کے بعد سے وہ کبھی کھاٹ سے اٹھ نہیں پائی۔اس کے بعد وہ ایک طویل بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ناظمہ،شائستہ اور ساحرہ تین بہنیں ہیں۔ناظمہ سب سے بڑی ہے جو گھر کا سارا کام کرنے کے ساتھ ساتھ باپ کے مظالم کا شکار بھی ہوتی ہے۔وہ کبھی کبھی اسکول بھی جایا کرتی ہے مگر پریشانیاں اور ذمہ داریاں اس کو اسکول کی طرف ذہنی طور پر راغب نہیں ہونے دیتیں۔باپ کا خوف پورے گھر پر ایسے چھایا رہتا ہے کہ تینوں بچیاں اس کی آواز سن کر

کانپ جاتی ہیں۔ جیسے جیسے بچیاں جوان ہوتی جارہی تھیں ویسے ویسے باپ کی گندی نظریں ان کے تاک میں لگ جاتی تھیں۔ ناظمہ تو باپ کی ہوس کا شکار ہو ہی رہی تھی مگر کبھی کبھی ساحرہ پر بھی اس کی نظریں ٹک جاتی تھیں۔ ناظمہ کافی عرصے سے باپ کا شکار بن رہی تھیں اور وہ لاچار رو چیخ کر سب برداشت کرتی رہتی۔ یہاں تک کہ امی بھی اپنی بچی کو ظالم باپ سے بچانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ اس واقعے کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''وقت بے وقت وہ (ناظمہ) باپ کے کمرے میں ہوتی۔ امی کھٹیا پر پڑی کراہتی۔ نحیف آواز میں ناظمہ ناظمہ پکارتیں۔۔۔۔ اور ناظمہ دیر بعد سسکتی، لڑکھڑاتی آتی۔ امی کی چارپائی کی پائنتی پکڑ کر گرسی پڑتی۔ امی، باپ کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر جانے کیا کیا بڑبڑاتیں۔۔۔۔ ہاتھ دعا میں اٹھاتیں۔۔۔۔ آنسو بہاتی ہوئی، نقاہت بھری آواز میں سانپ سانپ چلاتیں اور بے ہوش ہو جاتیں۔''
>
> (افسانہ: باپ، ترنم ریاض)

باپ کو بیوی اور بچیوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے وہ بس اپنے پیٹ اور ہوس کو حاصل کرنے کے لیے گھر میں رہتا ہے۔ باقی باپ اور شوہر کی ذمہ داریوں کے متعلق اسے کوئی خبر نہیں۔ افسانے کی مرکزی کہانی یہ ہے کہ باپ ہاتھ میں کسی چیز کا بنڈل لیے آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی بچیاں اس بنڈل کو دیکھ کر اندازا لگانے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس میں کیا ہے؟۔ اصل میں ان کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے اس لیے وہ للچا جاتیں ہیں کہ شاید وہ کسی کے لیے کپڑے لایا ہے۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا جاتا ہے اور بچیوں کے ساتھ ساتھ امی بھی کھاٹ سے بنڈل پر نظریں گڑھاتی ہے۔ امی اگرچہ کھاٹ پر پڑی رہتی تھی مگر وہ شوہر سے اس قدر نفرت کرتی تھی کہ بد عائیں اور گالیاں دے کر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی تھی۔ اسی دوران شائستہ باپ کے پاس آکر بنڈل کے بارے میں پوچھتی ہے اور باپ اس کو کھانا لانے کے لیے ناظمہ کے پاس بھیجتا ہے۔ ناظمہ جلدی سے کھانا لاتی ہے۔ کھانے

میں ہری مرچ نہ پاکر باپ جھنجھلا جاتا ہے اور پھر بادل بن کر پھٹتا ہے۔ دوسری طرف چولہے میں لکڑیاں جلنے سے بھی اس کے غصے میں اضافہ ہوا۔ ترنم ریاض نے یہاں باپ کے رویے کو یوں بیان کیا ہے:

''ابھی تک آگ بجھائی نہیں ۔۔۔حرا۔۔۔اتنی لکڑی کہاں سے آئے گی۔ میں تم سب کو۔۔۔۔تم سب کو لے جا کر میں کسی۔۔۔کسی۔۔ کوٹھ۔۔۔۔۔تم اسی لائق ہو۔۔۔۔کہ۔۔۔میں'' باپ غصے میں کانپ رہا تھا۔ اس کے بدبودار منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ ایسی حالت میں جب وہ غصہ کیا کرتا تو اس کا دہانہ ایک طرف کو خمیدہ ہو جاتا۔ جیسے چہرے کو لقوہ مار گیا ہو۔ اس کا سارا چہرہ ہی ٹیڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ سرخ کنچوں جیسی گول گول آنکھیں جیسے باہر کو گرنے والی تھیں۔ ماحول خوفناک ہو گیا تھا۔''

(افسانہ: باپ، ترنم ریاض)

باپ کے ایسے روز روز کے رویے سے ساحرہ تنگ آچکی تھی اور وہ اس وقت بھی بے خوفی سے باپ کو گھور رہی تھی۔ باپ نے جیسے ہی ساحرہ کو گھورتے ہوئے دیکھا تو اس نے جھٹ سے کھانے کی رکابی کھینچ کر ساحرہ کی طرف پھینکی مگر نشانہ چوک گیا اور رکابی چولہے پر جا لگی۔ باپ نے ناظمہ سے کپڑے مانگے اور وہ بنڈل وہیں رکھ کر ناظمہ کے ساتھ اندر جانے لگا۔ اس بنڈل میں ایک پرانا سا مردانہ اور کوٹ تھا جسے شائستہ نے کھول کر دیکھا۔ دوسری طرف ساحرہ باورچی خانے میں ایک اینٹ ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ باپ جیسے ہی باورچی خانے میں سے گذرا تو ساحرہ نے اینٹ باپ کے سر پر دے ماری۔ اس حادثے کی گڑگڑاہٹ سے امی کی آنکھیں کھلی تو ناظمہ نے اس کو یوں جواب دیا:

''وہ چولہے سے دال کی پتیلی اتار رہا تھا کہ چولہا ٹوٹ گیا۔ اوپر کے طاقچے کی ایک اینٹ بھی اکھڑ کر اس کے سر پر گر گئی۔۔۔۔ باورچی خانے میں خون پھیل رہا ہے ساحرہ، زہرہ خالہ کو بتانے گئی ہے۔''

امی نے آنکھ سے بہہ کر کان کو (کی) طرف جاتا ہوا آنسو پونچھ لیا

اور آہستہ سے آنکھیں موند لیں۔ شائستہ نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔''

(ابابیلیں لوٹ آئیں گی، ترنم ریاض، ص ۵۰)

یہیں افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ مذکورہ کہانی کے ساتھ ساتھ فلیش بیک میں ماضی کے کئی واقعات بھی پیش ہوئے ہیں جس سے ہم کہانی کے پس منظر سے واقف ہوتے ہیں۔ افسانے کا اختتام کافی متاثر کن ہے اور جیسے ہی افسانہ صفحات پر ختم ہوتا ہے تو فوراً قاری کے ذہن میں شروع ہو جاتا ہے۔ ایک مکمل افسانے کی یہ سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔

موضوعاتی طور پر افسانہ مردانہ سماج پر زبردست طنز کرتا ہے۔ یہاں مرد کو ظالم اور عورت کو مظلوم قرار دیا ہے مگر افسانہ اختتام پر پہنچ کر تانیثی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ باپ کے مظالم کا امی اور ناظمہ شکار ہوتی ہیں مگر تانیثی جذبہ ہمیں ساحرہ کے اندر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ساحرہ آٹھویں جماعت کی طلبہ تھی مگر وہ کافی ذہین اور محنتی لڑکی دکھائی گئی ہے۔ وہ زہرہ خالہ کی بیٹی کو ٹیوشن بھی دیتی ہے۔ ماں اور بہن پر آئے دن ہوتے مظالم اس کے اندر بغاوت کا جذبہ بھرتے رہتے ہیں اور پھر ایک طویل مدت کے بعد مناسب وقت اور مناسب طریقے سے یہ بغاوت تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ ناظمہ اگرچہ خود کچھ نہیں کر پاتی مگر آخر میں ساحرہ کا ایسے ساتھ دیتی ہے کہ گویا باپ کو اس طرح مارنا دونوں کی سوچی سمجھی چال تھی اور پھر باپ کے مرنے کی خبر جب امی کو ہوتی ہے تو وہ بھی سکون سے آنکھیں موند لیتی ہے۔ یعنی باپ کی موت سے گھر کے تمام افراد ایک بڑی پریشانی سے نجات پاتے ہیں۔ اس لیے تانیثیت کے طور پر اسے ایک عمدہ افسانہ قرار دیا جائے گا۔

ہم آج اکیسویں صدی کے عہد میں جی رہے ہیں اور اس عہد میں دنیا اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ کئی ممالک چاند پر دنیا آباد کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے سماج میں خواتین مسائل جوں کے توں ہیں۔ عورت کو پہلے بھی مرد اپنی خدمت اور تفریح کے لیے استعمال کرتے تھے اور آج بھی یہی نظریہ قائم ہے۔ اس افسانے کی کہانی ایک

باشعور انسان کو متاثر ضرور کرتی ہے مگر حیران نہیں کر پاتی، چوں کہ اس طرح کے حادثے ہمارے سماج میں عام پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ افسانہ ہمارے سماج کی اصلیت کو ظاہر کر کے اس کو پوری طرح سے ننگا کرتا ہے اور عورت کی مظلومیت اور لاچاری کو بیان کرتا ہے۔ اختتام پر افسانہ عورت کو ظلم کے خلاف اکسانے پر بھی کامیاب نظر آتا ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے بھی یہ افسانہ بڑا اہم مانا جائے گا۔ باپ اور ناظمہ اس افسانے کے بنیادی کردار ہیں اور یہ کردار ہمارے ہی سماج سے لیے گئے ہیں اس لیے کہیں بھی کوئی غیر فطری پہلو نظر نہیں آتا۔ ساحرہ کا کردار سب سے فعال ہے اور یہی کردار افسانہ نگار کے مقصد کو مکمل کرتا ہے۔ افسانے میں مکالمے اتنے زیادہ تو نہیں، ہاں مگر جو ہیں وہ غیر فطری معلوم نہیں ہوتے۔ افسانے کا ہر پہلو ہمیں فطری اس لیے معلوم ہوتا ہے کیوں کہ افسانہ نگار نے حقائق کی حد میں رہ کر افسانہ تخلیق کیا ہے۔ حقیقت پرستی کو مضبوط کرنے کے لیے منظر نگاری اور جزیات نگاری کا ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ مصنفہ نے ان دونوں اجزاء کو پیش کرنے کے لیے مہارت دکھائی ہے۔

افسانہ شروع سے لے کر آخر تک ایک خاص کیفیت کو برقرار رکھتا ہے۔ حالانکہ اس افسانے کی بنیادی کہانی کے ساتھ ساتھ ماضی کے کئی واقعات بھی پیش ہوئے ہیں اور اس طرح کے مختلف واقعات قاری کے تجسس میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ مگر یہاں مصنفہ نے ان واقعات کو ایسے پرویا ہے کہ کہیں بھی بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تجسس جو افسانے کے آغاز سے شروع ہوتا ہے وہ کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مزید گہرا ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے اختتام پر ایک طرف تو قاری اطمنان محسوس کرتا ہے تو دوسری طرف اس کو اپنے سماج میں پھیلی برائیوں پر افسوس ہوتا ہے۔

☆☆

پالنا

ہسپتال کے بیڈ پر لیٹی لیٹی جانے میں کن خیالوں میں گم تھی کہ پھر اس کی کلکاریاں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ ایک بار پھر میرا دل بے قرار ہو گیا۔ درد کی کتنی لہریں میرے سینے کے اندر اٹھیں، دوسرے بیڈ پر سوئی ہوئی اس کی ماں کو میں نے آواز دینا چاہی، لیکن اس بار میں ایسا نہیں کر سکی...... مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔

آج بھی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میرا بلڈ پریشر ہائی تھا۔ پیروں پر سوجن تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے ہلنے جلنے میں بھی احتیاط برتنے کو کہا تھا۔ ٹھیک سے لیٹنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی مجھ کو، میں نیم دراز اس کے پالنے کی طرف منہ کئے پڑی رہی۔ میرا جی چاہا کہ ایک ڈوری اس پالنے کے ساتھ باندلوں اور دھیرے دھیرے اسے ہلکورے دیتی جاؤں کہ کل رات کا کھلا یہ نہایت نازک پھول کہیں پھر سے بے چین نہ ہو جائے اور اگر ہو جائے تو۔۔۔ میٹھی روئی کے اس گلابی گالے کو گود میں بھرلوں۔ سینے سے لپٹالوں، اس کے سیاہ ریشم جیسے نرم بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دوں اس کے آنسوں لے لوں کہ اس کی کلکاریں میری روح میں درد بن کر گھل جاتی ہیں۔ پیاسی ممتا کا سمندر سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں جانے کہاں سے موجزن ہو جاتا ہے اور میں ڈوب جاتی ہوں اپنے ہی بہائے ہوئے آنسوؤں کے طوفان میں۔

اور کتنے دن مجھے بیڈ ریسٹ لینا پڑے گا۔ اُکتا گئی تھی میں اس طرح لگاتار بستر پر

پڑے رہنے سے۔ ابھی تین سال پہلے کی ہی بات ہے، کتنے ہی دن میں نے ایک نرسنگ ہوم میں بیڈ ریسٹ لیا تھا......اور پھر......

ایک ننھا سا پیر میرے پیٹ کے اندر ہل رہا ہے۔ شکر ہے اس نے میرا دھیان اپنی طرف موڑ دیا۔ ورنہ یہ میں کیا یاد کرنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے کوئی بھی ناخوشگوار بات سوچنے سے منع کیا ہے۔ جیسے کسی کا سوچ پر اختیار ہوا کرتا ہے بھلا میں اپنے ذہن ودل کو کیسے قابو میں رکھوں۔ تین برس سے میرے اندر یہ غم قطرہ قطرہ رِس رہا ہے، پھر یہ تو ایک داخلی عمل ہے۔ اس پر میرا کیا زور چل سکتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ مگر اور بھی ایسا سوچنے کا حق رکھتے ہیں، مجھ میں کیا خاص بات ہے۔ ہاں ایک بات تو مجھ میں تھی خاص طور سے۔ وہ یہ کہ میرے اندر لڑکپن سے ہی مامتا بھری تھی۔ بچوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا مجھے، چاہے وہ انسان کے ہوں یا جانوروں کے۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کی قربت چاہتا ہے وہی اس سے دور ہو جاتی ہے۔

اس رات بھی میں ایسے ہی نڈھال سی ہسپتال میں پڑی تھی۔ ہلکا ہلکا دردِ زہ لے کر داخل ہوئی تھی میں۔ سینئر ڈاکٹر نے صبح پانچ بجے کا وقت بتایا تھا اور جونیئر ڈاکٹر کے حوالے کر کے گھر چلی گئی تھیں۔ ساری رات میں درد سے تڑپتی رہی۔ حالات کی ستم ظریفی کہ میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میری خالہ کا اسی دن انتقال کر جانے کے سبب سب لوگ وہیں گئے تھے۔ میری بہنیں، امی......صرف وہ تھے۔ میرے شوہر، باہر بے قرار، پریشان اور اکیلے۔

جونیئر ڈاکٹر کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ بارہ برس میں ایم بی بی ایس مکمل کیا تھا۔ ساڑھے چار بجے جب میری حالت غیر ہونے لگی تو جونیئر ڈاکٹر نرسوں کا ایک جھنڈ لے کر میرے پاس آئی اور میرے پیٹ پر اسٹیتھکوپ رکھتے ہوئے بولی۔ "ابھی آدھا گھنٹہ ہے تمہاری چیخوں سے سب کی نیند خراب ہو رہی ہے۔ پانچ بجے میڈم کو گاڑی لینے جائے گی"۔ میں روتی رہی، کراہتی رہی کہ مجھے تھیٹر میں لے جایئے۔ میرا آپریشن کر ڈالیے، ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میرے بچے کو کچھ ہو جائے گا۔

اس نے میری کسی بات کا نوٹس نہ لیا اور میڈم کے کہے ہوئے پانچ بجے کے وقت پر ہی ہر بات کا دارو مدار مان کر بے فکر ہوگئی۔ جیسے کہ میڈم کوئی ماہر نجوم ہو اور اس کے بتلائے ہوئے وقت میں تبدیلی ہونے کی غالباً کوئی گنجائش نہ ہو۔ میں درد سے بے حال تھی۔ میرا گلا سوکھ گیا تھا چیخ چیخ کر۔ اپنی حالت انہیں سمجھانے کی مجھ میں کوئی طاقت نہ تھی۔ کوئی میری بات سمجھنے کے موڈ میں نہ تھا۔ خود میں بھی نادان تھی۔ بالکل ناسمجھ اور ناتجربہ کار۔ پونے پانچ بجے میں درد سے بے حال، کرب واذیت کی زنجیروں میں جکڑی آزاد ہونے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، مجھ پر ہر دوسرے سیکنڈ میں غشی کا دورا پڑتا اور ہر تیسرے سیکنڈ میں ہوش آجاتا اور ہوش کا ہر ہر سیکنڈ سوسو برچھیوں کی چبھن سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے خوب کس کر چوٹی گوندھی تھی۔ جانے کب وہ کھل گئی تھی اور میرے بال بکھر کر میرے مسلسل تڑپنے سے ٹوٹ ٹوٹ جاتے، مسہری کے سرہانے لگی چھوٹی چھوٹی سفید آہنی سلاخیں بھینچ بھینچ کر درد برداشت کرنے کی کوشش میں میرے ناخن میری ہتھیلیوں میں چبھ چبھ جاتے تھے اور میری ہتھیلیاں لہولہان ہوگئی تھیں۔ درد کی شدت سے میں نے اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ کر زخمی کر دیے تھے۔ میری ایک ہی فریاد تھی کہ میرا جسم چاک کر کے مجھے اس درد سے بچالے کوئی۔ لیکن کسی کے پاس میرے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی، کوئی وقت نہ تھا۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے میرا بچہ میری کوکھ میں زور سے تڑپا ہو، شاید اس کے دنیا میں آنے کی آخری جدوجہد کی کوشش کا ایک شکستہ حصہ تھا یہ تڑپنا کہ ایک نرس نمودار ہوئی۔ جانے کیوں ہنس رہی تھی وہ جب کہ رو رو کر میرے آنسو تک سوکھ چکے تھے، اور چلا چلا کر میرا گلا پھوڑے کی طرح دکھ گیا تھا۔ وہ اپنے سیاہ چہرے پر بڑے بڑے سفید دانت لیے اپنے مخصوص جنوبی ہندی لہجے میں بولی، ''کیوں دیماگ کھراب کرتے ہے۔ ابی تھوڑی دیر میں گاڑی ڈاکٹر کو لینے کو جائے گا۔ سو جاؤ سو جاؤ''۔ پھر اس نے اسٹیتھکوپ سے بچے کی دھڑکن چیک کرنا شروع کی۔ کچھ لمحے بعد بھاگ کر گئی اور ڈاکٹر کو ساتھ لائی، اس نے بھی میرا فیٹل ہارٹ (foetal heart) چیک کیا۔ فوراً مجھے سٹریچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر پہنچایا گیا اور

گاڑی میڈم کو لینے کیلئے بھجوائی گئی جیسے تیسے وہ آئیں تو بے حد صحت مند، گول مٹول، تقریباً ساڑھے نو پاؤنڈ کے بیٹے کو میں نے جنم دیا......لیکن......

لیکن کسی نے اس کی پہلی چیخ نہیں سنی۔ اسے سامنے والی لمبی میز پر لٹادیا گیا۔ وہ گوراچٹا تھا۔ گھنگھریالے کالے بالوں والا پھول سا میرا منا چپ چاپ آنکھیں موندے پڑا تھا، اور میڈم اس کے بے جان، ننھے منے ہونٹوں سے منہ لگائے اس کے پھیپھڑوں میں مصنوعی ہوا بھرنے کی کوشش کررہی تھی۔ مگر اس کی نازک سی گردن کبھی دائیں طرف ڈھلک جاتی کبھی بائیں طرف۔ اس کی ناک اور ہونٹ بہت خوبصورت تھے۔ اس کی آنکھیں جو بند تھیں اپنی پھوپھی جان جیسی بڑی بڑی لگتی تھیں۔ جانے ان آنکوں کا رنگ کیسا ہوگا۔ اس نے تو ایک پل کو بھی آنکھیں نہ کھولی تھیں نہ ہی میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ منا سا وجود میرے سامنے بے جان پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے کیسے ہمک رہا تھا میری کوکھ کے اندر، شاید زندہ رہنی کی آخری کوشش کررہا ہو۔ آخری مرتبہ کتنی زور سے تڑپا تھا وہ کہ میرا سارا جسم بھی ہل اٹھا تھا اس کے ساتھ۔ شاید اُسی وقت اس کے سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی ہو۔ جبھی تو واپس بھاگی تھی وہ نرس۔

صبح کاری ڈور میں لگے نوٹس بورڈ پر ڈیلوری والے کالم میں اسی کی موت واقع ہوجانے کی وجہ کوڈ ایسفکسیا (chord asphyxia) درج کی گئی تھی۔ یعنی گلا گھونٹے جانے کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ نال سے اس کا دم نہیں گھٹا تھا، جنم دینے کیلئے مجھے ان لوگوں کی مدد اور تعاون چاہئے تھا جو انہوں نے اپنی نااہلیت کی بنا پر نہیں دیا، اور وہ زیادہ دیر پیٹ میں رہنے کی وجہ سے دم گھٹنے سے مرگیا تھا۔ اُسے ماں سے آکسیجن نہ ملی۔ اسے خود سانس لینا تھا۔ دنیا کی کھربوں گیلن آکسیجن میں سے اس کے حصے میں ایک سانس نہ لکھی تھی کاتبِ تقدیر نے، تو کسی کو کیا دوش دیں۔ بھول سے کیوں آگئی تھی میں اس نرسنگ ہوم میں، اس کی ظاہری شاہ دیکھ کر۔ ورنہ اگر ان کے پاس کچھ قابل ڈاکٹروں کا عملہ ہوتا تو اس وقت یہ آنسو، یہ شکست، یہ احساسِ تنہائی مجھ پر

مسلط نہ ہوتا۔ اگر ان کے پاس آکسیجن دینے کا آلہ ہوتا تو شاید میرے جگر کا یہ پارہ یوں بے جان نہ پڑا ہوتا۔ میں یوں نامرادو ناکام نہ ہوتی۔

پھر وہ اسے میرے سامنے سے لے گئے۔ صرف اس کا چہرہ چھوا تھا میں نے، جب اسے لے جایا گیا۔ سرد شبنم میں نہائے ہوئے پھول کی طرح۔ میرے کلیجے سے درد کے قطرے رِس رہے تھے۔ میرا سارا وجود آنسو بن کہ بہہ جانا چاہتا تھا۔ جانے کیوں نہ بہا، کیسے یہ غم برداشت کئے جیتی رہی۔

کچھ دیر بعد دونرسیں آدھے چہروں پر نقاب ڈالے میرے دونوں طرف کھڑی تھیں۔ میرے سینے سے درد اٹھ رہا تھا۔ میرا گریبان، میرا دامن بھیگے ہوئے تھے۔ میری گود ویران تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے پلنگ کے پاس کا پالنا سونا تھا۔ میری ماتا کا خون میری آنکھوں سے میرے سینے سے بہہ رہا تھا۔ نرسوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے سرنج تھے۔ میرے منے کا رزق کٹ ہی چکا تھا۔ اب دودھ کے وہ دھارے بھی خشک ہونے والے تھے جو اس کے کچھ مہینے میرے وجود کا حصہ ہونے کے شاہد تھے۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں یوں پہلے پہل ماں بنتے بنتے رہ نہ جاتی۔

شاید اس وقت وہ میری چھاتی سے لگا دودھ پی رہا ہوتا اور میں اس کے منے سے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہوتی۔ اس کے ننھے سے جسم کی بناوٹ دیکھ رہی ہوتی۔ ان سارے وسوسوں کو دور کر رہی ہوتی جو اس کے میرے اندر چھپے رہنے کے دنوں میں میرے دل میں اٹھا کرتے تھے۔ میں اس کے پیروں کی ساخت دیکھ رہی ہوتی کہ کہیں کوئی پیر ٹیڑھا تو نہیں، کوئی انگلی کم یا زیادہ تو نہیں۔ اس کے ہاتھ مجھ جیسے ہیں کہ اپنے ابا جیسے، لیکن نہیں۔ وہ تو اپنا چھوٹا سا سر اور سفید جسم لئے مٹی کی کتنی ہی تہوں کے نیچے جا چکا تھا۔ کیسے پاتی اسے میں۔ کہاں سے لاتی اسے۔ میرا منا، میرا پھول، یہ آنسوں آج اتنی تیزی سے کیوں بہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے مجھے رنجیدہ رہنے سے منع کیا ہے۔ اس سے مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے، مدت کے بعد میرے اندر کھلنے والی اس کلی کیلئے بھی یہ اچھا نہیں ہے۔ پھر میں کیوں ایسا

سوچنے لگ جاتی ہوں۔ مجھے وہ سب بھول جانا چاہئے۔

ساتھ والے پلنگ کے پالنے میں لیٹا ہوا منا سا بچہ برابر روئے جا رہا تھا اور اس کی ماں بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اب تک کئی بار جاگ جاگ کر روتا رہا تھا۔ ہر دفع میں نے ہی اس کی ماں کو جگایا تھا، میں اس کی حالت سمجھ سکتی تھی۔ وہ درد زہ سے تڑپ تڑپ کر آزاد ہو جانے کے بعد سوئی تھی۔ اسی لئے خود سے جاگ نہیں پا رہی تھی۔ جگانا پڑتا تھا اسے۔ لیکن کیا میرا جگانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

جانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کو یا پھر میں ہی زیادہ حساس ہوں۔ ورنہ ماں تو وہی تھی اس کی۔ سوچتی ہو گی کچھ دیر رو لے گا تو کیا ہو جائے گا۔ بچہ ہی تو ہے، لیکن مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔

جب پہلی بار جگانے پر اس نے ٹیوب لائٹ روشن کی تھی تو میں نے منی سے آنکھ، جس کے پپوٹوں میں سے ابھی پلکیں بھی نہیں پھوٹی تھیں، کے کونے پر آنسوں کی ایک ننھی سی بوند چمکتی دیکھی تھی۔

پہلی بار تو وہ ایک دم سے بچے کو سہلانے لگی۔ دوسری دفعہ جب میں نے اسے آواز دی تو اس نے کچھ پل میری طرف دیکھا۔ تاثرات شاید ناگواری کے تھے۔ یہ ننھی سی جان اگر روتی نہیں تو میں اسے کیوں جگاتی۔ کیوں میں اس کی نیند خراب کرتی بھلا۔ اس معصوم کا اس طرح بلکنا دیکھا نہ جاتا مجھ سے اور جب تیسری بار مجھے اسے پھر جگانا پڑا تو وہ ذرا تیکھے پن سے بولی "سوری (sorry) اس کے رونے سے آپ کے آرام میں خلل پڑتا ہے نا۔ اسی لئے آپ مجھے فوراً جگا دیتی ہیں"۔ اس کے بعد وہ اسے دودھ پلانے میں مشغول ہو گئی، میں اسے کیسے سمجھاتی اس کے رونے سے میرے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا، میرے دل کا سکون ضرور لٹتا تھا اس کی تکلیف کے خیال سے۔ بچے کی پہلی چیخ اس کی زندگی کی ضامن ہے مگر یوں رات رات بھر بے قرار رہنا کسی پریشانی کی وجہ ہے۔ وہ بھی تو اس دنیا میں آنے کی جدوجہد کرنے سے تھک چکا تھا۔ قاعدے سے اسے کئی گھنٹے آرام سے سونا

چاہئے تھا۔ اسے میں کیسے بتلاتی کہ بچے تمہارے اور ہمارے نہیں ہیں۔ یہ تو سب کے ہوا کرتے ہیں۔

کب سے روئے چلا جارہا تھا وہ اگر میں نے اس کی ماں کو نہ جگایا تو وہ ایسے ہی روتا رہے گا۔ جانے کب تک۔ پھر جانے کیا ہو، کہیں یہ پالنا......نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ پر خالی پالنے دیکھ کر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ شاید ایسے کسی صدمے سے میری موت ہی واقع ہو جائے اور یہ ننھی سی جان......تو کیا اس کی باتوں کے ڈر سے میں اسے یونہی بلکنے دوں؟ شاید اسے بھوک لگی ہو۔ ایک گھونٹ پی کر ہی تو سو جاتا ہے وہ۔ اس طرح روتے روتے مچل مچل کر کہیں اس نے اپنی ناف نہ زخمی کر لی ہو۔ مجھے بہر حال اس کی ماں کو جگانا ہی ہوگا۔ چاہے کچھ بھی کہے وہ۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے اسے آواز دی اور مطمئن ہو کر وہ دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

پالنا

فریدہ نثار احمد انصاری

فکشن کی دنیا کا اپنا ایک منفرد رنگ و انداز ہوتا ہے۔ جب زندگی کے شب و روز کے ساتھ قلم کار قرطاس پر تخیل کی قوس قزح سے ادب کو رنگین کرتا ہے۔ تب آفتاب کی چمک کے سائے تلے تو کبھی آسمان کے شنگرفی کناروں پر یا سیاہ رات کی دبیز تہہ کی گہرائیوں میں کہانیاں فکشن کا حصہ بن جاتی ہیں۔

مذکورہ افسانہ ''پالنا'' نے قلم کار کے تخیل کو درد کے بحر بیکراں میں ڈبویا تب ہی تو لکھ دیا۔

''بچے تمہارے اور ہمارے نہیں ہوتے''

صد فی صد درست بات کو حقیقت کی روشنائی سے رقم کیا۔

جذبات و کیفیات کر و فر کے ساتھ قلم کی نوک سے قرطاس میں رنگ بھرتے گئے۔

افسانہ ''پالنا'' جیسے کہ عنوان نے ہی کہہ دیا کہ ممتا کی تپش سے گوندھا ہوا ہوگا اور وہی بات افسانے پر صادق آئی کہ ایک ماں کس کس طرح سے خود کو ''ماں'' بن کر ایک ماورائی مخلوق بننا چاہتی ہے۔ لیکن درد کے سمندر سے گزر کر بھی اس کی کشتی بھنور کی نذر ہو جاتی ہے اور اس کے اپنے پاس کچھ بھی تو نہیں رہتا۔

وہ نہیں چاہتی کہ جس طرح اس کا بچہ وقت مقررہ پر آکسیجن نہ ملنے سے تڑپ کر

اس دنیا کو خیر باد کر چکا، کوئی دوسرا ابھی اسی کیفیت، حالات سے گزر کر اس دنیا سے رخصت ہو جائے، مزید ایک پالنا خالی رہ جائے اس لئے اس نے اپنے ساتھ والی مریضہ کو اٹھایا، پر اس کی سوچ مختلف نکلی۔ پھر بھی اس ماں نے اپنا فرض ادا کیا۔

محترمہ ترنم ریاض صاحبہ کے مشاق قلم نے اسپتال میں دردِ زہ سہتی تڑپتی خاتون کی عکاسی بالکل اس درد کو برداشت کرتی خاتون کی طرح کی۔ قاری کو یوں لگا گویا وہ خود راوی کے ساتھ نہ صرف ایک ایسے درد کو سہہ رہا ہے کہ جس کے بارے میں ڈاکٹرز کا یہ کہنا کہ ''دردزہ کا فقط ایک درد تین بار دل کا دورہ پڑنے کے برابر ہوتا ہے۔'' ایسے پل پل سسکتی زندگی کو ضبطِ قلم کرنا آسان کام نہیں پر یہ میم کا حوصلہ کہ قاری کو باندھ لیا اور ایک قرات میں ہی دل لگا کر پڑھ لیا۔

زندگی کے شب و روز کی کہانیاں تخلیقیت ثابت کرتی ہیں لیکن درد کو ضبط قلم کرنا سہل نہیں۔ ویسے مکمل افسانہ ایک خود کلامی ہے پھر بھی افسانے کی دھج سے سجا ہوا ہے۔

کہتے ہیں قلم کار معاشرے کا نباض ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح فاضل قلم کار نے نہ صرف درد کا گراف میٹین کیا بلکہ معاشرے کے اس درد پر بھی توجہ مبذول کی جسے ''بانجھ'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ کہ جس عورت کی کوکھ بچے کو جنم نہ دے سکے، پر ایسی خاتون کیا کرے کہ جس کی زندگی اسپتال کے عاملین کی بے پرواہی کے سبب زندگی کا ناسور بن جائے اور دوسرے اسے بھی بانجھ سا سمجھیں کہ پالنا تو خالی رہ گیا۔

حالاں کہ اس خاتون کا مقصد بچے والی خاتون کو محض جگانا تھا کہ وہ بچہ بھی انہی حالات کے ذہن رسیدہ نہ ہو پر نیند کے غلبے نے دوسری خاتون کو بددل کر دیا اور پہلی نے اپنا فرض پورا کیا۔

دورِ حاضر اسپتالوں کی حالت زار بھی عیاں ہوئی۔ اس طرح کے کئی حادثے گواہ ہیں کہ محض اپنے آرام کے لئے دوسرے کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔ لاپرواہی، غیر ذمہ داری ان کا شعار بن چکا ہے۔

وحدت تاثر سے سجا یہ افسانہ حالاں کہ ایک آپ بیتی ہے جس میں کردار نگاری ایک راوی کے گرد گھومتی ہے پھر بھی اس ہم کلامی نے بھی قاری کو باندھے رکھا۔ دوسرا جھنجھلایا مختصر کردار بھی اپنی اسی کیفیت کے ساتھ افسانے پر حاوی رہا اور منظر نگاری کے نقوش ثبت کرتا رہا۔

پلاٹ چست کہ بنیاد ہی کسی تحریر کی جان ہوتی ہے۔ درد کے جن جن پہلوؤں کو لکھا، خوب لکھا۔ کچھ جگہوں پر اسی درد کو دُہرایا بھی گیا پر درد تو درد ہے، خود کو منوانے کا ہنر جانتا ہے۔

میں فاضل قلم کارہ کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ایک منفرد تخلیق کو قاری کے سپرد کیا۔

ایک سوچ جو میری اپنی ہے کہ پل پل درد کی جو عکاسی کی خواتین قاری کو گراں نہ گزرے گی بلکہ انھیں اس میں اپنی حقیقت نظر آئے گی لیکن ہوسکتا ہے قاری حضرات پر اس طرح کی تحریر بار خاطر ہو۔

البتہ مکالمات کے سانچے میں ڈھالا جاتا تب اس کا رنگ خوب نکھرتا۔
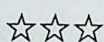
اچھی صورت بھی کیا۔۔۔

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

''میری ممی مجھے لینے آ رہی ہے نا آنٹی؟''

سنہری بالوں اور بھوری آنکھوں والے گڈے جیسے بچے نے آنکھیں میچنے سے پہلے کہا کہ اس کی آنکھیں شاید نیند یا پھر دواؤں کے اثر سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

ثنا نے جب اثبات میں سر ہلایا تو اس کے سوکھے پژمردہ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

ثنا نے اس کے ابروؤں کو انگلی کے پوروں سے سنوارا اور پھر اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کچھ دیر کے لیے اپنا ہاتھ اس کے نرم نرم ماتھے پر رہنے دیا اور مطمئن ہو کر اپنا بدن کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اب راہل اچھا ہو جائے گا۔۔۔ وہ آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سوچنے لگی واقعی کچھ دن پہلے کے اور آج کے راہل میں بہت فرق تھا۔

اس دن ثنا اپنے گروپ کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سیلاب زدگان کی مدد کے لیے قریب کے ایک گاؤں میں گئی تھی۔ جب صبح اس کی ویگن شہر کے ایک خاص چوک سے گذری تھی تو دسمبر کی سردی میں سڑک کے کنارے پر ٹھٹھرتے ہوئے ایک بچے کو اس نے

بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اکثر ہی شہروں کے ٹریفک سگنلز کے پاس لوگ بھیک مانگا کرتے اور اکثر ہی ثنا اس طرح کسی کو دیکھ کر سوچنے لگ جاتی۔

''تمھیں اس چھوٹے سے کُرتے میں سردی نہیں لگتی؟'' ایک چار پانچ سالہ بچّے سے ثنا نے ایک دفعہ پوچھا بھی تھا۔

''نہیں تو۔۔۔ میں تو سوتا بھی اسی میں ہوں۔۔۔'' بچّے نے بہتی ہوئی ناک کو زور سے سانس لے کر نتھنوں میں سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔ ''میری بہن بھی تو ایک ہی فراک پہنے ہوئے ہے۔۔۔ وہ ادھر۔۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''بھیک مانگنا بری بات ہے۔۔'' ثنا نے کہا اور اس کی ہتھیلی پر ایک سکّہ رکھ دیا تو وہ اچھلتا کودتا آگے والی گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔

''تیرے بچے جئیں صاب۔۔۔ ایک روپیہ دے دو۔۔۔ میری ماں کو بچّہ ہونے والا ہے۔۔۔ درد سے تڑپ رہی ہے۔'' اس نے اداس صورت بنا کر التجا میں سر ہلایا تو ثنا کو ہنسی آگئی۔ اس سے پہلے جب وہ گاڑی کی کھڑکی پر بھیک مانگنے آیا تھا جب بھی ثنا کو ہنسی آگئی۔ اس سے پہلے جب وہ گاڑی کی کھڑکی پر بھیک مانگنے آیا تھا جب بھی ثنا کو اپنی ہنسی ضبط کرنا پڑی تھی کہ اس نے ثنا اور اس کے چودہ سالہ بھانجے کو برابر نشستوں پہ بیٹھا دیکھ کر دعا دی تھی۔

''تمہاری جوڑی بنی رہے بی بی جی۔۔۔ میری ماں کو۔۔۔''

وہ چہرے پر کامیابی سے اداسی اوڑھ کر بولا تھا۔۔۔ مگر ثنا نے اس کی پوری بات سننے سے پہلے اس سے اس کے کُرتے کے بارے میں پوچھا تو وہ ساری اداکاری بھول کر فطری انداز میں باتیں کرنے لگا تھا۔۔۔ اور انگلی کے اشارے سے چوک کی دوسری طرف اس نے گود میں ننھی سی بچّی لیے اپنی اماں بھی اُسے دکھائی تھی۔

سامنے والی گاڑی سے کچھ نہ پا کر جب وہ دوسری طرف کو اُٹھلاتا ہوا لپکا تو ثنا کو اس ننھے سے ٹھگ پر پیار آگیا تھا۔

سگنلز کی بتی ہری ہو گئی تھی اور ثنا نے گاڑی بڑھاتے ہوئے دیکھا کہ وہ پٹڑی پر بیٹھا اپنے کُرتے کے اوپر لٹکی ہوئی جیب میں سے پیسے نکال کر انہیں الٹ پلٹ دیکھتا ہوا

اپنی ننھی ننھی ٹانگیں جھلاتا اونچی آواز میں کوئی فلمی گانا گاتا ہوا انہیں گن رہا تھا۔ اور دوسری طرف سے اس کی ماں اس کے انتظار میں تھی کہ وہ پیسے جیب میں رکھے تو وہ اسے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بھُنے ہوئے گرگرم چنوں کی پڑیا تھمادے۔

مگر یہ بچّہ جو آج ثنا نے چوک میں دیکھا تھا وہ بھیک مانگنے والے اکثر بچوں سے مختلف تھا۔ جو بچّے اس نے بھیک مانگتے دیکھے تھے وہ خالص کاروباری انداز میں بھیک مانگا کرتے۔ بھیک مل گئی تو ٹھیک نہ بھی ملی تو کچھ قدم آگے بڑھا دیئے۔ یہ بچّہ کچھ اس انداز میں بلک بلک کر صدائیں لگاتا تھا کہ دل دہل جاتا۔ نم آنکھیں لیے رقت بھری آواز میں۔۔۔ رک رک کر جیسے درد سے کراہ رہا ہو۔۔۔ دیکھنے میں وہ صحت مند نظر آرہا تھا۔ خوبصورت بھی بہت تھا۔ گورا رنگ سنہرے بال بھوری آنکھیں۔ اسنے اپنی ایک ٹانگ موڑ رکھی تھی اور ایک پھیلا رکھی تھی۔ سڑک کے کنارے پڑی بجری کے ڈھیر کے ساتھ اسنے اپنی پیٹھ ٹکا سی دی تھی۔ پھٹے ہوئے یا پھاڑے گئے پاجامے میں سے اس کا مڑا ہوا گھٹنا نظر آرہا تھا جو زخمی تھا۔

ثنا نے کھڑکی سے کچھ سکّے اس کی طرف اچھال دیئے۔ ویگن آگے بڑھ گئی۔

شام کو جب یہ قافلہ لوٹا تو ثنا نے ایک دوسری سڑک پر ویسی ہی دلدوز صدا سنی تو دیکھا کہ وہی بچہ اب رو رو کر مانگ رہا تھا اس کے بھرے بھرے سنہرے رخساروں پر موٹے موٹے آنسو پھیل رہے تھے۔ اس کے پیارے سے مکھڑے کو دیکھ کر دل میں ہمدردی کے ساتھ پیار بھی امڈ آتا تھا۔ راہگیر اس کے سامنے پھیلے کپڑے پر کبھی سکّے کبھی نوٹ ڈال جاتے تو ایک نظر اسے غور سے دیکھنے پر مجبور سے ہو جاتے۔

سارا راستہ ثنا کی آنکھوں میں بلک بلک کر بھیک مانتے ہوئے اس بچّے کا چہرہ سمایا رہا۔۔۔ بچہ کیوں رو رہا تھا؟ صدائیں لگانا اس کا کاروباری انداز ہو سکتا ہے مگر آنسوں بہانا۔۔۔۔ وہ گھر پہنچ کر اب باقاعدہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے ویسے بھی اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ دوسروں کے سکھ میں اسے اپنے دکھ مٹتے ہوئے دکھائی دیتے۔ خود اس نے اپنے حصے کے دکھوں سے کچھ زیادہ ہی دکھ پائے تھے۔ مگر

وہ دوسروں کے دکھوں سے بھی اسی طرح غمگین و پریشان ہو جاتی جیسے اپنے دکھوں سے۔ان کے مختلف مسائل حل کرنے کے سب پہلوؤں سوچتی اور سوچتی چلی جاتی ۔۔۔ جب تک بات نہ بنتی بے چین رہتی۔

''برتن والے چوک میں ایک سات آٹھ سالہ بچہ بھیک مانگ رہا ہے۔'' ثنا نے علاقے کے انسپکٹر کوفون کیا۔

''میڈم ہر چوک پر کئی بچے بھیک مانگتے ہیں۔۔۔۔ بلکہ ان کے ماں باپ بھی۔''

''میں ثنا بول رہی ہوں انسپکٹر صاحب۔۔۔ مجھے کچھ شبہ ہے۔''

''اوہ میڈم۔۔۔آپ ہیں۔۔۔کس طرح کا شک؟''

''صبح سے میں نے اسے مختلف جگہوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔۔ بچہ لگا تار روبھی رہا ہے۔۔۔زخمی بھی ہے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔۔۔کیا بات ہے۔''

انسپکٹر ساجد سہروردی تھانے سے کچھ سپاہیوں کو لے کر نکلے تو ثنا بھی گھر سے نکلی۔ دونوں تقریباً ساتھ ساتھ چوک پر پہنچے۔

بچہ وہیں تھا۔۔۔ اس کی آواز تقریباً بیٹھ گئی تھی۔پکار جاری تھی۔آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں سنہرے بالوں پر دھول کی ایک موٹی تہہ جم چکی تھی۔آنکھیں سوج گئی تھیں۔ناک سردی سے سُرخ ہوری تھی۔

انسپکٹر ثنا کو بچے کی طرف بڑھتے دیکھ کر خود بھی وہاں پہنچ گیا۔اس نے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی۔۔اور بچے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟'' ثنا نے بچے کے پاس بیٹھ کر آہستگی سے کہا۔

''ہاں بیٹا کیا نام ہے۔۔۔؟'' انسپکٹر سہروردی نے رکوع میں جھک کر پوچھا تو ایک لمبی پتلی سانولی عورت دوڑتی ہوئی آئی۔۔

''مُنا۔۔۔مُنا۔۔۔کیا ہوا میرے بچے کو۔'' اس کا سن کوئی پینتالیس چھیالیس کے آس پاس تھا۔ناک بڑی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور کسی قدر دھنسی ہوئی۔۔دونوں آنکھوں

کے گرد ہڈیوں کے دائرے اتنے واضح تھے جیسے کسی نے پرکار سے کھینچ رکھے ہوں۔ دانت سیاہی مائل زرد اور ادھ ٹوٹے۔ میلے میلے سے ناخن اور لباس بھی میلا۔ گو کہ لباس پرانا نہیں تھا۔ بچے کی شکل صورت سے اس کی مشابہت نہ تھی اور اس کے جملے کی مناسبت سے اس کی آواز میں تجسس تھا نہ پریشانی۔

''یہ تمہارا بچہ ہے؟ انسپکٹر نے ہاتھ میں لی ہوئی چھڑی عورت کی طرف اُٹھا کر پوچھا۔

''ہاں صاب میرا ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''بیمار ہے کیا۔۔۔؟'' ثنا نے بچے کے زخمی گھٹنے کو دیکھ کر کہا اور اس کا پائجامہ، سرکا کر، زخم کا معائنہ کرنے لگی۔

''نہیں جی۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ وہ تھوڑا۔۔۔ گر گیا تھا۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام رضیہ ہے صاب جی۔''

''اور بچے کا؟'' اس دفع انسپکٹر نے سوال کیا۔

''میرا نام را۔۔'' بچے کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی عورت بولی۔

''اس کا نام راشد ہے جی۔'' اس نے کہا اور چہرے پر خوشامدانہ سی مسکراہٹ سجا کر دونوں کو باری باری دیکھنے لگی۔

''کتنے بچّے ہیں؟'' انسپکٹر سہروردی ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے اپنی ٹانگ تھپکتا ہوا بولا۔

''دو اور ہیں۔۔۔۔ وہ اُدھر۔'' بچے نے عجلت سے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے سڑک کی دوسری جانب دکھاتے ہوئے اپنے بے ترتیب ہوتے ہوئے سانس کو قابو لانے کے لیے اپنا چھوٹا سا سر اپنے بائیں کندھے پر ٹکا دیا۔ اسکے چہرے پر عجیب تجسس بھری متفکرانہ سی امید کے تاثرات تھے۔

''وہ میرے بچے نہیں صاب جی۔'' عورت نے بظاہر پرسکون آواز میں کہا۔ ''وہ تو پتہ نہیں کون ہیں۔'' وہ بچے کی طرف رُخ کر کے چہرے پر نرمی سی طاری کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگراس کے کانپتے نتھنوں اور تڑپتی ہوئی پتلیوں سے اس کا ذہنی اضطراب صاف عیاں تھا۔

''چپ ہو جا۔۔۔۔۔۔۔طبیعت خراب ہے تیری زیادہ بولا نہیں کرتے۔'' اس نے ترچھی نظر سے بچے کے گھٹنے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بے تحاشہ آئے ہوئے غصے کو مسلسل دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ اس کی شہادت کی انگلی تنبیہ کے طور پر اب بھی بچے کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ بچے نے اپنا ہاتھ چھوٹے سے دہانے پر رکھ لیا اور عورت کو خوف زدہ سی آنکھوں کو تکتا رہا۔ اس کا پیلا چہارہ اب سفید پڑ گیا تھا۔

''بات کیا ہے۔۔۔۔ذرا ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔۔۔۔انسپکٹر نے کچھ سختی سے کہا اور سپاہیوں کو چوک کی دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا۔

''میں ان بچوں کو نہیں جانتی صاب۔'' عورت انسپکٹر کی طرف بے تاثر نظروں سے دیکھتے ہوئے سکون سے بولی۔

''یہ ہی ایک بچہ ہے تمہارا؟'' ایک خاتون حولدار نے پوچھا، ''تم تو اب بھی پورے دنوں سے معلوم ہوتی ہو۔''

خاتون حولدار نے عورت کا پیٹ چھو کر کہا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کے پیٹ کا اُبھار گولائی میں نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہونے والے بچے کی موجودگی والی سختی ہے وہ کچھ عجیب بے ترتیب سا کوئی بوجھ لیے ہوئے تھی۔۔۔خاتون حولدار نے اس کے میلے کچیلے گھاگرے میں پھنسا دوپٹہ کھینچا تو کئی چھوٹے بڑے نوٹ اور ڈھیروں سکّوں کے ساتھ لوہے کی ایک چھوٹی سلاخ بھی گری۔

''یہ میرے پیسے ہیں صاب جی۔۔۔میں نے بہت دنوں سے اکھٹے کیے ہیں۔'' وہ کچھ جھک کر مگر عجلت سے پیسے جمع کرنے لگی۔

''یہ میری نہیں ہے۔'' اس نے بے خیالی میں سلاخ اُٹھا کر چھوڑ دی۔ یہ پیسے ہم

نے دیئے ہیں رضیہ بی کو۔ سپاہیوں کے ساتھ آنے والے بچوں میں سے ایک تقریباً پانچ سال کی عمر کے بچے نے ننھا سا سر فخر سے تان کر کہا۔ ''ہاں میں نے بھی دیے ہیں'' دوسرے بچے نے جو مشکل سے چار برس کا رہا ہوگا اُس کی تائید کی۔

''رجیہ بی ہماری سچی مچی کی ماں ہے۔'' وہ عورت کو دیکھ کر معصوم سے چہرے پر کامیابی کے ساتھ مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''دیکھا رضیہ بی ہم نے اور کچھ نہیں بتایا نا؟۔۔۔۔ہم کو مت مارنا۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں کہنے لگا۔ عورت نے پولیس کی طرف نظر اُٹھائی تو خاتون حولدار نے بڑھ کر اُس کی زنگ آلود نل جیسی کلائی میں ہتھکڑی پہنا دی۔

ثنا نے راشد کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ کھڑا نہ ہو سکا۔ اسکی دائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی اور کمزوری اور نقاہت کے باعث وہ ایک ٹانگ پر ایستادہ نہیں رہ پا رہا تھا۔ ٹانگ کا زخم گل سڑ گیا تھا۔ اس میں بہت اوپر تک پیپ بھری ہوئی تھی اور درمیان میں سے جہاں زخم زیادہ گہرا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے سفید دھاگے سے لہرا رہے تھے۔ ثنا نے غور سے دیکھا تو اس کے حلق میں اس کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔ وہ دھاگے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے بے شمار کیڑے تھے۔

لڑکے کا نام راہل تھا۔ عورت واقعی بچے اُٹھانے والے گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے دو مرد ساتھی بھی پکڑے گئے۔ ان میں سے لعل سے عاری آنکھ والے لعل جی بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے راہل کی ٹانگ پر سریا مار دیا تھا۔ وہ راہل کو اسی کے گھر کے باہر سے اُٹھا لائے تھے۔

راہل کے والدین ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اس کا باپ شرابی تھا۔ نشے کی حالت میں وہ اپنی ہستی کو منوانے پر ایسا تل جاتا کہ گھر اور سکون دو جدا چیزیں ہو کر رہ جاتی۔ باپ کھا پی کر سو جاتا اور ماں رات رات بھر روتی رہتی۔ جب باپ کی گرج بند اور ماں کی سسکیاں واضح ہو جاتیں تو راہل گھر کے کسی کونے سے نکل کر ماں کے پیٹ میں اپنے چھوٹے چھوٹے گھٹنے ٹھونس کر سو جاتا۔

اس رات راہل نے باپ کو ہاتھوں کی جگہ ماں کو ایک پرانی ہا کی سے پیٹتے دیکھا۔ جب ماں کے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی تو وہ بہت ڈر گیا گھر سے باہر نکل آیا۔ باپ نے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو چلاّ چلاّ کر اس کا نام پکارنے لگا۔ باپ کے غصے میں کانپتی آواز سن کر وہ بھاگنے لگا۔

رضیہ بی نے اندھیرے میں بھاگتے ہوئے بچے کو دیکھا تو دوڑ کر اس قریب پہنچ گئی۔ وہ خود جیسے کہ اندھیرے سے اچانک پھوٹ نکلی ہو۔

''کہاں جا رہے ہو۔۔۔آؤ ہمارے ساتھ۔۔۔اندھیرے میں کوئی بھوت بھالو اُٹھالے جائے گا۔۔۔آؤ ہم بہت پیار کریں گے۔'' رضیہ بی نے اس کے شانے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ بچے نے رفتار تیز کر لی تو رضیہ بی بھی تیز تیز چلنے لگیں۔

''پاپا ماریں گے۔'' وہ مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا بولا۔

''کوئی نہیں مارے گا۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔'' رضیہ بی نے سرگوشی کی سی آواز میں کہا اور راہل کو تقریباً دھکیلتی ہوئی تیز تیز چلنے لگی۔۔۔۔

''نہیں پاپا صبح اُٹھتے ہی مجھے بلائیں گے۔۔۔۔۔مجھے جانا چاہیے۔ پاپا ممی کو ہاکی سے مار ڈالیں گے۔ ممی ڈر رہی ہوں گی۔'' وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا اور خود کو رضیہ بی کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے زار و قطار رونے لگا۔

''چلو نا ہمارے ساتھ۔۔۔ابھی جاؤ گے تو تمہیں بھی ماریں گے پاپا۔۔۔صبح ہم تمہیں تمارے گھر چھوڑ دیں گے۔''

عقب سے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی تو راہل نے نئے اسیر ہوئے پرندے کی طرح اپنی کانپتی ہوئی گردن ادھر اُدھر گھمائی مگر اندھیرے میں اسے اور کوئی دکھائی نہ دیا۔ جب اسے اور کچھ نہ سوجھ پایا تو اس نے اپنا خوف زدہ چہرہ رضیہ بی کے ہی دامن میں چھپالیا۔

کچھ ہی لمحوں میں لعل جی دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا اور راہل کے دوسرے کندھے پر اپنا پتھریلا ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔ اپنی اکلوتی آنکھ میں تعریف بھر کر جانے اس نے رضیہ

بی سے کیا کہا کہ راہل نے دونوں کا قہقہہ سنا اور ان کو باری باری دیکھنے کی کوشش کی مگر لعل جی کا ہاتھ اس کے نرم شانے میں ایسے کھبنے لگا کہ وہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر تیز تیز چلنے لگا۔

دوسرے بچوں کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے تھے۔ ایک کو ان کا ساتھی کاغذ جمع کرنے والے بورے میں ڈال کر لایا تھا۔ وہ بچہ اسے ایک سنسان بس اسٹاپ پر اونگھتا ہوا ملا تھا۔ اسکول بس اسے چھوڑ گئی تھی اور ابھی اسے لینے والا پہنچا نہ تھا۔ مستری کسی کی جیب کاٹ کر بھاگ رہا تھا اس نے تنہا بچے کو نیند میں جھولتا دیکھا تو ادھر اُدھر دیکھ کر رُک گیا۔

''تمہاری ممی نے مجھے بھیجا ہے۔ آؤ گھر جانا ہے۔'' اس نے بچے سے کہا تھا۔

''ممی نے۔۔۔۔۔؟'' بچے نیند کے جھونکوں کے درمیان کہا۔

مستری نے باہیں پھیلائیں بچہ اس کی گود میں آتے ہی سو گیا۔ جب وہ ایک تنگ گلی میں پہنچا اور دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آیا تو اس نے بچے کو بورے میں منتقل کر دیا۔ گلی کی نکّڑ کے قریب پڑی ہاتھ گاڑی کے نیچے اُونگھ رہا کتّا بھونکنے لگا تو اُس نے اپنی رفتار تیز کر لی۔

مستری ہی تیسرا بچہ بھی لایا تھا۔ وہ اس کے پڑوسی گاؤں کی ایک بڑھیا کا پڑپوتا تھا۔ مستری نے اسے پڑھائی کا لالچ دیا تھا۔ کچھ ماہ بعد بڑھیا کا انتقال ہو گیا۔ بچے کا اور کوئی نہ تھا۔

پولیس نے چھوٹے بچے کی کتابوں کا بستہ برآمد کر لیا اور ڈائری میں لکھے پتے سے اس کے والدین سے رابطہ قائم کر کے ایک پیچیدہ کیس کو حل کر لیا۔

بُڑھیا کا پڑپوتا بچہ گھر کے حوالے کیا گیا۔ اور راہل کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

تینوں بچوں میں ایک یہ بات مشترک تھی کہ وہ عام بچوں سے زیادہ خوبصورت تھے اور سب سے زیادہ خوش شکل راہل تھا۔ اس کی ٹانگ کے زخم کا علاج وقت پر نہیں ہوا تھا اس وجہ سے زخم میں Tetanus پھیل گیا تھا۔ اسپتال والوں نے اسے داخل تو کر لیا مگر چوں کہ ڈاکٹر صاحبان ہڑتال پر تھے اس لیے نرسیں وغیرہ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کرتیں۔

نہلانے دھلانے کے بعد راہل ننھا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ ثنا لگاتار اس کے پاس جاتی تھی۔ وہ اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ اسے اپنے والدین کا نام معلوم تھا اور اپنے

علاقے کو وہ جواہر نگر بتاتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پھر ہر شہر میں ایک آدھ جواہر نگر پایا جاتا ہے۔ پولیس کو اس کے گھر والوں کو تلاش کرنے میں خاص دشواری ہو رہی تھی۔ راہل اپنی ماں کو یاد بھی بہت کرتا تھا۔ ثنا روز اس کی امید بندھاتی تھی کہ اس کے گھر والے اسے لینے آنے والے ہی ہیں۔۔۔ پھر کون جانے اس رات اس کی ممی ہا کی کی مار سہہ بھی پائی تھی کہ نہیں۔۔۔۔۔۔۔

آج ہڑتال کا بارہواں دن تھا۔۔۔۔۔کل ہڑتال ختم ہونے والی تھی۔۔۔۔۔
پھر راہل اچھا ہو جائے گا۔۔۔ ثنا اطمینان سے سوچنے لگتی۔ راہل نے ابھی ابھی آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ نہایت پرسکون نظر آرہا تھا۔ شاید وہ اپنی ممی کو خواب میں دیکھ رہا ہو۔ اپنی ممی کے سینے سے لپٹا ہوا رضیہ اور لعل جی کے مظالم کی کہانی سنا رہا ہو۔۔۔ شاید پوچھ رہا ہو کہ اس دن پاپا کی ہا کی سے مارنے کے بعد ممی بچ گئی تھی یا نہیں۔

ثنا بھی آنکھیں بند کیے کرسی پر نیم دراز سی تھی۔ آج راہل کئی دن بعد مسکرایا تھا۔۔۔ شاید اس کے ٹانگ کی تکلیف آج کم ہوگئی تھی۔ شاید زخم بھر رہا تھا۔ ثنا کو اس سے انسیت سی ہوگئی تھی۔۔۔۔ اگر راہل کے والدین کا پتہ نہ چلا تو وہ اسے اپنا بیٹا بنالے گی۔ اگر والدین مل گئے تو بھی وہ اس سے ملنے جایا کرے گی۔۔۔ شادی تو اس نے کی نہیں تھی۔۔۔ راہل کہیں بھی رہے وہ اسے اپنا بیٹا سمجھتی رہے گی۔۔۔ اس نے تصور میں راہل کو اپنی ممی کے برابر کھڑے کسی ان دیکھے دروازے کی دہلیز پر اپنا منتظر پایا۔۔۔ اور وہ رنگین کاغذ میں لپٹے تحفے لیے اُس کی طرف بڑھ رہی ہے۔۔۔

اس کا دل آج پہلی بار یہ حسین تصور باندھ پایا تھا۔ فرطِ جذبات سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ اور ہونٹوں پر ممتا بھری مسکراہٹ لیے راہل کی طرف دیکھا۔

راہل آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔۔۔ مگر اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور ہڑتال ختم ہونے میں ابھی اٹھارہ گھنٹے باقی تھے۔

☆☆

اچھی صورت بھی کیا

محمد ارمان حسن

دخترِ کشمیر، شیریں لب و لہجے کی مالکہ اور اپنے عہد کی نمائندہ افسانہ نگار ترنم ریاض کی غزل کے اس شعر سے اپنی گفتگو کا آغاز کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔۔

کوئی دن کی باتیں ہیں کچھ اور سانسیں
بہت مختصر روح کے سلسلے ہیں

۱۹۸۰ء کے بعد آنے والی خواتین فکشن رائٹرس اور شاعرات کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو اس فہرست میں ترنم ریاض کا نام شامل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ترنم ریاض نے اُردو دنیا میں بڑی آہستگی سے قدم رکھا اور اپنے شیریں لب و لہجے سے سماج کے بڑے بڑے مسئلے پر جو نشتر چلائے ہیں وہ ترنم ریاض کا خاصہ بن گئے ہیں۔ ترنم ریاض کی پہلی پہچان تو یہ ہوئی کہ وہ پروفیسر ریاض پنجابی کی اہلیہ ہیں، لیکن بہت قلیل مدت میں ہی ادبی دنیا میں انہوں نے اپنی منفرد شناخت قائم کر لی اور بہت ساری اصناف سخن کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ ترنم ریاض بحیثیت شاعرہ، بحیثیت افسانہ نگار اور بحیثیت ناول نگار کے اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ وہ بیک وقت شاعری بھی کرتی ہیں، افسانے اور ناول بھی لکھتی ہیں، تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی رقم کرتی ہیں تو وہیں دوسری جانب دوسری زبان کے ادب کی تخلیقات کا ترجمہ کرنے میں بھی شغف رکھتی ہیں۔ انہیں دخترِ کشمیر کہا جاتا ہے لیکن ان کے فن کی معراج یہ

ہے کہ بین الاقوامی سطح پر محبانِ ادب اور خصوصاً عشاقِ اُردو انہیں اُردو کا ایک بڑا نام تسلیم کرتے ہیں۔ ترنم ریاض کے بارے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

''ترنم ریاض وادی کشمیر کا گلِ نورس ہے، جس نے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا ہے جہاں زمین سخت اور آسمان دور ہے۔''

(اردو افسانے کے صدرنگ ص۔۱۹۴)

نارنگ صاحب نے انہیں گلِ نورس کا لقب دیا لیکن ساتھ ہی موجودہ دور میں افسانہ نگاری کی صورت حال اور موضوعاتی تنوع کی آگہی بھی دی۔ ترنم ریاض کی ہنرمندی یہ ہے کہ اپنے فن سے سخت زمین کو نئے تجربات سے سرشار کیا اور زمین و آسمان کو اپنے تخلیقی حصار میں لے لیا۔

یوں تو ترنم ریاض کی ادبی نگارشات کو خود ہی ایک نگار خانے کی حیثیت حاصل ہے، جہاں شاعری بھی ہے اور نثر بھی، تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی۔ طویل عرصے تک آل انڈیا ریڈیو سے بھی وہ وابستہ رہیں۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ کرونا جیسی وبا نے انہیں بھی ہم سے چھین لیا اور وہ ۲۰ مئی ۲۰۲۱ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

اب تک ترنم ریاض کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' ہے جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل اکیس افسانے ہیں اور یہ مجموعہ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب ترنم ریاض نے اپنے شوہر پروفیسر ریاض پنجابی کے نام سے کیا ہے۔ میں نے فی الوقت ترنم ریاض کے جس افسانے کو اپنا موضوع بنایا ہے وہ اس مجموعے کا چوتھا افسانہ ''اچھی صورت بھی کیا'' ہے۔

قصہ کہنا اور سننا انسان کی فطرت میں داخل ہے، حیاتِ انسانی کی تشکیل کے بعد ہی سے قصہ گوئی کی روایت دیکھنے کو ملتی ہے۔ مختلف عہد میں اس کی شکلیں تبدیل ہوتی رہی ہیں اور آج یہ مختصر افسانے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ایک افسانہ نگار کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ افسانے کے تمام لوازمات کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی تخلیق کرے۔ ترنم

ریاض کو اردو ادب کا مشہور و مقبول افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ترنم ریاض نے اپنے افسانوں کے ذریعے عصر حاضر کے سماجی مسائل کو موضوع سخن بنایا اور بے باک انداز اختیار کیا۔ اچھی صورت بھی کیا ایک اہم موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ افسانے کا موضوع خصوصاً بچہ چور گروہ کا پردہ فاش اور عموماً محبت، اخوت، رواداری، جذبۂ ایثار اور ایک ماں کی ممتا کے احساس کا بیان ہے۔

ترنم ریاض اپنی تخلیقات میں تشبیہات اور استعارات کا بھی خوب خوب استعمال کرتی ہیں، لہٰذا ''اچھی صورت بھی کیا'' افسانے کی سرخی ایک استعارے کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ کبھی کبھی اچھی صورت ہزار غم اور غصے کو کافور کر دیتی ہے اور کبھی اچھی، سچی اور پیاری صورت اپنے وجود کو بھی کھو دیتی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے ترنم ریاض نے ایک طرف معصوم بچے کی جدوجہد کو قلم بند کیا ہے تو دوسری جانب بچہ چور گروہ کا بھی پردہ فاش کیا ہے۔ کسی بھی کہانی کا تانا بانا پلاٹ پر ہی بنا جاتا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ سادہ اور اکہرا ہے۔ کہانی شروع ہوتی ہے اور ایک ترتیب سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی اور جھول معلوم نہیں ہوتا۔ اچھے پلاٹ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ از اول تا آخر افسانے کو باندھے رکھتا ہے، جو یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔

کرداروں پر نظر ڈالیں تو افسانے کو کم کرداروں کے ذریعے آگے بڑھایا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کردار کا استعمال ترنم ریاض نے ضرورتاً کیا ہے، ان کی نظر پیغام رسانی پر زیادہ ٹکی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس افسانے میں چھوٹے بڑے تقریباً دس کردار موجود ہیں لیکن ثنا اور راہل (راشد) اس کے دو مرکزی کردار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ کہانی کی بنت میں جہاں مرکزی کردار راہل ایک متوسط طبقے سے متعلق نظر آتا ہے، وہیں کچھ ایسے کردار جو گمنام ہیں لیکن معاشرے کی ایک بہت بڑی سچائی بھی ہیں، جو اپنے طبقے کے احوال بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ غربت اور مفلسی میں پلے ان بچوں کے لئے جاڑے کا موسم کسی اذیت سے کم نہیں۔ وہ اور اس کی منہ بولی بہن ایک ہی کرتا پہنتے ہیں، اسی

کرتے میں سو بھی جاتے ہیں۔اس کی ادائیں اور صدائیں بھلے ہی مصنوعی ہوں لیکن ان کی محرومی اپنی جگہ مسلم ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔۔۔

''تمہیں اس چھوٹے سے کرتے میں سردی نہیں لگتی؟

''بچے نے بہتی ہوئی ناک کو زور سے سانس لے کر نتھنوں میں سمیٹتے ہوئے کہا تھا'' میری بہن بھی تو ایک ہی فراک پہنے ہوئے ہے ۔۔۔۔۔۔۔وہ ادھر۔۔۔۔۔۔۔۔اس نے ہنستے ہوئے بتایا''۔

(افسانہ۔''اچھی صورت بھی کیا'')

ترنم ریاض کا کمال یہ ہے کہ وہ معاشرے کی ہر چھوٹے بڑے پہلو پر عمیق نظر رکھتی ہیں۔ایک Professional مانگنے والے بچے اور زبردستی اس کام میں لگائے گئے بچے میں فرق واضح کرنا،ان کے گہرے مشاہدے کا پتہ دیتے ہیں۔ثنا کے سوال پر راہل کا فطری انداز ملاحظہ کریں۔۔۔

مگر ثنا نے اس کی پوری بات سننے سے پہلے اس سے اس کے کرتے کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ ساری اداکاری بھول کر فطری انداز میں باتیں کرنے لگا تھا۔۔۔

ترنم ریاض نے ہنرمندی کے ساتھ ان کرداروں کا انتخاب کیا اور قصہ کی نفس کو صفحہ قرطاس پر اتار دیا ہے۔افسانے کی شروعاتی کیفیت محسوس کیجئے۔۔۔

''ممی مجھے لینے آرہی ہے نہ آنٹی؟

سنہری بالوں اور بھوری آنکھوں والے گڈے نے آنکھیں میچنے سے پہلے کہا کہ اس کی آنکھیں شاید نیند یا پھر دواؤں کے اثر سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

''ثنا نے جب اثبات میں سر ہلایا تو اس کے سوکھے پژمردہ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی''۔ (افسانہ۔''اچھی صورت بھی کیا'')

افسانے کا یہ اقتباس جو خاتمے (Climax) سے تعلق رکھتا ہے اس سے افسانے کا آغاز کرنا ایک دانستہ قدم معلوم ہوتا ہے، وہ شاید اس لیے کہ قاری پر ایک اثر قائم ہو اور وہ

پوری کہانی پڑھنے کے لئے بے قرار ہو جائے۔ مکالمہ کسی بھی نثر یا صنف کی روح ہوتا ہے۔
چونکہ ترنم ریاض کا تعلق کشمیر سے ہے اور انہوں نے کشمیری تہذیب وثقافت اور یہاں کے المناک واقعات اور حادثات پر بہت کچھ لکھا ہے، اسی بنا پر انہیں کشمیر کا نمائندہ افسانہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ افسانے میں جس جگہ یا خطے کا کردار ہوتا ہے وہ اس کی زبان سے وہیں کی بولی بلوانے کی مثبت کوشش کرتی ہیں اور کہیں بھی مکالمے میں ان کی مقامیت حائل نہیں ہوتی ہے۔ اس افسانے میں ثنا جو ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے، وہ پڑھی۔ لکھی لڑکی ہے اور ایک ہمدردانہ دل رکھتی ہے۔ اس کی زبان ایک پڑھی لکھی خاتون کی زبان معلوم ہوتی ہے یہ اقتباس دیکھیں۔۔۔

''میں ثنا بول رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ انسپکٹر صاحب۔۔۔۔۔۔

مجھے کچھ شبہ ہے۔ او میڈم۔۔۔۔

آپ ہیں۔۔۔۔۔۔ کس طرح کا شک؟ صبح سے میں نے اسے دو مختلف جگہوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔ بچہ لگا تار رو بھی رہا ہے۔۔۔۔۔۔ زخمی بھی ہے۔۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا بات ہے؟۔''

(افسانہ۔ ''اچھی صورت بھی کیا'')

ترنم ریاض نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایسے الفاظ کسی پڑھی لکھی یا Educated خاتون کی زبان سے ہی ادا ہو سکتے ہیں، ہاں دوسری جانب رضیہ اپنے کردار کے برعکس بولی بولتے ہوئے نظر آتی ہے۔ ممکن ہے وہ بھی ویسی زبان جانتی ہو یا اپنے معاشرے اور پیشے سے حاصل شدہ تجربات سے Influenced ہو۔ وہیں چھوٹے بچوں کا یہ انداز بیان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ملاحظہ کریں۔۔۔۔۔

''رجیہ بی ہماری سچی مچی کی ماں ہے''

دیکھا رضیہ بی ہم نے اور کچھ نہیں بتایا نا؟

''ہم کو مت مارنا''۔ (افسانہ۔ ''اچھی صورت بھی کیا'')

ترنم ریاض بحیثیت افسانہ نگار اپنے معاصر لکھنے والوں میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ دنیا دیکھنے کا ان کا اپنا ایک الگ انداز ہے اور اسے ضبط تحریر میں لانے کا بھی۔ ترنم ریاض شور پسند نہیں کرتیں بلکہ آہستگی سے اپنی بات کہنے اور اسے بروئے کار لانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ ان کی تخلیق کا مقصد اور نقطۂ نظر صاف ہوتا ہے۔ ترنم ریاض نے اس افسانے میں بھی سماج کے اہم مسئلے پر قلم اُٹھایا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ اپنے مفاد اور ذرا سے پیسے کیلئے ایک عورت دوسری عورت کے دُکھ اور کرب کو نہیں سمجھتی ہے کہ اپنے بچے کو کھونے کے بعد اس کی صورتِ حال کیا ہوگی؟ وہ کیسا محسوس کرے گی؟ حالانکہ یہ ایک مختصر افسانہ ہے اس کے باوجود بھی وحدت تاثر کہیں ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ ایک بچہ جو اپنے والد سے خوفزدہ ہوکر گھر سے بھاگتا ہے اور بچہ چور گروہ کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ ثنا جو ایک سماجی کارکن ہے، اسے سگنل پر زخمی حالت میں وہ بچہ بھیگ مانگتے ہوئے ملتا ہے۔ پولیس کی مدد سے ثنا بچہ چور گروہ کی سربراہ رضیہ تک پہنچتی ہے جہاں پر راہل جیسے اور بھی بچے، جسے لال جی اور مستری کے ذریعے اغوا کر کے لایا گیا تھا اور بھیک مانگنے کے کام پر لگا دیا گیا تھا۔ جب ان کا پردہ فاش ہوتا ہے تو باقی کے بچوں کو ان کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے اور راہل چونکہ زخمی تھا لہٰذا اسے اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ہڑتال کی وجہ سے بارہ دنوں تک زندگی سے لڑنے کے بعد اس کا بدن نیلا پڑ جاتا ہے۔ یہ کہانی یہیں پر اختتام پذیر ہوتی ہے لیکن قاری بے چین اور بے قرار ہوکر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں کیسے کیسے معاملات اور حادثات پیش آتے ہیں۔

بچہ چوری معاشرے کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ ملک گیر اور بین الاقوامی سطح پر پچھلی کچھ دہائی سے اس میں تیزی آئی ہے۔ ہندوستان میں بھی آئے دن بچہ چوری کے معاملے دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ اسکول سے، بس اسٹاپ سے، سنسان جگہوں سے، تفریحی مقامات اور بھیڑ بھاڑ والے علاقے سے یہ بچوں کو باآسانی اغوا کر لیتے ہیں، اس کے بعد کچھ بچوں کے والدین سے تو یہ موٹی رقم وصول لتے ہیں، وہیں کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جو بچوں کے ساتھ

حیوانیت کی ساری حدیں پار کر دیتے ہیں۔

انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا لیکن یہی اشرف بچوں کو اغوا کر کے اپنے مفاد کے لئے بڑی بے رحمی سے کسی کی ایک آنکھ نکال لیتے ہیں، کسی کے ہاتھ، کسی کے پیر توڑ دیتے ہیں گویا کہ انہیں معذور کر کے مختلف جگہوں پر بھیک مانگنے کے لئے لگا دیتے ہیں اور معصوموں کی زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔افسانہ ''اچھی صورت بھی کیا'' کے ذریعے ترنم ریاض نے اس اہم مسئلے پر بڑی بے باکی سے قلم اُٹھایا اور معاشرے کا ہر خاص و عام اس جانب سنجیدگی سے غور کرے یہ ترغیب دینے کی کوشش کی ہے۔

''اچھی صورت بھی کیا'' کے فعال کردار ثنا اور راہل سے ترنم ریاض نے خوب خوب کام لیا ہے۔راہل کے ذریعے انہوں نے معاشرے کی تلخ حقیقت کو بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو والدین کی نا اتفاقی ،شراب کی لت، گھریلو تشدد کے نتائج میں پیش آتے ہیں جس کا شکار راہل ہوا اور راہل جیسے اور بھی بہت سے بچے ہوتے ہیں جوان حالات کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی ایسے ہی کسی گروہ یا کسی حادثے کی نذر ہو جاتی ہے۔

اس رات راہل نے باپ کو ہاتھوں کی جگہ ماں کو پرانی ہاکی سے پیٹتے دیکھا۔ جب ماں کے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی تو وہ بہت ڈر گیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

وہیں ثنا کے توسط سے سماج میں اخوت ، محبت اور دوسرے کے دُکھ میں دکھی ہونے کا جذبہ بیدار کرنے کی سعی کی ہے اور ساتھ ہی محبت کو عام کرنے کا پیغام بھی دیا ہے۔ ترنم ریاض خود ہی کہتی ہیں کہ۔۔۔

رنجشیں پالنا نہیں آتا
ہم محبت کے لوگ ہیں بھائی

مٹّی

''ایک کمبل مجھے دو گے؟'' کشن لال نے ہلال احمد کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ کر کہا کہ اس کی آنکھوں میں چھپی التجا اور بے یقینی بیک وقت واضح ہوگئی۔

اگر وہ کچھ اور وقت صبر سے کام لینے کی کوشش کرتا تو شروع دسمبر کی اس یخ بستہ رات میں وہ ایک پل کے لیے بھی جھپکی نہ لے پاتا۔ کیونکہ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اور کسی طرح کچھ وقت کے لیے سو جانا چاہتا تھا۔ یہ بات دوسری تھی کہ اسے اپنی درخواست کے رد ہو جانے کا نوے فی صد یقین تھا۔ باقی دس فیصد اس نے شک کے حوالے کر دیا تھا۔ اُمید بھرے اس شک، کے جو صرف ایک انسان ہی دوسرے انسان پر کر سکتا ہے۔

مارے سردی کے کشن لال کی سانولی رنگت گہرا گئی تھی ہونٹ تقریباً سیاہ ہو گئے تھے۔ اس کی گرم جیکٹ کے سارے بٹن بند تھے۔ اور اندر سے ایک بغیر آستین اور ایک پوری آستین والا سوئیٹر پہننے کے باوجود وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ کچھ ہی مہینے پہلے نیا نیا ڈیوٹی پر تعینات ہوا تھا۔ اور اس علاقے میں اسے ہنگامی حالات میں بھیجا گیا تھا۔ اس خطے کے موسم کا اسے بالکل تجربہ نہ تھا۔ اس لیے کچھ دن پہلے تک وہ بیماری جھیلتا رہا اور ابھی تک کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

کشن لال نے پنڈلیوں تک تنے ہوئے موزوں کو اور اوپر کھینچا، مگر اس کا ہاتھ ہٹتے ہی وہ واپس اپنے جگہ پر آ گئے۔ اس نے اپنی سبزی مائل منگیا رنگ کی وردی کے کالر کی

سلوٹ سیدھی کر دی۔ اور ٹوپی جو پہلے ہی کانوں تک کو ڈھک رہی تھی، اسے اور اچھی طرح سر پر جمانے کی کوشش کرتے ہوئے ہلال احمد کی طرف منتظر مگر بے تاثر آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ ہلال احمد بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے باوجود سخت سردی کے گریباں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

اس کی وجیہہ چھاتی کے سیاہ بالوں پر اس کے زخمی ہونٹوں سے ٹپکے ہوئے خون کی بوندیں جم چکی تھیں۔ وہ ٹانگوں پر کمبل پھیلائے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کمبلوں کی لمبائی اس کے دراز بدن کو پوری طرح ڈھکنے کے لیے ناکافی تھی۔

''یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو۔'' اس نے تم پر زور دے کر چہرے پر حیرت طاری کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے علاوہ یہاں دوسرا ہے ہی کون۔'' یہ کہتے ہوئے کشن لال اُٹھ کر آہستہ چلتا ہوا سلاخوں کے پاس آ گیا۔ اس نے سلاخوں پر ہاتھ رکھ کر اندر ایک نظر غور سے دیکھا سلاخیں بہت ٹھنڈی تھیں۔ اس نے ہاتھ واپس جیبوں میں ٹھونس لیے۔

''کیوں تمہیں یہ دو نظر نہیں آ رہے؟'' ہلال احمد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے داہنی بائیں جانب اشارہ کر کے کہا۔

''تمہیں بھی تو نظر نہیں آ رہے۔۔۔ تمہیں نظر آتے تو تم ان کے جسموں سے کمبل نہ کھینچتے۔'' کشن لال نے فرش پر ایک ہی جگہ پاؤں بدل بدل کر اچھلتے ہوئے کہا۔

''یہ جسم ہیں؟ انہیں جسم کہتے ہو تم۔۔۔ یہ جسم تو کب کے مٹی ہو گئے۔'' ہلال احمد اپنی آواز کا کرب دبا نہ سکا۔

''جانتا ہوں۔۔۔'' کشن لال نے آہستہ سے کہا۔

''خاک جانتے ہو۔ کچھ جاننے کے لیے آدمی کا انسان ہونا لازمی ہے۔ مجھے تو تم میں انسانوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ تم ایک بے حس درندے سے کسی طرح کم نہیں ہو۔۔۔ تم پتھر ہو۔۔۔۔ تم سب پتھر ہو۔'' اس نے غصّے اور نفرت سے کہا اور منھ اتنی تیزی

سے دوسری طرف پلٹا کہ پتھریلی دیوار سے اس کا رخسار چھل گیا۔

یہ تو وہ اتفاق سے ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ورنہ آج تک اس نے اس سے زیادہ خطرناک کارنامے انجام دئے تھے مگر بغیر کسی کے ہاتھ آئے اپنے پوشیدہ ٹھکانوں پر پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا تھا۔ آج بھی وہ اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ رہا تھا کہ لبِ سڑک ایک زخمی راہگیر کو پڑا دیکھ کر رک گیا اور وہ اسے کندھے پر لاد کر تیز تیز قدم اُٹھا رہا تھا کہ کسی طرف سے ایک دس بارہ سالہ لڑکا سہما ہوا آ کر اس کے ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس نے گھبرا کر لڑکے کو اپنے اور قریب کر لیا۔

''بھیا۔۔۔ بچالو۔۔۔ وہ مجھے پکڑ۔۔۔'' وہ ہانپتا ہوا بات مکمل نہ کر سکا۔ کیونکہ اتنی دیر میں بہت سارے بندوق برداروں نے انہیں گھیر لیا۔

یہ الگ بات ہے کہ انہیں جہاں لے جایا گیا۔ یہ ان تینوں میں سے کسی کی منزل نہ تھی۔ نہ ہی یہ راستہ ہلال احمد نے چنا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ پکڑا گیا تھا۔ وہ تو میکینیکل انجینئرنگ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ اس نے اور اس کے والدین نے مل جل کر یہ خواب دیکھا تھا۔ بہت چھوٹا سا تھا تو اپنی ٹرائی سکل کے ساتھ اپنے اور دوستوں کے ننھی منی مشینریوں والے کھلونوں کی مرمت کیا کرتا۔ کچھ بڑا ہوا تو گھر میں کبھی مرغیوں کا دربہ بنا رہا ہے کبھی بجلی کے تار درست کر رہا ہے، نلوں کو ٹھیک کرتا، سلائی کی شین، گھڑیاں، اس طرح کی تقریباً ساری ہی خراب اشیاء کو کھول کر کارآمد بنا دیتا۔ والدین کو اس کا یہ رجحان پسند آیا۔ داخلے کے امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔۔۔ کالج جوائین کیا مگر۔۔۔

کچھ ہی مہینے پہلے کی بات ہے۔ درخت ابھی ابھی اپنی رنگین باہوں سے برف جھاڑ کر لہرانے لگے تھے۔ بہار موسم شروع ہی ہوا تھا۔ بادام کے پیڑ ننھے ننھے ہرے پتوں اور گلابی شگوفوں کی چنر اوڑھے شرمائے شرمائے سے جھکے جا رہے تھے۔ دار کوب جانے کس نگر سے ہجرت کر کے آتے اور چناروں کی کھوکھلی ٹہنیوں پر اپنی لمبی چونچ سے ٹک ٹک آوازیں پیدا کرتے ہوئے چھید کر کے جانے کن ننھے ننھے کیڑوں کے سکون میں خلل کا

باعث بنتے اور فیروزی رنگ کے دھلے دھلائے نکھرے نہلائے آسمان میں ایک لمبی سی اُڑان بھر کر دوبارہ اسی کام میں، نئے انہماک سے مشغول ہو جاتے۔ نرم نرم دھوپ ہری ہری دھرتی کو اپنی کرنوں سے گدگدا دیتی اور گھاس کے تنکے لہک لہک کر فضا میں اپنی مہک بکھیر دیتے۔ سہ پہر کا وقت تھا کہ آسمان کی نیلاہٹ نگلنے جانے کس کس طرف سے ٹڈیالے، کالے گھنے گرجتے بادلوں کے ریلے اس طرح چھائے کہ اچھی بھلی سہ پہر میں ڈھلتی ہوئی شام کا سماں معلوم ہونے لگا۔ فضا میں میلی سی سیاہی مائل زرد روشنی پھیل گئی۔

ہلال احمد اسی وقت کالج سے لوٹا تھا۔

''آ گیا میرا چاند!'' اس کی ماں نے نظروں سے اس کے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کہتیں آ گیا میرا ہلال تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔

''وہی تو کہا۔۔۔'' وہ اس کے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے بولیں۔

''چاند ہلال ہی تو ہوتا ہے۔۔۔ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہارا چوڑا ماتھا، دیکھ کر تمہارے دادا جان نے یہ نام رکھا تھا۔ کہتے تھے بڑا آدمی بنے گا، چاند کی طرح چمکے گا۔۔۔ خاندان کا نام روشن کرے گا۔۔۔ انشاءاللہ۔''

''تو کیا میں یہ سب نہیں جانتا۔'' ہلال احمد نے مصنوعی ناراضگی ظاہر کی۔

''اوہ میں تو بھول ہی گئی۔ کہ تم جانتے بھی ہو۔'' دونوں ہنس پڑے

''آج میں نے تمہاری نمکین چائے کے لیے پانپور سے باقرخانیاں منگائی ہیں۔'' امی نے کہا۔

''وہاں تو حالات۔۔۔؟'' اس کی آواز میں ہلکی سی سنجیدگی گھل گئی۔

''کل سے بہتر ہیں۔۔۔ تمہارے ابا کو دفتری کام سے اس طرف جاتا تھا۔''

ہلال احمد نے باقرخانی کا ایک کونا توڑ کر چوڑے منھ والی چھوٹی سی بغیر دستے کی پیالی میں بھری گلابی چائے میں ڈبویا ہی تھا کہ باہر میگا فون پر زور زور سے کچھ اعلان سنائی

دیا۔ ہلال احمد باہر کی طرف بھاگا۔

''سب لوگ گھروں سے نکل آئیں۔۔۔۔ کچھ شرپسندوں کی تلاش ہے۔ گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔۔۔ ہم پانچ منٹ کا وقت دے رہے ہیں۔''

''یا اللہ۔۔۔ ادھر بھی۔۔۔۔'' اس کی امی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

لوگوں نے جلتے چولہے بجھا دئے۔ ادھ پکی ہانڈیاں، ادھ پئے پیالے، کام آرام سب کچھ بیچ میں چھوڑ، باہر نکل آئے۔ سارا محلّہ پلک جھپکتے ہی خالی ہو گیا۔ لوگ سامنے کے بڑے میدان میں جمع ہو گئے۔ یہ میدان دھان کے سنہرے خوشوں کو پتھر کی بڑی بڑی آڑھی رکھی ہوئی اوکھلیوں پر پٹخ کر دانے الگ کرنے اور پھر پھٹک کر بوروں میں بھرنے کے کام آتا تھا۔ ادھر ادھر بکھری ہوئی اوکھلیاں شالی کوٹنے کے علاوہ کھیل کے وقت بچوں کے بھی خوب استعمال میں آتیں۔ کبھی ان کے پیچھے چھپا جاتا، کبھی ان کی نشست بنا دی تھی۔ تہواروں، عیدوں، تقریبوں پر لڑکیاں، بالیاں وہاں مل کر، رُف اور وَن وُن جیسے لوک گیت گاتیں۔ چاندنی میں ناچتیں، اٹھکھیلیاں کرتیں۔

ہلال احمد بھی اپنے والدین کے ہمراہ گھر سے باہر آ گیا۔

اندر گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ تلاشیاں لینے والے ایک گھر کبھی دوسرے گھر میں آ جا رہے تھے۔ ایک وردی پوش جب ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جانے والا تھا تو اس کی پتلون کی پچھلی جیب میں سے سونے کی ایک زنجیر جھانک رہی تھی۔ وہ جلدی میں شاید اسے اچھی طرح ٹھونس نہ پایا تھا۔

''میری۔۔۔۔ میری۔۔۔ بچّی کی ہے۔۔۔ اس کی شادی کے لیے۔'' ہلال احمد کا ہمسایہ غلام حسن زور سے بولا اور بھاگ کر وردی پوش کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی باپ کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی گئی اور کچھ دوری پر رک گئی۔

''خاموش بڈھے۔۔۔ دیش دروہی!'' طاقت نے بوڑھی کمزور ٹانگوں پر تندرست لات ماری۔ بوڑھا لڑکھڑایا، گرا اور اس کا پاؤں پکڑ لیا۔

''خدا کے لیے۔۔۔۔میری۔۔۔۔''

''چھوڑ حرام خور۔۔۔۔۔مفت کا کھا کھا کر طاقت آ گئی ہے۔راشن پر سبسڈی ملتی ہے نا۔۔۔ہم کو ہی آنکھ دکھاتا ہے۔''

اس نے گرج کر کہا اور بندوق بوڑھے کی طرف تان دی مگر دور سے اس کو شاید اپنا افسر آتا دکھائی دیا تو اس نے بندوق نیچے کر لی۔

''مفت کا نہیں کھاتا صاحب۔۔۔کوئی سبسڈی نہیں ملتی ہم کو۔۔۔ہم محنت ۔۔۔''بوڑھا رو رو کر کہنے لگا تو وردی پوش نے بندوق کے دستے سے اس ضعیف کے کولہے پر زوردار وار کیا۔وہ بلبلا کر گرا۔وردی والے نے بندوق پھر اوپر کی تو بوڑھے کی بیٹی اپنے باپ پر گر گئی۔۔۔چیخ و پکار شروع ہو گئی۔

''معاف کر دیجیے سر جی۔۔۔آپ لے جائیے۔۔۔جو چاہیں'' وہ رو پڑی۔۔۔

''ہم چور ہیں۔۔۔کیا۔کیا لے جائیں۔۔۔کیا چوری کیا ہم نے۔۔۔۔حرا۔''

اس نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور پھر دھکا دے دیا۔وہ دھڑام سے گری، اس کا سر ادکھلی کے کونے سے ٹکرایا چہرہ سفید پڑ گیا۔اس نے دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا۔اس کا نازک جسم ہچکیاں نگلنے کی کوشش میں جھیل کی طوفانی ہواؤں کی زد میں آئے شکارے کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔

مجمع سُن ہو گیا تھا۔بچے کانپ رہے تھے۔لڑکیاں اپنے رشتہ داروں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔چیخوں کی جگہ ہچکیوں لے لی تھی۔

''یہ۔۔۔یہ کیا۔۔۔یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔قیامت۔۔۔۔۔قیامت کبریٰ!''

ہلال احمد کا باپ چیخ پڑا۔دبی دبی سسکیوں میں اس کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

ایک گولی زن سے اس کے پہلو کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔وہ وہیں پر ڈھے گیا۔

ہلال احمد کی ماں ایک فلک شگاف چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

کہتے ہیں اس رات وردی والے آدھی رات کو پھر آئے تھے۔جانے کس کی تلاش

میں ۔انہیں وہاں کوئی نہیں ملا تھا۔ پھر بھی وہ کئی گھروں میں گھنٹوں رکے رہے۔غلام حسن اس دن سے خون تھوکتا ہے۔اوراس کی بیٹی اس رات سے بول نہیں سکتی۔جب بھی نظر آتی ہے کسی کونے میں دبکی یا دیوار سے چپکی ہوئی۔کسی کے بلانے پراس طرح چونکتی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

ہلال احمد جب باپ کی آخری رسومات ادا کر کے آرہا تھا تو اس کی آنکھوں میں میدانِ حشر کی یاد تازہ تھی۔وہ خلاء میں دیکھتا ہوا چل رہا تھا کہ کھیتوں کے آخری کنارے کے پاس آسمان سے بالکل قریب شعلے بلند ہو رہے تھے۔دھواں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دور سے آتی ہوئی لوگوں کی آہ و بکا پر ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کی سی غیر انسانی آوازوں کا گماں ہوتا تھا۔

گھر پہنچ کر ہلال احمد ماں سے تسلّی کا ایک جملہ بھی نہ کہہ سکا۔اس نے ماں کا سر اس زور سے چھاتی سے بھینچ رکھا تھا جیسے خود ماں اسے بچپن میں کسی بات سے خوف زدہ ہو جانے کی بعد، سینے سے لپٹائے رکھا کرتی تھی۔وہ شاید آج بھی اس کے ممتا بھرے آنچل کی پناہوں میں کھو جانا چاہتا تھا جہاں اسے کوئی دلخراش منظر دکھائی نہ دے۔مگر۔۔۔یکلخت وہ ماں کی باہوں کا حلقہ توڑ کر نکل آیا۔کچھ قدم چل کر ٹھہر گیا۔دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ لمحوں کے لیے پتھر کے بت کی طرح جامد و ساکت آنکھیں پھیلائے ماں کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔جانے اسے کدھر جانا تھا۔

جب وہ کھیتوں کے کنارے والے گاؤں سے گذارا تو اسے راکھ راکھ گھروں کے پاس ادھ جلی لاشیں نظر آئیں۔کہیں سالم، کہیں آدھی۔کہیں اعضا۔جیسے کسی بچے نے کالی مٹی سے انسانی مورتیں بنانے کی کوشش کی ہو اور ناکام ہونے کی صورت میں انہیں آدھی ادھوری چھوڑ کر پھینک دیا ہو۔

ہلال احمد کو اب اور دیکھنا نہیں تھا۔

انجینئرنگ کالج بھی باقی اداروں کی طرح ہفتے میں دو یا تین دفعہ کھلتا تھا۔

''رول نمبر ۲۲۔۔۔۔'' کوئی معلم پکارتا ''ہلال احمد''۔۔۔اپنے ہونہار طالب علم کو جماعت کے کمرے میں دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کرتا۔

''ایبسینٹ ہے سر۔'' کوئی دوسرا طالب علم کھڑا ہو کر پوری کلاس کو دیکھ ڈالنے کے بعد اونچی آواز میں کہہ دیتا۔

''کیا بات ہوگئی اس کو۔۔۔وہ بھی۔۔۔اس کا مستقبل''۔۔۔۔معلم اپنے آپ سے جیسے بات کرتا۔''کیا ہوگا اس کا۔ ایسے ذہین طلباء روز روز نہیں پیدا ہوتے۔۔۔۔'' معلم خود ہی خاموش ہو جاتا۔

ہلال احمد آر۔ ای۔ سی (Regional Engineering College) کا سالِ اوّل کا طالب علم رول نمبر ۲۲ بیچ ۱۹۹۱ غیر حاضر ہے۔ کیا وہ علم کا طلبگار نہیں رہا۔۔۔ ہلال احمد کہاں ہے۔ گھر میں بھی نہیں ہے۔ اس کے کالج کے دوست اب اس علاقے کی طرف بہت کم آتے ہیں۔۔۔ ہلال احمد کی ماں دن بھر تھوڑے وقفے کے بعد سڑک پر نکل آتی ہے۔ جینز، ٹی شرٹ پہنے کسی لڑکے کو بغور دیکھتی ہے۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ ہلال احمد کے متعلق پوچھتی ہے۔ پھر مایوس ہو کر رو پڑتی ہے۔ کسی اور طرف چل دیتی ہے۔ اپنی طرح کی کئی عورتوں سے اس کی پہچان ہوگئی ہے۔ کسی کا لڑکا غائب ہے۔ کسی کا شوہر۔۔۔۔ کسی کا بچہ دل کا مریض ہو گیا ہے۔ کسی کی بیٹی گونگی ہوگئی ہے۔ ہلال احمد بھی غائب ہے۔ پتہ نہیں اس کی ماں اسے کب دیکھے گی۔۔۔ دیکھے گی بھی یا۔۔۔۔۔

اس کی ماں کو اب گھر میں کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ وہ اندر رہ کر کیا کرے۔ اس کے آنگن کے بائیں جانب اُگی پھولوں کی کیاریاں سوکھ گئی ہیں۔ داہنی طرف سبزیوں والا چھوٹا سا چمن اجڑا پڑا ہے۔ کناروں پر پیڑ اداس کھڑے ہیں۔ اب وہاں بلبلیں ہی گاتی ہیں نہ ابابیلیں آتی ہیں۔

ہلال احمد نے ایک سرد آہ کھینچی پھر اپنے زخمی لب کو چھوا۔ دیوار کی چوٹ سے اس میں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

''ہم پتھر ہیں تو تم لوگوں نے کون سی انسانیت کا ثبوت دیا ہے۔'' کشن لال نے ڈیوٹی کی کرسی پر جھپکی لینے کا خیال چھوڑ دیا اور مسلسل فرش پر اچھلتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تو تم لوگوں نے یہ دن دکھلایا۔'' ہلال احمد اداسی سے بولا۔ گذرے ہوئے دنوں کے خیال نے اس کی آواز میں یاسیت شامل کر دی تھی۔

''پہلی تو تم لوگوں نے ہی کی تھی۔ ہم تو فرض نبھار ہے ہیں۔''

''یہ ہے تمہارا فرض۔۔۔۔؟'' ہلال احمد نے اپنی داہنی طرف، دس بارہ سالہ لڑکے کے بے جان جسم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کیا بگاڑا تھا اس معصوم نے اور یہ اپاہج نوجوان۔۔۔ اس کا تو ایک ہاتھ پولیوزدہ تھا۔۔۔ اس نے کیا کیا تھا۔ رپورٹ میں لکھ دو گے کے مدبھیڑ میں ہلاک ہو گیا۔ میں تو جانتا ہوں۔۔۔ میں اسے دھماکے کی جگہ سے کچھ پرے سے اُٹھالے جا رہا تھا۔ اس کا پاؤں بری طرح زخمی تھا۔ کہتا تھا کہ اس کی بیوی گولی کی آواز سے اس قدر دہشت زدہ ہے کہ کہیں دور سے بھی آواز آئے تو وہ گھنٹوں گھر میں بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اور پھر کئی دنوں تک آپنی آنکھیں مکمل طرح سے نہیں کھول پاتی۔ ایک چھوٹا سا بچّہ بھی ہے اس کا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیاں تھیں بیوی کے لیے۔۔ جب۔۔ جب دھماکا میں نے کیا۔۔۔ ان بے گناہوں کو کیوں سزا دی۔۔۔ مجھے ہی سزا دیتے۔۔۔ تمہارے ساتھی کے ایک ہی تھپڑ سے اس بچے کی گردن ٹوٹ گئی۔۔۔'' ہلال احمد کی آنکھیں اس دوران مسلسل نم تھیں۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وہ اس قدر آبدیدہ ہو گیا کہ اس کی گلوگیر آواز اس کے حلق سے نکل نہ پائی۔

''اوپر سے حکم تھا۔۔۔۔ ہم کیا کرتے۔'' کشن لال سلاخوں کے بالکل قریب کھڑے ہو کر آہستہ سے بولا۔

''یہ حکم تو نہ تھا۔۔ کہ جو بھی۔۔۔ جو ملے پکڑ کر بند کر دو۔۔۔۔ گولی مار دو۔''

ہلال احمد کی آواز میں بیزاری کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

''سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لمبے ڈھیلے لباس پہنے۔ کون غلطی کر کے کدھر گھس

جائے ۔ کہاں ڈھونڈے آدمی ان کو۔۔۔کبھی کبھی ایک گلی سے گذر کر وہ پاس کی ہی کسی دوسری گلی سے نکل جاتا ہے تب پکڑا جاتا ہے۔۔۔اتنے راستے اور ہم انجان لوگ۔۔۔کیا کر سکتے ہیں۔''

''اچھا طریقہ ہے۔اگر وہ نہیں پکڑا جاتا تو اس جیسا کوئی جسے علم تک نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔اسے پکڑ لیتے ہو۔ورنہ اس جیسا نہ بھی ہو تو بھی کہاں بچ پاتا ہے۔ایسے حساس علاقوں میں بغیر جانکاری کے جاتے ہو۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔۔'' ہلال احمد ناہموار فرش پر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

''جب یہاں کی مقامی انتظامیہ کچھ نہ کر پائی۔۔۔۔تو ہماری ڈیوٹی لگ گئی۔ ہماری کسی سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔۔''

کشن لال پھر ٹہلنے لگا۔گو کہ بڑے بڑے دریچوں والی کشادہ، روشن راہداری میں اس کی آنکھوں کی سرخی سے اس کی تکان کا اندازہ ہو رہا تھا۔اس کی ڈیوٹی اصل میں دن کی تھی۔شام کو جب ڈیوٹی بدلی تو اس نے اپنی جگہ آنے والے کو چابیاں تھما دی۔وہ جانے والا تھا کہ باہر سے زوردار دھماکہ کے آواز آئی۔اس کا چارج لینے والا بھاگتا ہوا آیا اور بولا کہ شاید اسی گاڑی میں دھماکا ہوا ہے جس سے وہ آیا تھا۔اور اس کا بھائی اس گاڑی سے دوسری جگہ جو قریب ہی تھی جانے والا تھا۔وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔بلکہ باقی لوگ بھی باہر کی طرف بھاگے۔ایک وہ وہاں رہ گیا۔اس کا ریلیور نہیں لوٹا۔شاید اس کا بھائی زخمی یا، جانے کیا ہوا کہ اور لوگ بھی ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔جب تک وہ اچھلتا کودتا رہا ٹھیک رہا۔اب ٹہلتے ہوئے اسے پھر سردی نے اپنی جکڑ میں لے لیا۔وہ کچھ آرام بھی کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے ایک کمبل پکڑا دو۔'' کشن لال نے ایک بار پھر کہا۔

''تمہیں مانگنے کی کیا ضرورت ہے کمرہ کھولو اور لے جاؤ''۔ہلال احمد نے دوسری طرف منہ کر کے کہا۔

''میرے پاس چابی بھی نہیں ہے اور دھماکے کی وجہ سے کئی لوگوں کی ایمرجنسی

ڈیوٹی لگادی گئی ہے۔ پتہ نہیں کون کہاں ہے۔ کب آئے۔ سٹور کیپر بھی نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں ۔۔۔۔ ورنہ اگر تمہارے پاس چابی ہوتی تو تم اندر آکر کمبل ہی نہیں بلکہ میری کھال تک اتار کر لے جاتے

تم لوگوں کو من مانی سے کون روک سکتا ہے۔"

"ضروری نہیں سب ایک سے ہوں ۔۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو میں تمہیں گولی مار دیتا۔ اور تالا توڑ کر کمبل لے لیتا۔۔۔ جہاں دو پڑیں تھیں ۔۔۔۔ وہاں تین ہو جاتیں۔ کسی کے بھاگ جانے کا ڈر نہ رہتا۔۔۔ مگر۔۔۔۔" کشن لال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تو کر ڈالو اپنا ارمان پورا۔۔۔۔ ویسے بھی ہماری کوئی سنے گا نہ تم سے کوئی باز پرس کرے گا۔۔۔ تم ہی دیر لگا رہے ہو۔ تمہارا کوئی ساتھی ہوتا تو کب کا یہ سب کر چکا ہوتا۔" ہلال احمد اُس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم لوگ خود کو ہمیشہ سے الگ کیوں سمجھتے رہے ہو اور۔۔۔ اب۔"

"ہم الگ سمجھتے رہے یا تم لوگوں نے ہمیں اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔ پچاس سال ہو گئے ملک کو آزاد ہوئے۔۔۔ ایک پل تھا جو جوڑ سکتا تھا ہم لوگوں کو تم سے۔۔۔ ایک۔۔۔۔ ایک مثال دیتا ہوں۔۔۔۔ تعمیر ہوا کیا۔۔ ہوا۔۔۔ بتاؤ۔"

"ہے تو راستہ۔۔۔ ہوائی بھی ہے۔"

اوسط طبقے کے انسان کو کیا یہ لوازمات میسر ہیں؟۔۔۔ اور سڑک کا حال کیا تم نہیں جانتے۔ تم بھی تو وہیں سے آئے ہو۔" ہلال احمد کے چہرے پر سوالیہ تاثرات میں بے چارگی شامل تھی۔

"کہتے ہیں اس کے لیے بے شمار اثاثہ چاہیے۔۔۔ پل۔۔۔ تو میرے گاؤں بھی ہر برسات میں بہہ جاتا ہے۔۔۔ اور پھر لوگ کیسے۔۔۔" کشن لال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بے شمار اثاثہ۔۔۔ مہاتما گاندھی پل بھی تو بہت طویل ہے۔۔۔ بنایا گیانا
۔۔۔۔ ہمیں نہیں چاہیے کیا راستہ۔۔ سڑکیں۔۔۔ لمبی لمبی ریولے لائن۔۔۔ یہاں کے
اکثر لوگوں نے۔۔۔ جانتے ہو ریل کی شکل صرف فلموں میں دیکھی ہے۔۔''

''اُس پار ہے تو سہی ریل۔۔۔ سارے علاقے میں۔۔۔''

''اُس پار۔۔۔ اس پار کیا تمام دوسرے پہاڑی علاقوں میں ہر ایک سہولت ہے
۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ تنگ نظر لوگ۔۔ مذہب کی بنیاد پر یہ سوتیلا سلوک کرتے ہیں۔''

''یہ بات تم جتنی آسان سمجھتے ہو۔۔۔ اتنی ہی مشکل ہے۔۔۔ کچھ جغرافیائی، کچھ
معدنیاتی نکتے ہیں۔ یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔۔۔۔''

''کیوں کیا تمہیں جدید ٹیکنالوجی میسر نہیں۔ کسی کے دل میں ہمارے لیے درد تو
ہو۔ خیر یہ تو میں ایک مثال دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بات آسان نہ ہو مگر اور بھی ایسی کئی
باتیں ہیں۔ اصل میں سب کو جھیلیں اور پہاڑ چاہئیں۔ بھلے ہی زمین خون سے سرخ ہو
جائے، اس پر اُدھر والے بھی اپنا آسمان چاہتے ہیں۔ ادھر والے بھی۔''

''یہ بات تم اپنے لیڈروں سے کیوں نہیں کہتے۔'' کشن لال کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''رہبر ہوتا تو ہم اس طرح کیوں بھٹکتے۔ جن پر تکیہ تھا، اعتماد شکن ہوئے۔ اپنی
نسلیں محفوظ کرنے کی فکر میں رہے۔ ورنہ ہماری نسل کے لوگوں میں ادھر والوں کے لیے کوئی
ایسا نرم گوشہ تھا نہ خواہش تعلق۔ ہم تو نارملی جینا چاہتے تھے۔ مگر۔''

''لیڈر ہمارے بھی ایسے ہی ہیں۔۔۔ اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' کشن لال
نے آہستہ سے کہا۔

''اگر پہلے پہل تم لوگوں کی طرف سے کوئی مخلصانہ برتاؤ حاصل ہوتا تو نوبت
یہاں تک نہ پہنچتی۔ چن چن کر قصور وار ہی پکڑے جاتے تو عام لوگوں کا ساتھ بھی میسّر ہوتا
کہ خود ہر امن پسند انسان ان حالات سے پریشان تھا۔۔۔ ہم تو دونوں طرف پس گئے۔ نہ
پائے رفتن نہ جائے ماندن۔۔ بہت سوں نے محض اپنی حفاظت کے لیے غلط رستہ چنا۔ اور

بہتوں کوتو یہ تک یقین ہو گیا کہ دراصل جو گمراہ ہوئے تھے وہی صحیح تھے۔ اور جو متاثر ہوئے وہ ۔۔۔۔ والدین ۔۔۔ ماں باپ ۔۔۔ کیریئر ۔۔۔ ماں ۔۔ اپنی ماں چھوڑ کر ۔۔۔'' ہلال احمد کی آواز بھر آ گئی۔ اس نے سلاخوں کو زور سے بھینچ کر ان پر سر ٹکا دیا۔

''مگر پھر بھی یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا ۔۔۔'' کشن لال نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اس لیے ۔۔۔ کہ تم لوگ ان کے ہتھیار پکڑ کر انہی کو بیچ دیتے ہو۔ جو نہ خرید سکے وہ مارا جاتا ہے ۔۔۔ ورنہ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔''

''تم کیسے جانتے ہو یہ سب ۔۔۔ میں نے بھی کچھ ایسا سنا تھا کہ کہیں کہیں شاید ۔۔۔'' ہر وہ شخص جانتا ہے جو خود کو تم لوگوں سے واپس خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔'' ہلال احمد نے منہ دوسری طرف موڑ کر کہا۔

''تمہارے شناختی کارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ پڑھے لکھے ہو۔'' کشن لال اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم بھی تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو۔'' ہلال احمد لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کچھ دھیمی آواز میں بولا۔

''ہاں۔ بی۔ ایس۔ سی''۔

''سائنس گریجویٹ؟ اور یہ نوکری'' ہلال احمد حیرت سے بولا۔

''یہ بھی ساری حیثیت داؤ پر لگا کر حاصل ہوئی۔''

''یعنی مال کے بدلے جان کا خطرہ مول لیا۔''

''ہاں ۔۔۔ ایسا بھی سمجھا جا سکتا ہے۔''

''کیا یہ باتیں اوپر نہیں پہنچتیں؟'' ہلال احمد نے نرمی سے پوچھا۔

''نہیں ۔۔۔۔۔ بلکہ آتی ہے اور پر سے ہیں ۔۔۔ ایک ایک زینہ طے کرتی ہوئیں۔'' کشن لال نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ہلال احمد کے زخمی لبوں پر ایک مجروح سی مسکراہٹ

پھیل گئی۔ وہ کمرے کی دیوار تک جانے لگا تو اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا، نہ لاشیں، نہ کمبل۔

مگر کچھ قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی نظروں کو تاریکی میں دیکھنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ جب وہ کمبل اُٹھا کر سلاخوں کے پاس لایا تو کشن لال سگریٹ کے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

''کہتے ہیں کہ حالات بہتر ہو رہے ہیں۔۔۔۔تم سگریٹ پیتے ہو۔۔۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔۔۔۔شاید ہو جائیں حالات بہتر۔ یہ تو اوپر والا ہی جان سکتا ہے۔''

مٹی

ڈاکٹر گلزار احمد وانی

ترنم ریاض فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ جس کے بغیر اردو فکشن نامکمل ہے۔ ترنم ریاض ایک جنیوین اور ذہین فن کار ہیں۔ جن کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف برصغیر کے بڑے بڑے ناقدینِ ادب نے کیا ہے۔ وہ ایک شاعرہ اور فکشن نگار کے بطور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی صلاحیتوں کی افسانہ نگار ہیں۔ افسانے پر ان کو گہری دسترس حاصل ہے۔ تکنیکی اور موضوعی اعتبار سے ان کے افسانے اعلیٰ پایہ کے افسانوں میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

ترنم ریاض کی زندگی کا بیشتر حصہ ریاست سے باہر ہی بیت چکا ہے۔ مگر وہ اپنی ریاست کی محبت کو کم کر نہ سکی اس کا ثبوت اس کے وہ افسانے فراہم کر رہے ہیں۔ جو انہوں نے اپنی مٹی اور اپنے وطن سے متعلق تحریر کئے ہیں۔ وہ برابر اور تواتر کے ساتھ اپنی ریاست کے بارے میں افسانے تخلیق کرتی رہی اور یہاں کی زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ مسائل کو بھی اُجاگر کرتی رہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ترنم ریاض تانیثیت کے مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ مگر ان کے بیشتر افسانے اس نوعیت سے باہر بھی دکھائی دیتے ہیں جن میں عالمی مسائل بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بشری کشمکش اور سماجی و معاشرتی زندگی کے گوناگوں مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ترنم ریاض کا افسانہ ''مٹی'' ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' افسانوی مجموعے میں شامل ہے۔ اور اس سے قبل یہ ماہنامہ ''نیا سفر'' اِلٰہ آباد میں ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ موضوعی اعتبار سے بھی یہ اسی مٹی سے منسلک افسانہ پایا جاتا ہے۔ ''مٹی'' ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں قاری کشمیر کی سرزمین کو جگہ جگہ لاشوں اور انسانوں کے لہو سے لال دیکھتا ہے اور ہر طرف ایک خرابہ دُور دُور تک نظر آرہا ہے۔ اس میں دو کردار ''کشن لال'' اور ''ہلال احمد'' مرکزی نوعیت کے حامل ہیں۔ ہلال احمد ایک ایسا کردار ہے، جس کے چہرے کی جھریوں پے لمحہ بہ لمحہ بے چارگی کے تاثرات نمایاں ہیں۔

افسانے میں موسموں کا ذکر بھی کئی جگہوں پر موجود ہے جس میں یہاں کی شدید ٹھنڈی بھی شامل ہے۔ مذکورہ افسانے کا موضوع بھی کشمیر اور یہاں کے خراب حالات رہے ہیں۔ یہاں کے بڑے بڑے میدان قبرستانوں کا روپ اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے گردو پیش کا ماحول اس طرح پیش کیا گیا ہے گویا ''مٹی'' افسانے کے کردار اور ان سے متعلق واقعات افسانہ نگار نے بنفسِ نفیس دیکھے ہیں۔

ہلال احمد اپنے دوست کشن لال کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ یہاں کے لوگ دونوں طرف سے پس رہے ہیں۔ عام لوگوں کا جینا دوبھر ہوا ہے۔ گھر سے نکلنے میں ایک وحشت اور ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ افسانے میں کہیں کہیں پر کشن لال ترقی کی باتیں کرنے لگتا ہے اور ہلال اپنے گاؤں کی داستان بیان کرنے لگتا ہے۔ جہاں کا پُل بھری برسات میں بہہ گیا ہے اور لوگوں کو چلنے پھرنے میں دشواریوں کا سامنا ہے۔ وہ کہتا ہے سارے ہندوستان میں اتنے شاندار پُل بنائے جاتے ہیں مگر یہاں؟ ۔کشن لال ہلال احمد کو یہ سمجھاتا ہے کہ تم لوگ کیوں اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہو، اس کے جواب میں ہلال احمد یہ بول اُٹھتا ہے۔

''ہم الگ سمجھتے رہے یا تم لوگوں نے ہمیں اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔

پچاس سال ہو گئے ملک کو آزاد ہوئے۔ ایک پل تھا جو جوڑ سکتا تھا ہم لوگوں کو تم سے۔۔۔۔۔ایک۔۔۔۔ایک۔

مثال دیتا ہوں۔۔۔۔تعمیر ہوا کیا۔۔۔۔ہوا۔۔۔۔بتاؤ۔''

''مٹی'' افسانہ دونوں کرداروں کے سوال و جواب کی کڑیاں لے کر معروضی وجود میں آیا اور اپنے اختتام کی اور بڑھتا گیا۔ جس میں کشن لال، ہلال احمد کی فکری رنجش سے اتفاق کرتا ہے نہ ہلال احمد ہی کشن لال کی باتوں پہ یقین کرتا ہے۔ یہی ایک کشمکش سارے لوگوں کی بظاہر دکھائی دیتی ہے۔ اور اسی کشمکش میں کشن لال اور ہلال جیسے کئی اور لوگ بھی رہ رہے ہیں۔

تکنیکی اور فنی لحاظ سے ''مٹی'' افسانہ ایک مکمل افسانہ ہے۔ اور فکری لحاظ سے بھی اس کے اثرات ایک قاری پر افسانہ کی قرأت کے بعد بھی اس کے ذہن و دل پر تادیر قائم رہتے ہیں۔

مذکورہ افسانے میں بہت حد تک کشمیر کے حالاتوں کا ہی ذکر ملتا ہے۔ جس میں یہاں کے نوجوانوں کی بے وجہ پکڑ دھکڑ، بے قصوروں کے ذمہ قصور ٹھہرانا اور اپنی ماؤں کا وہ صبر جس کا پیمانہ اُن کے لختِ جگروں کے انتظار میں لبریز ہو چکا ہے۔ اور اس کے علاوہ جو درد و کرب یہاں کے عوام کو جھیلنا پڑا اُسے بڑی فنی چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے۔ جس سے پوری طرح یہاں کے حالات کی عکاسی ہو رہی ہے۔ افسانہ نگاری نے کئی دیگر مسائل کی طرف بھی قاری کا دھیان پھیرتے ہوئے افسانے کا رُخ موڑا ہے۔ جس میں ہلال احمد بے روزگاری کی وبا کا بھی ذکر اپنے دوست کشن لال سے چھیڑتا ہے۔ کہ یہاں کتنے ایسے پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو بے روزگاری کی آڑ میں یا تو اپنی زندگی سے مایوس ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا ہے۔ کشمیر ایک ایسی سرزمین ہے جہاں کے باشندے شناختی کارڈ اپنے ساتھ لانے میں اگر بھول چوک نادانستہ طور پر کر جاتے ہیں تو ذہین و دل میں خطرات کی گھنٹیاں راہ چلتے ہوئے بجنے لگتی ہیں۔

مجموعی طور پر ''مٹی'' افسانے میں حالات کے ساتھ ساتھ یہاں کے گونا گوں مسائل کی طرف بھی بحث و تمحیص موجود ہے جن کے ازالے کے لیے سرکار کو کوئی ایسا لائحہ عمل عملانا پڑ سکتا ہے جس سے عوام میں اسطرح کی سرد مہری باقی نہ رہے اور ترقی کی راہیں مزید روشن ہو سکیں۔

☆☆☆
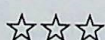
تعبیر

اس کے کانوں میں دور کسی مندر سے آتی ہوئی آرتی کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ کچھ قدم کے فاصلے پر پیر بابا کا آستانہ تھا۔ وہ چلتی جا رہی تھی ۔ سڑک پار کرنے لگی تو اس نے اپنی پڑوسن کو جاتے دیکھا۔ وہ سر پر اسکارف باندھے ہاتھوں میں ایک ریشمی رومال میں موم بتیاں لپیٹے چرچ جا رہی تھی ۔ اس کے مضطرب قلب کے بالکل قریب سے ایک لمحے کے لیے سکون کی لہر سی دوڑ گئی۔ تیز تیز پڑتے ہوئے بے تکے قدم ایک رفتار سی پکڑنے لگے۔ اور دھیرے دھیرے اطمینان سے چلنے لگی۔

ایک خواب دیکھا تھا اس نے ،مگر وہ خواب اس کا نہ تھا۔ اس میں کتنے نرم نازک ریشمی تار تھے جنھوں نے اس کے تخیل کی تخلیق کو سہارا دیا تھا۔ اس کی ذاتی غرض تو نہ تھی ۔تو پھر اتنی آندھیاں اتنے طوفاں کیوں اُٹھ رہے ہیں ۔کبھی کبھی تو وہ اتنی اکیلی پڑ جاتی کہ خدا کے وجود پر اس کا اعتقاد کمزور پڑنے لگتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ابھی اوپر کوئی طاقت ہے۔ ضرور ہے۔ جبھی تو اس کی پڑوسن شمعیں لیے گرجا گھر جا رہی تھی ۔ جبھی تو دور سے آتی ہوئی آرتی کی مدھر آواز میں کتنی ہی آوازیں مل کر نغمہ سرا تھیں۔

جبھی تو پیر بابا کے مزار سے اُٹھتے ہوئے لوبان کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور ساری فضا اس ذات پاک کی عظمت کا اعتراف کر رہی تھی۔

کبھی کبھی نعمت بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ قدرت نے اسے بنانے میں فن کا بھر

پور مظاہرہ کیا تھا۔اس کا دل اس سے بھی زیادہ حسین تھا۔اس کی روح اس کے نکھرے ہوئے سپید رنگ سے بھی پاکیزہ تھی۔ انسان اور انسانیت سے اسے اپنے وجود سے بھی زیادہ محبت تھی۔ جبھی تو اس نے یہ راستہ چنا تھا۔اتنی بڑی تعلمی سند تھی اس کے پاس اور اس نے۔۔۔۔ ایک معلّمہ کی نوکری کرنا پسند کی دور افتادہ گاؤں میں۔

جب اسے محکمہ تعلیم سے نوکری کا آرڈر ملا تو وہ کتنا خوش ہوئی تھی۔ پہلی بس پکڑ کر وہ جوائن کرنے کے لیے روانہ ہوگئی۔شہر میں پلی یہ معصوم سی لڑکی جب بس میں بیٹھی تو آس پاس کے عجیب وغریب حلیے کے دیہاتیوں کو دیکھ کر اسے ذرا بھی عجیب نہ لگا۔ساری بس میں ان کے مشقت بھرے پسینے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔کوئی بھی نہ تھا اس سے ملتے جلتے حلیے والا۔ مگر اسے تو یہ پسند تھا۔ یہ میلے کچیلے بچے، جو اپنے محنت کش والدین کے ہمراہ شاید کسی تہورا کے لیے خریداری کر کے گھر لوٹ رہے تھے۔ یہ ہی تو بسے تھے اس کے خوابوں میں۔اس کے دوپٹے کے جھالروں کے ریشمی تانے بانے بن کر اس کے وجود سے لپٹے تھے۔ یہ ہی تو تھے وہ ناتراشیدہ، ہیرے جنہیں وہ سنوارے گی نکھارے گی۔اُنہیں زیور تعلیم سے آراستہ کر کے اُن میں نگینوں کی طرح جڑے گی۔

بس سے اترتے ہی تازہ ہواوں کے جھونکھوں نے اس کی ذہن کو معطر کر دیا۔اور پھر نئی ٹیچر کا اس چھوٹے سے اسکول میں محبت بھرا استقبال ہوا۔اسکول کے بالکل سامنے سے ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔اس کے کناروں پر خودرو جنگلی پھولوں کی قطاریں اُگ آئی تھیں۔رنگ برنگِ پھول۔ندی کے شفاف پانی میں سے کئی مختلف رنگوں اور جسامت کے پتھر ایسے اپنی اپنی جگہوں پر بچھے تھے جیسے کسی نے اپنے ہاتھوں سے سجایا ہو۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ ندی نہ ہو کوئی ہار ہو جس کے بیچ میں کسی ماہر جوہری نے ہیرے جڑے ہوں اور کناروں پر پھولوں کی کیاریاں منقش کی ہوں۔

ننھے ہاتھوں نے اپنی نئی ٹیچر کو اپنے اپنے حصے کے پھول پیش کیے تو وہ جھوم اُٹھی۔ ہر چہرے پر خوش آمدید لکھا تھا۔

یہ سچ مچ کا استقبال تھا۔ بے لوث سادہ اور معصوم۔ اس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ ان سب کو ایک ساتھ اپنی باہوں میں لے لے۔ اسے لگا جیسے تصویروں والی ماں سرسوتی کی طرح اس کی کئی باہیں نکل آئی ہوں اور وہ ان سب بچوں کو باہوں میں لئے ناچ رہی ہو، پھولوں کے فرش پر اور آسمان سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔

کچھ ہی مہینوں میں وہ چھا گئی سارے گاؤں پر۔ اس نے انہیں انسانوں کی طرح جینا سکھایا۔ سکول میں کتنے بچوں کا اضافہ ہوا۔ بڑوں کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی تعریف ضلع کی افسرِ تعلیم تک پہنچ گئی۔ اور کچھ دن بعد ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر سکول کا معائنہ کرنے آئیں۔ عمر کوئی ۵۰ ربرس کے قریب۔ بھاری بھرکم ڈیل ڈول۔ شادی نہیں کی تھی انہوں نے کہتے ہیں انہیں کوئی پسند نہیں آیا۔ یا شاید۔۔۔۔ سانولی رنگت، چپٹی ناک، چہرے پر زبردستی کھرچے ہوئے مہاسوں کے کئی نشان۔ جیپ سے اترتے ہی وہ خوش ہو گئیں۔ سکول، نقشوں اور چارٹوں سے سجا ہوا تھا۔ صاف ستھرے کچے صحن پر پانی چھڑکنے سے فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ ''ڈی۔ ای۔ او'' (D.E.O.) صاحبہ اپنی طرف سے سرپرائز وِزٹ دینے صبح صبح نمودار ہوئی تھیں۔ وہ خوب سمجھتی تھیں اس طرح کی سجاوٹ اور ٹائم ٹیبل۔ لیکن ٹائم ٹیبل کے مطابق بچے سچ مچ ریاضی سیکھ رہے تھے۔

انہوں نے جب اسے دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ سفید گلاب سی معصوم تر و تازہ ، نہایت متناسب جسم۔ آنکھوں میں خود اعتمادی کی جھلک، اسکی نظر دروازے پر پڑی تو انہیں اپنے سامنے دیکھ کر اس نے ادب سے سلام کیا۔ مگر وہ جانے کیوں بگڑ گئیں اور اسے ڈانٹ دیا کہ اسے آنے والوں کی خبر ہی نہیں رہتی۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دی تو انہوں نے اسے بدتمیزی سے ہنسنے سے تعبیر کیا اور نہایت بے ہودگی سے اسے ڈانٹتی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔

کچھ دنوں کے بعد اس کے ہاتھ میں اس کی تبدیلی کا پروانہ تھا۔ اسے ایک دور دراز سرحدی علاقے میں بھیج دیا گیا تھا۔

جہاں موسم سرما میں مہینوں کے لئے راستے بند ہو جایا کرتے ہیں اور راشن تک

کبھی کبھی ملٹری ہیلی کوپٹر کے ذریعے بھیجوایا جاتا ہے وہاں آبادی بھی بہت کم تھی اور یہ سکول بھی اکلوتا۔ پرائمیر سکول تھا۔ جہاں اسے بحثیت سنگل ٹیچر جانا تھا۔

اس گاؤں کے بچوں سے کتنی محبت ہوگئی تھی اسے۔ یہ بچے بھی کتنے مانوس ہو گئے تھے اس سے، اس کے گھر والے اس تبدیلی کی خبر سن کر تقریباً رو ہی پڑے۔ اس نے ہفتے بھر کی چھٹی کے لئے درخواست لکھی اور ڈی۔ ای۔ او آفس پہنچ گئی۔ اسے تبدیلی منسوخ کرانے کی بات کرنی تھی۔ ڈی۔ ای۔ او صاحبہ نے یہ کہہ کر ڈسٹرکٹ ٹرانسفر ہے اور ان کی پہنچ میں نہیں ہے بات ٹال دی۔ اس نے سوچا تھا کہ عورت ہونے کے ناطے وہ اس کی پریشانی سمجھیں گی۔ لیکن بات بالکل الٹی ہی ہوگئی۔ وہ سیدھا ڈائریکٹر کے دفتر پہنچی۔ وہاں تو پی۔ اے صاحب تک سے اپائٹمنٹ لینا ہوتی ہے ڈائریکٹر صاحب کی تو بات ہی نہیں۔ دفتر میں ایک نورانی چہرے والے ادھیڑ عمر کے سیکشن آفیسر تھے۔ انہوں نے اس کو بڑی اپنائیت اور ہمدردی سے سب کچھ سمجھایا۔ اور مطلوبہ ٹیلی فون نمبر وغیرہ بتلائے۔ اس نے بتلائے ہوئے نمبروں پر پی۔ اے صاحب سے ملاقات طے کی مگر وہ نہیں ملے۔ پسینہ بہاتی ہوئی، دھول میں اٹی وہ پھر سیکشن آفیسر کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اسے ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ اور آرام سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور خود فون پر اپائٹمنٹ طے کر کے اسے وقت بتا دیا۔ کتنا خوش ہوئی تھی وہ ان کے سلوک سے۔ کوئی کوئی انسان کتنا نیک ہوتا ہے۔ خیر دوسرے دن جب وہ پی۔ اے سے ملی تو نا امید ہوتے ہوتے رہی۔ پتہ چلا کہ ڈائریکٹر صاحب تو منسٹر صاحب سے بھی زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ پی۔ اے صاحب کئی دن تک ٹالتے رہے کہ صاحب دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ یہ دورے کہاں ہوتے ہیں اس بات کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے آخر یہ دورے اچانک دورے جو ہوتے ہیں۔ جن سے استادوں کی لاپرواہیوں کو کاغذوں کے ذریعے پریشانیوں کے پروانے دیے جاتے ہیں اور کچھ تو ان پروانوں کی مانگوں کو پورا کر کے خود کو پریشانیوں سے آزاد کروالیتے ہیں۔ اور کچھ قسمت کے ماروے برسوں دھکے کھاتے رہتے ہیں۔ پھر کبھی، کہیں، کسی دن، کوئی بندۂ خدا کسی کرسی پر آن بیٹھتا ہے تو اُن

قسمت کے ماروں کی شنوائی ہوتی ہے جو محض اپنی کم بخت اور کم وزن جیبوں کی بوسیدگی کی بنا پرنا کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہوتے ہیں۔ اُس نے سوچا۔

بہر حال ڈائریکٹر صاحب سے خدا خدا کر کے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنے پی۔اے سے کہا کہ وہ اس سے عرضی لے لیں اور اس پر بھر پور کاروائی کی جائے گی۔اس نے عرضی دے دی۔ پھر انتظار۔لیکن کوئی خط، کوئی فون، کوئی بلاوا نہ آیا۔ وہ پھر پی۔اے صاحب کے پاس پہنچی۔غصّہ آرہا تھا اسے۔کہنے لگے کہ ہم نے بھیج دی ہے آپ کی درخواست آگے۔آپ ملتی رہیے۔معلوم کرتی رہیے۔ملتی رہوں معلوم کرتی رہوں، وہ سوچنے لگی۔اور میرا اسکول میرے طلبہ۔ساری کیجول لیوز ختم ہونے کو آرہی ہیں۔ یہ سوچ کر اسے اور غصّہ آگیا۔لہجے کی تلخی پر قابو رکھتے ہوئے وہ بولی کہ قانوناً تو تین سال سے پہلے تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔میں اپنے حق کے لیے لڑوں گی چاہے مجھے منسٹر تک جانا پڑے۔ پی۔اے صاحب ذرا مسکرا کر دھیمی سی آواز میں بولے۔ کچھ حق ہماری طرف بھی ہے آپ کا۔اس نے ان کا اشارہ سمجھ لیا۔غصّے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا

لیکن خود کو بدستور قابو میں رکھے ہوئے وہ بے وقوفوں کی طرح بولی۔شکریہ، شکریہ بہت بہت شکریہ جیسے سمجھی ہی نہ ہو یا یہ سمجھی ہو کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے محکمے کا بھی قرض ہے کہ اپنے معلموں کی پریشانیوں کے حل تلاش کرنا۔لیکن پی۔اے صاحب بھی پرلے درجے کے گھاگ اور مکار تھے۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا انہوں نے۔سمجھ گئے کہ اسے ناگوار گزر رہا ہے۔اپنی آواز کو ویسے ہی دبائے ہوئے دھیمی سرگوشیوں میں بولے کہ ہم تو تنخواہ ہی اس بات کی لیتے ہیں کہ اپنے معلموں کی سہولیات کا خیال رکھیں اور اس کے بعد دانت نکال کر ہنسے۔ وہ دوبارہ ان کا شکریہ ادا کرنے والی تھی کہ ایک لڑکی داخل ہوئی، درمیانہ قد، عام سی، قبول صورت مگر نہایت ماڈرن لباس سے آراستہ۔اس نے آتے ہی اپنی معطر زلفوں کو لہرایا اور ایک ادا سے پی۔اے صاحب کو سلام کرتی ہوئی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔اس نے گردن کو کچھ اس طرح خم دیا کہ بالوں کی لٹیں اس کے آدھے ماتھے

پر بکھر گئیں، پھر فلمی اداکاراؤں کی طرح ہونٹ بھینچ کر مسکراتے ہوئے پی۔اے صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولی کہ اس کی کل والی ٹرانسفر کی عرضی کا کیا ہوا۔

پی۔اے صاحب اس کے ڈیپ کٹ (DEEP CUT) گریبان پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔''تھا تو ام میچور مگر ہم نے کروالیا کام۔ یہ رہا آرڈر'' وہ کچھ اور کہنے والے تھے کہ لڑکی نے جلدی سے ان کئے ہاتھ سے آرڈر کاپی لی اور شکریہ بھی ادا نہ کیا۔

اور لڑکی یہ جا وہ جا۔

پی۔اے صاحب کھسیانے سے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ بھی اس تماشے کو مبوہت دیکھتی رہی۔ اور پھر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔ وہ سیکشن آفیسر کے کمرے کے راستے پر ہولی۔ جانے کیسے کیسے خیال آرہے تھے اسے۔ وہ اپنے لمبے خوبصورت بال بکھیرے پی۔اے صاحب کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے اور وہ اپنے تمبا کو والے پان کے عادی پیلے پیلے، بڑے بڑے دانت نکالے ہنس رہے ہیں۔اس کے ہاتھ میں اس کی تبدیلی کے منسوخ ہونے کا آرڈر ہے اور انہوں نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ رکھا ہے۔ مارے گھبراہٹ کے اسے پسینہ آ گیا۔تصور ٹوٹ گیا شکر ہے۔اسے ابکائیاں سی آنے لگیں۔اس نے خود کو سیکشن آفیسر کے کمرے میں پایا۔لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔وہ اپنے سفید داڑھی والے چہرے پر دنیا بھر کا نور لیے اکیلے اپنے کام میں مگن تھے انہوں نے اسے دیکھ کر نہایت نرمی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود اُٹھ کر اسے پانی کا گلاس دیا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا برا حال تھا۔اس کا جی چاہا کہ سارا ماجرا ان سے کہہ دے مگر۔۔۔۔اتنا بولی کہ جانے کب میری مشکل حل ہوگی۔انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے کہہ رہے ہوں کہ جلد ہی تمہارا کام ہو جائے گا۔دنیا میں سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ان کا تشفی بھرا ہاتھ سر پر محسوس کر کے اس کی آنکھیں چھلک پڑی اور وہ سسک کر رو پڑی۔ وہ اس کا سر سہلاتے رہے۔ پھر اس کے شانے، پھر کمر۔۔۔۔اور وہ اچانک چونک پڑی۔اس نے جلدی سے ان کا سانپ کی طرح رینگتا ہوا ہاتھ جھٹک دیا اور یکلخت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ جیسے ہزاروں اژدے پھن پھیلائے چاروں طرف سے اسے گھیر رہے ہوں اور اسے کوئی راہ نہ سجھائی دے رہی ہو۔ کب کس طرف سے کون اسے آڑ سے کیا خبر۔ اس لیے وہ بھاگتی رہی۔ جب تھک کر چور ہوگئی تو اس کی رفتار ذرا کم ہوئی۔ اس کے ہوش وحواس کچھ اعتدال پر آنے لگے۔ اس نے خود کو گھر جانے والی سڑک پر پایا۔ جہاں قریب ہی ایک پارک تھی۔ وہ پارک میں داخل ہوئی۔ پتھر کی ایک بینچ پر بیٹھ کر اس نے پرس میں سے قلم اور کاغذ نکالے اور استعفےٰ لکھا۔ ابھی جا کر ان کے منھ پر دے مارے گی۔ اس ارادے سے جانے کیا بڑبڑاتی ہوئی وہ اٹھی۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائے دل ہی دل میں جانے کیا سوچتی رہی۔ منظر دھندلا سا رہا تھا۔ آنکھوں سے موتی کا ایک ٹکڑا سا استعفےٰ پر گرا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پارک سے باہر آ گئی۔ سورج کب ڈوبا اسے کچھ خبر نہ تھی۔ شام اترنے ہی والی تھی۔ سامنے سے اس کی پڑوسن ہاتھ میں شمعیں لیے آ رہی تھی۔ دور کسی مندر سے آرتی کی مدھر آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے اس پار پیر بابا کی درگاہ سے اُٹھتی ہوئی لوبان کی خوشبو سے فضا میں ایک مقدس سا سکون تھا۔

آہستہ آہستہ وہ بھی اس پرسکون ماحول کی ایک شے بن گئی، دل سے رنج اور غصّے کا تاثر جانے کب غائب سا ہوگیا۔ اس میں ہمت آ گئی۔ وہ بزدلوں کی طرح میدان نہیں چھوڑے گی چاہے کتنا بھی وقت لگے۔ وہ لڑے گی۔ اپنی پاکیزگی کو ڈھال بنا کر وہ اپنی جنگ خود لڑے گی۔ قدرت اُسے ضرور کامیابی سے نوازے گی اس نے استعفےٰ پھاڑ دیا اور واپس پارک میں داخل ہوئی پتھر کے بینچ پر بیٹھ کر اس نے ایک اطمینان بھری لمبی سانس لی۔ اور بغیر تنخواہ کے لانگ لیو کی عرضی لکھنے لگی۔

تعبیر

ایس معشوق احمد

ترنم ریاض اردو فکشن کی نمایاں فنکار ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار فکشن میں نہیں کیا بلکہ شاعری اور تنقید کے میدانوں میں بھی قبولیت اور شہرت پائی۔ان کے جرات مند قلم نے نت نئے افسانے تراشے جن کے حسن و قبح کو دیکھ کر قارئین کا وسیع حلقہ متاثر ہوا۔اس متنوع خوبیوں کی مالک فکشن نگار کو ناقدین اور قارئین نے کبھی فراموش نہیں کیا کیونکہ انہوں نے ہم تو ڈوبے ہیں صنم، یہ تنگ زمین، یمبرزل، میرا کے شیام، پورٹریٹ، ٹیڈی بیئر، بالکنی، شہر، تجربہ گاہ قبیل کے افسانے لکھ کر اردو ادب میں اپنا ایک خاص اور منفرد مقام بنایا ہے۔اپنے قوت مشاہدہ سے انہوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانے جو ادبی تاریخ میں نظر انداز نہیں کئے جاسکتے میں ''تعبیر'' بھی شامل ہے۔تعبیر ان کے افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین'' میں شامل ہے جو 1998ء میں منظر عام پر آیا۔عنوان تعبیر کو دیکھ کر احمد فراز کا شعر یاد آیا کہ۔۔

میں نے دیکھا ہے بہاروں کو چمن میں جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

اس افسانے میں چمن کا جلنا تو نہیں دکھایا گیا البتہ یہ ایک لڑکی کی کہانی ہے جس کے خوابوں، ارمانوں، تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔

عورت کو مہد سے لحد تک مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو تعلیم حاصل کرنے میں اسے رکاوٹوں کا سامنا رہتا ہے اور حصول تعلیم کے بعد جب وہ ملازمت اختیار کرتی ہے تو سرکاری محکموں میں اسے ہراسگی کا سامنا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے مرد ہوں یا اعلیٰ آفیسر، کلرک ہو یا کوئی اور پدرانہ نظام پر قائم سماج میں اسے دشواریوں کا سامنا رہتا ہے۔ افسانہ تعبیر شہر میں پلی ایک معصوم لڑکی کی کہانی ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حسین اور نہایت پاکیزہ ہے۔ جس کو اپنے وجود سے زیادہ انسان اور انسانیت سے محبت تھی۔ جب اسے سرکاری نوکری ملتی ہے تو وہ بحیثیت معلّمہ ورافتاد گاؤں میں تعینات ہونے پر از حد خوش ہوتی ہے۔ وہ پہلی بس پکڑ کر جواین کرنے کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ شہر میں پرورش پانے کے باوجود اسے بس میں گاؤں کے میلے کچیلے بچے جو اپنے محنت کش والدین کے ہمراہ کسی تہوار کے لیے خریداری کر کے گھر واپس لوٹ رہے تھے پسند آئے۔ اس کا خواب تھا کہ وہ ان بچوں کو ہیرے کی طرح سنوارے گی اور انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے گی۔ بس سے اتر کر نئی ٹیچر کا چھوٹے سے اسکول میں محبت بھرا استقبال کیا گیا۔ ننھے ہاتھوں نے اپنی نئی ٹیچر کو اپنے حصے کے پھول پیش کئے۔ وہ بہت خوش تھی کیونکہ یہ سچ مچ کا استقبال تھا بے لوث، سادہ اور معصوم۔ کچھ ہی ماہ میں وہ سارے گاؤں میں مقبول ہوئی کیونکہ اس نے گاؤں والوں کو جینا سکھایا تھا۔ اسکول میں کافی تعداد میں بچوں کا اضافہ ہوا اور بڑے بزرگوں میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

ایک دن ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر اسکول کا معائینہ کرنے آئی جو عمر سے تقریباً پچاس برس کی تھیں۔ جیپ سے اترتے ہی وہ نہایت خوش ہوئیں کیونکہ اسکول نقشوں اور چارٹوں سے سجا ہوا تھا۔ ڈی ای او صاحبہ سر پرائز وزٹ دینے صبح صبح نمودار ہوگئی تھیں۔ وہ کلاس دے رہی تھی۔ جانے کیا ہوا کہ ڈی ای او صاحبہ بگڑ گئیں اور اسے ڈانٹتی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے ہاتھ میں تبدیلی کا پروانہ تھا۔ اسے ایک دور دراز سرحدی علاقے بھیج دیا گیا تھا جہاں موسم سرما میں مہینوں راستہ بند رہتا ہے اور راشن تک

ملٹری کے ہیلی کو پٹروں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔وہ گاؤں کے بچوں سے مانوس ہوگئی تھی اور تبادلے کی خبر سن کر نہ صرف وہ بلکہ اس کے گھر والے بھی رو پڑے تھے۔اس نے ایک ہفتے کی چھٹی رکھی اور تبادلے کی منسوخی کے لیے کوشش کرنے لگی۔وہ ڈی ای او کے پاس گئی لیکن وہاں بات نہ بنی۔اس نے ڈائریکٹر سے ملنے کا ارادہ کیا اور وہ دفتر بھی پہنچی لیکن وہاں تو پی اے صاحب تک سے ملنے کے لیے اپائٹمنٹ لینی پڑتی ہے۔دفتر میں موجود ایک سیکشن آفیسر نے اس کی مدد کی اور اس کے ساتھ ہمدردی اور اپنائیت سے پیش آیا۔ٹیلی فون پر پی اے صاحب سے اس کی ملاقات طے کی۔وہ اس سلوک سے بے حد خوش ہوئی۔اس نے پی اے صاحب سے ملاقات کی لیکن بے سود کیونکہ پی اے صاحب اسے کئی روز تک ٹالتے رہے۔خدا خدا کر کے ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی اور ڈائریکٹر صاحب نے پی اے صاحب سے کہا کہ اس کی عرضی لے لیں اور بھرپور کاروائی کیجیے۔پی اے پرلے درجے کا مکار انسان تھا۔اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔اس نے ملتی رہو اور معلوم کرتی رہو کا فارمولہ اسے بتایا اور یہ بھی کہا کہ ہمارا بھی کچھ حق بنتا ہے۔وہ سارا ماجرا سمجھ گئی لیکن انجان بنی رہی۔اسی اثناء میں ایک درمیانہ قد کی قبول صورت ماڈرن لباس سے آراستہ لڑکی داخل ہوئی اور ایک ادا سے پی اے صاحب کو سلام کرتے ہوئے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔پی اے صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا کہ کل والی عرضی کا کیا ہوا۔پی اے صاحب نے جواب دیا کہ ٹرانسفر تو امیچور تھی لیکن کام کرلیا ہے یہ رہا آرڈر۔وہ یہ سب دیکھ کر تیز تیز قدموں سے وہاں سے نکل آئی اور سیکشن آفیسر کے کمرے میں پہنچ گئی۔سیکشن آفیسر سفید داڑھی والے چہرے پر دنیا بھر کا نور لیے کام میں مگن تھے۔انہوں نے اسے دیکھ کر نرمی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر اس کے لیے پانی کا گلاس لایا۔سیکشن آفیسر نے اسے تسلی دی اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔اس کی آنکھیں چھلک پڑی اور وہ سسک کر رو پڑی۔سیکشن آفیسر اس کا سر سہلاتے رہے پھر شانے اور پھر اس کا ہاتھ کمر تک پہنچا۔وہ اچانک چونک پڑی۔اس نے سیکشن آفیسر کا سانپ کی طرح رینگتا ہوا ہاتھ جھٹک دیا اور

یکلخت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔وہ پارک میں پہنچ گئی اور بینچ پر بیٹھ کر استعفیٰ لکھنے لگی۔کچھ دیر بعد اس نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائی اور ارادہ کرلیا کہ وہ بزدلوں کی طرح میدان نہیں چھوڑے گی بلکہ اپنے حق کے لیے جنگ لڑے گی۔اس نے استعفیٰ پھاڑ دیا اور لانگ لیو کی عرضی لکھنے لگی۔

تعبیر میں عورت کے ساتھ سرکاری محکموں میں کئے جانے والے خود مطلبی سلوک کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اگر لڑکی پاکیزہ اور باکردار ہو تو اسے زیادہ ہی مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔اس افسانے میں مرد کی ہوس پرستی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور مرد کے دو روپ دکھائے گئے ہیں۔ایک جو مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی تاک میں ہوتا ہے اور دوسرا جو ہمدردی اور شفقت سے پیش آتا ہے لیکن بعد میں اپنا گھناؤنا چہرہ دکھاتا ہے اور اوچھی حرکتیں کرتا ہے۔عورت کے بھی دو روپ اس افسانے میں ظاہر ہوئے ہیں۔باکردار اور پاکیزہ عورت جو پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے لیکن عزم اور ارادہ سے حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالتی بلکہ اپنے حق کے لیے لڑنے کا ارادہ رکھتی ہے۔عورت کا دوسرا روپ ماڈرن عورت کا ہے جو مرد کو اپنے اشاروں پر نچاتی ہے اور اپنے فائدہ کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے حتیٰ کہ اپنی عصمت کا سودا بھی۔

کردار نگاری کی بات کریں تو ہر کردار کے لیے ضمائر غائب کا استعمال ہوا ہے۔ افسانے میں نہ مرکزی کردار کا نام ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ہی ڈی ای او، پی اے صاحب، سیکشن آفیسر اور میانہ قد کی ماڈرن لڑکی کا نام افسانے میں آیا ہے بلکہ ہر کردار کے لیے صغیہ غائب وہ کا استعمال ہوا ہے۔البتہ کرداروں کا حلیہ بیان ہوا ہے۔ڈی ای او صاحبہ کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''عمر پچاس برس کے قریب،شادی نہیں کی تھی انہوں نے کہتے ہیں انہیں کوئی پسند نہیں آیا۔۔۔سانولی رنگت، چپٹی ناک، چہرے پر زبردستی کھرچے ہوئے مہاسوں کے نشان''۔

اس افسانے میں مخلوط کلچر کو دکھایا گیا ہے جہاں ہندو مسلم سکھ عیسائی آپس میں اکٹھے رہتے ہیں۔افسانے کی شروعات میں ہی مندر کی آرتی، پیر کے آستان اور چرچ کا ذکر آیا ہے۔

''اس کے کانوں میں دور کسی مندر سے آتی ہوئی آرتی کی آوازیں آرہی تھیں۔کچھ قدم کے فاصلے پر پیر بابا کا آستانہ تھا۔وہ چلتی جارہی تھی۔سڑک پار کرنے لگی تو اس نے پڑوسن کو جاتے ہوئے دیکھا۔وہ سر پر اسکارف باندھے ہاتھوں میں ایک ریشمی رومال میں موم بتیاں لپیٹے چرچ جارہی تھی''۔

افسانے میں نہ شاعرانہ زبان کا استعمال ہوا ہے اور نہ ہی علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کی بھرمار ہے، نہ ابہام ہے نہ ہی پیچیدگی بلکہ سہل، رواں اور آسان زبان میں نسوانی مسئلہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔افسانہ اگرچہ طویل ہے لیکن اس کا اسلوب اور زبان و بیان قاری کو آخر تک باندھ کے رکھتا ہے۔اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس کا عکس ہمارے معاشرے میں دیکھا جاسکتا ہے اور موضوع کو برتنے کا انداز، منظر نگاری، تجسس اور افسانوی فضا اس کو بہتر بناتے ہیں۔تانیثی حوالے سے یہ ایک بہترین افسانہ ہے جس میں فنی باریکیوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

کشتی

ارے ہٹو۔۔۔ ہٹو۔۔۔ ہٹو بھائی۔۔۔ ایک طرف ہو جاؤ۔

ٹیلیفون بوتھ کے پاس کھڑے کچھ لوگوں میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے باقی چار چھ لوگوں کو ہاتھوں سے ذرا ذرا سا پرے کرتے ہوئے نو وارد کے چہرے کی طرف بڑے خوش آمدانہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس کے لیے راستہ بنایا۔

نہیں نہیں۔ میں اپنی باری سے فون کرلوں گا۔ آنے والے نوجوان نے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ پلیز، ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ لوگ تو مجھ سے پہلے کے کھڑے ہیں۔

نوجوان کا رنگ سانولا تھا، جسم صحت مند۔ وردی پہنے وہ خاصہ چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی تو اس کی نظر ایک جگہ پر رکی رہ گئی۔ دو آدمیوں نے ایک آٹھ نو سالہ لڑکے کو گود میں لے رکھا تھا۔ ٹانگیں تھام رکھنے والے شخص کے سفید پائجامے پر بچے کے جسم سے رسنے والے خون کے دھبے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ نوجوان گھبرا کر بچّے کے قریب آ گیا۔

آپ پلیز جلدی کیجیے۔ کسے فون کرنا ہے، اس نے ایک کندھے سے لٹکی بندوق اتار کر دوسرے کندھے پر رکھی اور ٹیلی فون بوتھ کی طرف لپکا۔

نمبر بتایئے۔ میں کرتا ہوں ڈائل۔ خون بہہ رہا ہے۔ جلدی۔

مگر صاب جی۔ ادھیڑ عمر کا شخص کچھ کہنے لگا تھا کہ بندوق پر اس کا ہاتھ دیکھ کر باقی

لوگوں کی طرح وہ بھی پل بھر کے لیے ٹھٹھک گیا مگر اب اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک سی نظر آرہی تھی۔ اس نے آگے کچھ نہ کہہ کر نمبر بتایا۔

نوجوان نمبر ملا چکا تو اس شخص نے آگے بڑھ کر اپنی علاقائی زبان میں کچھ کہا اور بچّے کے قریب لوٹ آیا۔ بندوق بردار نوجوان نے دوبارہ ان لوگوں کی جانب نگاہ ڈالی کہ شاید کسی اور کو فون کرنا ہو۔ مگر کسی کو متوجہ نہ پا کر وہ فون کی طرف پلٹا۔

دور سے کوئی عورت تیز تیز قدم اٹھاتی ٹیلیفون بوتھ کی طرف آرہی تھی۔ فون کے پاس بندوق بردار نوجوان دیکھ کر رک گئی اور باقی لوگوں کو دیکھنے لگی۔

کک ۔۔۔ کیا ہوا؟ خون دیکھ کر اس نے جانے کس سے پوچھا تھا۔ پاؤں پکڑنے والے کی پوری ٹانگ سرخ ہو گئی تھی۔

تم لوگ کھڑے ہو۔ کچھ زخم پر باندھا بھی نہیں۔ اسپتال لے جاؤنا۔ ایسے تو سارا خون۔۔۔

عورت نے ایک جھٹکے میں رومال نما مربع ساخت کا دوپٹہ کھینچا جو اس کے ماتھے سے ہوتا ہوا سر کے پچھلے حصّے تک چلا گیا تھا اور وہاں اس نے اس میں ڈھیلی سی گرہ ڈال رکھی تھی۔ اس نے دوپٹے کو پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کیا۔

ہم لوگ بس گاڑی کا انتظار کر رہے ہیں۔ آگے کرفیو ہے۔ وہ گھر سے نکل چکے ہیں۔ راستے میں تلاشیاں ہو رہی ہوں گی۔ رکنا پڑ رہا ہوگا انھیں بار بار۔

ادھیڑ عمر شخص نے بچے کی پتلون نیچے کو سرکائی۔ عورت اس کی ران پر پٹی باندھنے لگی تو باوردی بندوق بردار نوجوان آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنے لگا۔ اسے نزدیک آتا دیکھ کر لوگوں کی نظروں میں لمحہ بھر پہلے جو خوف ابھر آیا تھا وہ اسے بچّے کے قریب دیکھ کر دور ہو گیا تھا۔ عورت کا سرخ وسفید چہرہ بھی پل بھر پہلے پیلا پڑ رہا تھا۔ لیکن اب وہ بھی مطمئن سی تھی۔ سب لوگ بندوق بردار نوجوان کو پٹی باندھتا دیکھ کر کچھ ایسے حیرت زدہ تھے جیسے کوئی عجیب و غریب بات وقوع پذیر ہو رہی ہو۔

اس نے کمالِ مہارت سے بچے کے زخم پر دوپٹہ باندھ دیا تھا کہ پہلے سے بندھے رومال کی طرح دوپٹہ بالکل سرخ نہیں ہوا، بلکہ کچھ ہی دیر بعد کافی وقت سے بے ہوش بچہ دھیمی آواز میں کراہنے لگا تھا۔

کمال ہے۔ان میں ایسے لوگ بھی ہیں۔؟ کسی نے سرگوشی کی۔ باوردی نوجوان یہ زبان نہیں جانتا تھا۔وہ بچے کو دیکھ رہا تھا۔

قریب کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔عورت نے رومال نما دوپٹے کے نصف مستطیل ٹکڑے کو سر پر مزید درست کیا۔

سب لوگ خاموشی سے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے کسی گاڑی کے آنے کی توقع تھی۔

عورت نے سیدھے ہاتھ سے اپنے پھرن کی جیب میں کچھ ٹٹولا۔ جیب سے کسی چیز کے کھنکنے کی آواز آئی۔

آپ اس وقت کیوں باہر آئیں ہمشیرہ؟ ایک شخص نے پوچھا۔حالات اور خراب ہو گئے ہیں۔اس طرف بھی کرفیو لگنے والا ہوگا۔جانے کس احمق نے ان جانوروں کی طرف گولہ پھینکا، جو ہمارے قریب پھٹا۔میرے دوست کا بھانجا ہے یہ۔زخمی ہو گیا غریب۔

اس نے بچے کا دھڑ تھامنے والے شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔

ان لوگوں کو تو بہانہ چاہئے۔آپ فوراً گھر چلی جائیں۔

مجھے فون کرنا ہے۔میرا شوہر دریا پار چائے انڈے بیچتا ہے۔دوپہر میں کھانے کے لیے آیا ہی نہیں۔ پریشان ہو رہی ہوں۔بچوں کو باہر سے تالا لگا کر آئی ہوں۔چابیاں ساتھ ہیں میرے۔

عورت نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔عورت کے ہاتھوں کی اوپری جلد کھردری اور کہیں کہیں سے چاک ہو گئی تھی مگر ہتھیلی پھول کی طرح ملائم تھی۔اس نے گھٹنوں سے ذرا اوپر تک کی لمبائی کا ہلکے رنگوں کی چھینٹ والے کسی موٹے

کپڑے کا پھرن پہن رکھا تھا۔ کرتے کی کاٹ کا نسبتاً چوڑا، چغہ نما پیرہن، اتنا کھلا کہ اگر ہاتھ آستینوں کے اندر سے کھینچ کر جسم سے لگا لیے جائیں، یا سوکھی جھاڑیوں کی آگ سے بھرے مٹی کے پیالے کے گرد بید کی نرم ہری ٹہنیوں سے بُنی گئی کانگڑی اس کے اندر رکھ لی جائے جب بھی اس پیرہن کی تنگی کا احساس نہ ہو۔ پھرن کے ساتھ اس نے نیم تنگ پائنچوں والی اسی چھینٹ کی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کے پیروں کی جلد بھی گلابی تھی مگر ایڑیوں کے آس پاس کی سخت کھال میں چھوٹی بڑی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔

گاڑی آ گئی تھی۔ کارواں بچّے کو لے کر کسی طرف چل پڑا تھا۔ بندوق بردار باوردی نوجوان ٹیلیفون پر کوئی نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دور کہیں زور سے بادل گرجے تو عورت نے چونک کر آسمان کی جانب نظر اٹھائی۔ لمبی سڑک کے اس پار کوہِ سلیمان کی پہاڑی کے ٹیلے کے بالکل اوپر، آسمان کے کنارے پر تازہ برف کے تودوں جیسے سفید بادل دھیمی رفتار میں محوِ پرواز اسی طرف آ رہے تھے۔ ابر کا ایک بڑا سا گالا پہاڑی کی چوٹی پر ایستادہ، شنکر آچاریہ کے سرمئی چٹانوں سے تراشے گئے پر شکوہ مندر کے کلس سے الجھا جیسے کہ ٹھہر گیا تھا اور ہو بہو ان بڑے بڑے ناتراشیدہ پتھروں کے رنگ جیسا سرمئی نظر آ رہا تھا۔

بادل کے اس دیو قامت ٹکڑے میں پل بھر کے لیے تیز روشنی کی ایک منحنی سی لکیر آڑھی ترچھی لہرائی اور غائب ہو گئی۔ بادل کچھ اور زور سے گرجے۔

عورت کے چہرے پر پریشانی سی جھلک اٹھی۔ اس نے پلٹ کر، فون ملانے میں کوشاں باوردی نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر جیب میں کچھ ٹٹولا۔ چابیوں اور سکّوں ملی جلی کھنک کے فضا میں تحلیل ہوتے ہی عورت نے گھبرا کے دائیں بائیں دیکھا پھر ٹیلیفون بوتھ کے شیشے میں لگے لمبے سے کیبن کے اندر بغور دیکھنے لگی۔

نوجوان کو نمبر نہیں مل رہا تھا۔ ٹیلیفون کے پیچھے دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں نوجوان نے عورت کو بار بار فون کی طرف دیکھتے دیکھا تو وہ کیبن سے باہر آ گیا۔

آپ فون کرلو جی۔ میں بعد میں Try کرلوں گا۔

وہ عورت سے مخاطب ہوا۔ عورت بغیر کچھ بولے لپک کر فون کے پاس پہنچی۔ جہاں اس کا شوہر چھوٹے سے کھوکھے پر سامان بیچتا تھا، وہیں پاس کی ایک دکان پر فون پر بات کر کے وہ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے آج کام زیادہ ہو۔ پاس والی دکان بند ہو۔ یا وہ گھر آ رہا ہو، پھر تو اِسی سڑک سے گزر یگا۔ مگر پھر اب تک گزرا کیوں نہیں، ہوسکتا ہے کہ اس نے اُسے نہ دیکھا ہو۔ مگر وہ تو دیکھ لیتا اسے۔ اگر گزر رہا ہوتا۔ کہیں کوئی بچہ جاگ نہ گیا ہو۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں۔

اس نے آخری مرتبہ فون گھمایا۔ نمبر نہیں ملا۔ اس نے گردن موڑ کر بندوق بردار نوجوان کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ کچھ وقت بعد پھر کوشش کرے گی۔ جب تک یہ فارغ ہو لیگا۔

نوجوان اسے باہر آتا دیکھ کر دوبارہ کیبن میں داخل ہو گیا۔

ہلکی ہلکی مگر قدرے خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ عورت نے ہاتھ پھرن کے آستینوں میں سے اندر کھینچ لیے اور انھیں مخالف کہنیوں تلے دبا لیا۔ دانت آپس میں ملا کر اور لب وا کر کے اس نے ایک لمبی سی سانس لی تو مارے سردی کے دانت بجنے لگے۔ اس نے دونوں شانے ایسے اوپر اچکائے جیسے گردن کو کندھوں میں چھپا دینا چاہتی ہو۔

وہ کبھی سر داہنی اور گھما کر سڑک کی طرف نظر ڈالتی کبھی کیبن میں فون پر مصروف باوردی بندوق بردار نوجوان کو دیکھتی۔ فون کے عقب میں دیوار میں نسب آئینے میں اسے نوجوان کے چہرے کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔

وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ اسی کی طرح وہ بھی پریشان ہو رہا تھا۔ نمبر نہ ملنے پر جھنجھلا رہا تھا۔ پھر ایک نئی امید کے ساتھ دوبارہ نمبر ڈائل کرنے میں منہمک ہو جاتا۔ سیدھا سا نارمل انسان لگ رہا تھا وہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ یہ سب تو درندے ہوتے ہیں۔۔۔ جانور ہیں جانور۔۔۔ انسان لگتے ہی نہیں۔

عورت نے سر جھٹک کر منہ پھیر لیا۔

صبح جب وہ پاس کے مختصر سے بازار، دودھ لانے گئی تھی، اس وقت اس نے ایک نہایت ضعیف آدمی کو ہاتھ گاڑی پر لہسن بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ شاید پوتا تھا اس کا۔ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا رک رک کر ہانک لگا رہا تھا۔ تازہ خوشبودار لہسن۔ بڑا بڑا لہسن۔ مٹی کے بھاؤ۔ آؤ بھائیو آؤ۔ آؤ بہنو آؤ۔ ختم نہ ہو جائے۔ ماں جی آئیے۔

گاڑی کو دونوں ساتھ ساتھ دھکیل رہے تھے۔ وقفے وقفے سے گاہک آتے، ترازو کھڑکتی۔ کچھ سکے، کوئی نوٹ۔ پھر اسی ردھم سے لڑکے کی صدائیں بلند ہوتیں جنھیں وہ حلق کی گہرائی سے نکالتا۔ اس کے گلے کی جلد میں چھپی نسیں ابھر آتیں۔ چھوٹی چھوٹی سرمئی ندیوں جیسی بل کھاتی ہوئی نسیں۔

جانے کدھر سے ایک باریش، باوردی پولیس والا نمودار ہوا اور ہاتھ میں پکڑا کین لہسن کی ڈھیری پر دے مارا۔ لہسن کی کئی پتھیاں زمین پر گر گئیں۔ بوڑھا جلدی جلدی اٹھانے لگا۔

باپ کی سڑک ہے کیا۔ ریڑھی لگانا منع نہیں ہے ادھر؟

پولیس والا علاقائی زبان میں دہاڑا اور کین لڑکے کی پیٹھ میں چبھو دیا۔

جناب۔ جناب۔ ابھی ابھی خریدا ہے۔ گھر ہی جا رہے ہیں حضور۔ بوڑھا دونوں ہتھیلیوں کو جوڑ کر ان میں لہسن جمع کر کے جلدی جلدی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑکے کے کین چبھتے دیکھ کر اس نے ہاتھوں میں پکڑا لہسن زمین پر گرا دیا اور سپاہی کے جوتے پکڑ کر گڑگڑانے لگا۔

او۔ تو تو سکھا رہا ہے اسے بے ایمانی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے تجھے لہسن بیچتے ہوئے۔ پیسے بٹورتے ہوئے۔ سمجھا؟

باریش سپاہی نے لہسن کی ڈھیری کے نیچے بچھے بورئیے کا کونہ الٹ دیا اور دس روپے کا اکلوتا نوٹ اور پانچ کے تمام سکے اٹھا کر جیب میں ڈالے اور جھٹکے سے پاؤں چھڑا لیے۔ بوڑھا لڑھک گیا۔ اگر زمین پر نہ بیٹھا ہوتا تو زور سے گرتا۔ پھر جلدی سے سنبھلا اور

اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

جناب۔۔۔جناب یہ دس کا نوٹ مجھ کو۔صبح سے بس اتنی ہی کمائی ہوئی تھی۔اب کچھ نہیں ہے میرے پاس۔

بابا تمبا کو پیتا ہے صاب۔ کچھ تھوڑا پیسہ واپس دے دو صاحب جی۔لڑکا سہما ہوا بولا۔

بکواس بند کرو۔ الٹ دوں گا ریڑھی۔ دونوں کو تھانے میں بھر دوں گا۔حرام خور۔ہاتھ گاڑی کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر باریش سپاہی الٹے ہاتھ سے اپنی سیاہ داڑھی سنوارتا ہوا دوسری طرف چل پڑا۔

عورت جب تک دودھ والے کی دکان پر رہی تھی اس نے یہی دیکھا کہ بوڑھا شخص زمین پر بیٹھا اپنے ہاتھوں پر سے سپاہی کے جوتوں سے لگ جانے والی مٹی جھاڑ رہا ہے۔جب وہ المونیم کی چھوٹی سی ڈولچی میں ایک پاؤ دودھ لے کر پلٹی تو کوئی مری مری سی آواز میں جیسے کہ رو رہا تھا۔

لہن۔تازہ۔تازہ۔

یہ گوری رنگت اور ستواں ناک والا باریش محافظ۔اس کا ہم مذہب، ہم زبان، اسی کی مٹی کی پیداوار۔

اور وہ، جو کل زچہ بچہ ہسپتال کے پھاٹک کے پاس۔ وہ کالے سانولے موٹی چوڑی ناکوں والے۔ ہر برقع پوش عورت کا نقاب یہ کہہ کر الٹتے تھے کہ اس کے اندر دہشت گرد ہو سکتا ہے۔

نازک ڈیل ڈول میں نرم کلائیوں اور چھوٹے پیروں والے برقع پوش دہشت گرد، جو میٹرنٹی ہسپتال میں آتے ہیں۔جن کے چہروں سے عمداً انگلیوں کو مس کرتے ہوئے انھیں بے نقاب کر کے بھوکی نظروں سے گھورا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آس پاس، یورپ کے ایک حصے میں ہر فوجی

افسر کسی بھی عورت کو حکم دے سکتا تھا کہ وہ مکمل بے لباس ہو کر ثابت کرے کہ اس نے کوئی آتش گیر مادہ یا ہتھیار تو نہیں چھپا رکھا۔ یہ بات عورت نے بہت پہلے کسی کتاب میں پڑھی تھی۔

انھیں موقع مل جاتا تو۔ جہاں جہاں انھیں موقع ملتا ہے وہاں۔ خدا کی پناہ۔ وہاں کیا نہیں کرتا یہ بندوق بردار۔ پکی رنگت والا یا صاف رنگ کا۔ باوردی یا بغیر وردی کے۔ سب ایک طرح کے درندے۔ خدا نے عورت کو بنایا ہی کیوں۔

اس کی نظریں باوردی نوجوان کی بندوق پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ ماتھے پر شکن ابھر آئے تھے۔

باوردی نوجوان کا نمبر مل گیا تھا۔

وہ کسی سے بات کرنے میں مشغول تھا۔ اس کے چہرے پر اچانک خوشی چھا گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی کچھ پوچھ رہا تھا۔ عجب بے صبری سے، اونچی آواز میں، جو کیبن کے شیشوں کے اس پار بھی سنائی پڑ جاتی تھی۔ مگر کسی غیر مانوس زبان میں۔ جو عورت کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

بوتھ سے کچھ میٹر کے فاصلے پر تنگ سی سڑک کے اس طرف ایک اور بندوق بردار کھڑا تھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کیبن والے نوجوان نے اس کی طرف دیکھ کر ہوا میں مکا لہرایا تو اس نے مسکرا کر زور زور سے سوالیہ انداز میں سر نیچے سے اوپر کو ہلایا کیبن کے اندر والے نوجوان نے ابرو اٹھا کر، آنکھیں پوری وا کر کے جوشیلے انداز میں سر کو بار بار اثبات میں جنبش دی۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

عورت اپنے محتاط مگر پر تجسّس تاثرات کو بخوبی چھپا کر سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

شاید اس کے ہاں بچہ ہوا ہو۔ مگر یہ تو خود ہی کم عمر لگتا ہے۔ شادی کہاں ہوئی ہوگی اس کی۔ مگر ہو سکتا ہے۔ ہو بھی سکتی ہے۔ یا شاید اس کے گھر والوں نے اس کی پسند کی لڑکی سے اس کی شادی طے کر دی ہو۔۔۔ اور لڑکی بھی۔۔۔ لڑکی بھی اسے پسند کرتی ہو۔۔۔ لڑکی اسے۔۔۔ پسند کرتی ہو۔۔۔

پسند اس نے بھی کیا تھا کسی کو کبھی
جب وہ ایک نوخیز لڑکی ہوا کرتی تھی

اس کا نام دلّو تھا۔نہیں، اس کا نام دلشاد تھا۔۔۔یعنی دلشاد بانو تھا۔ وہ ساتویں درجے تک تعلیم حاصل کرسکی تھی۔ اس کا باپ مجید بٹ نالائے مار کا ایک غریب مچھوارہ تھا۔ جواپنے مختصر سے نیم بوسیدہ آبی گھر میں
میلے گدلے پانی کے اس نالے کے ایک کنارے پر رہتا تھا۔ میلے، گدلے پانی والا نالا ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔

صدیوں پہلے جب نقل وحمل کا واحد وسیلہ پانی ہوا کرتا تھا تو سلطان زین العابدین کی حکومت میں جہلم سے کچھ اضافی نالے نکالے گئے تھے۔نقل وحمل کے علاوہ سیلاب سے بچاؤ اور شہر کی خوبصورتی کا مقصد بھی ذہن میں رہا ہوگا۔ان میں کٹ کل اور نالائے مار بھی شامل تھے۔ نالا تنگ وتاریک راستوں سے گزرتا ہوا، بیشمار شاخوں میں بٹتا ہوا، پھر جہلم میں جاملتا تھا۔اس میں ہر چھوٹی بڑی بستی کے لیے رسد گاہیں ہوا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے بجروں میں اناج ایندھن وغیرہ ہر گھاٹ پر پہنچایا جاتا تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ آبی وسائل کی جگہ موٹر گاڑیوں نے لے لی۔جنگلوں کی مسلسل کٹائی سے پانی کم ہوتا گیا اور نالا رفتہ، رفتہ کوڑے کرکٹ کی آماجگاہ بنتا گیا، ساتھ ساتھ بیشتر مقامات پر سوکھتا چلا گیا تو اس پر تعمیرات ہونے لگیں۔

بعد میں بیسویں صدی کی آخری دودہائیوں میں سرکار نے وہاں سے باقاعدہ سڑکیں نکالیں اور کہیں کہیں گدلے پانی میں کچھ مچھلیاں کچھ کشتیاں اور اکادکا مختصر بستیاں رہ گئیں۔

مجید بٹ کا کل کاروباری اثاثہ ایک بوسیدہ سا جال اور ایک چھوٹی سی پرانی کشتی تھا۔ کشتی کا رنگ پانی نے اس قدر چوس لیا تھا کہ وہ بالکل اس گدلے پانی کے رنگ کی نظر آتی تھی۔

مجید بٹ کا ایک بیٹا بھی تھا۔اس کی خواہش تھی کہ اس کے بچے پڑھ لکھ جائیں اور دن بدن اور زیادہ آلودہ ہوتے جارہے اس نالے میں ایک ایک مچھلی پکڑنے کے انتظار میں پہروں گزارتے ہوئے عمر گنوانے کی بجائے کہیں نوکری کرلیں۔ مگر مشتاک یعنی کہ مشتاق

احمد بمشکل پانچ جماعتیں پڑھ سکا، اور بار ہا مار کھانے کے باوجود اس نے سکول کا رخ نہ کیا۔ آخر کار باپ اسے اپنے ساتھ کشتی پر ہی لے جانے لگا۔

دلّو ایک ذہین طالبہ تھی اور سینٹرل اسکول کے ساتویں درجے میں پڑھ رہی تھی۔ اساتذہ کو اس سے خاصی امیدیں تھیں۔ جماعت کے انچارج ٹیچر اس کی بہت حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ ان کا نیا نیا تقرّر ہوا تھا۔ دیکھنے میں بھی ماسٹر جی کا چہرہ خاصا جاذب تھا۔ گھنے گھنے بال اور چھوٹی سی داڑھی اُن پر خوب کھلتی تھی۔ دِلّو کے باپ کی درخواست پر کبھی کبھی ماسٹر جی دلّو کو کوئی مشکل سبق گھر آ کر بھی پڑھا دیتے اور اس بات سے انھیں خود بھی دلی خوشی ملتی تھی۔

دلّو کی آنکھیں نافے کی ٹکیاں ایسی تھیں۔ اس کے بال دیودار کی اس سلگتی ہوئی روغنی لکڑی ایسے سیاہ تھے جو روشنی کرنے کے لیے جلائی جاتی ہے۔ اور اس کی جلد سمانوار کے بار ہا منجھے پیتل کے دستے کی رنگت لیے ہوئی تھی۔ ساتویں درجے میں آتے ہی وہ ایک دم بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی۔ اس کے پاس سیاہ رنگ کا ایک پھرن تھا جس کے گریبان پر اس کی نانی کی یادگار، پانچ چاندی کے روپیوں کے ساتھ ٹانکا لگی گھنگھریوں والا ایک ہار رہتا تھا جو وہ بچپن سے پہنے ہوئے تھی۔ ورنہ اس کی ماں کے سر پر پھیلے سوتی رومال کے نیچے لگی ٹوپی، 'کسابہ' کے اندر سے ماتھے پر جھانکنے والے تین تین جھومروں اور کان کی بڑی بڑی بالیوں والا چاندی کا زیور کب کا گھر کی ضروریات کی نذر ہو گیا تھا، جبکہ ایسے زیورات پانی پر رہائش پذیر خاندانوں کے مخصوص زیورات میں شمار ہوتے ہیں۔

آٹھویں دہائی کے غالباً آخری سال کا کوئی دن تھا جب دوسرے کنارے پر رہنے والے رشید ڈار کا منجھلا لڑکا جو دو ماہ پہلے اچانک غائب ہو جانے کے بعد کوئی ہفتہ بھر پہلے نمودار ہوا تھا، دلّو کے بھائی مشتاکے کو صبح صبح آ کر کہیں لے گیا۔ مشتاکہ اس دن دیر گئے گھر لوٹا اور ماں کے بار بار پوچھنے پر بھی کوئی جواب نہ دے کر سو گیا تھا۔ ماں کے سوالات کا جواب نہ سن کر مایوس باپ نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ مگر اس کا چین لٹ گیا تھا۔

دوسری صبح رشید ڈار کا منجھلا لڑکا پھر گھر آیا اور اندر کے چھوٹے کمرے میں کافی دیر تک مشتا کے کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ اونچی آواز میں بول رہا تھا جبکہ مشتا کہ وقفے وقفے سے دھیمی آواز میں کچھ کہتا۔ مگر کمرے کے باہر صرف شور کا سا احساس ہو رہا تھا اور بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ تیسری بار جب رشید ڈار کا منجھلا لڑکا پھر آیا تو اندر کے کمرے سے دنوں کی بحث کرنے کی آوازیں بھی آئیں تھیں۔

دو ایک روز بعد جب کافی دن نکل آیا تھا، رشید ڈار کا منجھلا لڑکا آیا۔ مشتا کہ باپ کے ساتھ کشتی پر دور نکل گیا تھا۔

شام کو جب مشتا کہ اور مجید بٹ کام سے لوٹے تو دلّو بیہوش پڑی تھی۔ اس کی گردن پر خراشیں تھیں اور چہرے پر نیلے دھبے ابھر آئے تھے اور ماں نے اپنے بہت سارے بال نوچ ڈالے تھے۔ اس دن ماں کچھ نہیں بولی تھی۔

دوسرے دن سینٹر اسکول کے ماسٹر جی کو گولیاں لگنے کی بات سن کر ماں نے بتایا تھا کہ باپ اور بھائی کو بار بار پکارنے کے بعد دلّو نے کئی دفعہ ماسٹر جی ماسٹر جی کہا تھا اور پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔

اسی دن سے مشتا کہ گھر سے غائب ہو گیا تھا اور کئی دن بعد جب رشید ڈار کے منجھلے لڑکے کی لاش نالے کے پانی میں تیرتی نظر آئی تو مشتا کہ گھر آ کر ماں سے لپٹ کر خوب رویا تھا۔ اس کے بھورے رنگ کے لمبے سے پھرن کے اندر بغل کے پاس ٹخنوں تک پہننے والے جوتے کی ساخت سے ملتی جلتی لوہے کی کوئی بالشت بھر لمبی چیز لٹک رہی تھی۔

اس دن کے بعد مشتا کہ زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔

رشید ڈار کوئی دو ہفتے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ نہ ہی اس نے مسجد کا رخ کیا تھا۔ جس دن رشید ڈار مسجد میں آیا، اسی دن اس نے مصیبت کے وقت انسان کے اور خاص کر پڑوسی کے کام آنے کا ذکر کیا تھا۔ اور کچھ دن بعد اس نے اپنے بڑے لڑکے کے لیے جس کی ایک ٹانگ پر پولیو کا اثر تھا اور جس کی شادی کی عمر نکلا چاہتی تھی۔ مصیبت زدہ دلّو کا رشتہ ماں

گا تھا۔ دلّو کے باپ نے یہ سوچے بغیر کہ کس کی مصیبت میں کون، کس کے کام آیا، اپنی حسین وجمیل نوخیز بیٹی کے لیے، یہ رشتہ قبول کرلیا تھا۔

مرے اشک بن میرے بابل بہے
ترے دل کے اندر جو تھے آبلے

دلّو کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر ہونٹ پر ٹِک گیا تھا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے اسے پونچھ لیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اُسے چونکا کر ماضی سے حال میں لے آئی تھی۔

بندوق بردار باوردی نوجوان ہنستا مسکراتا ٹیلیفون بوتھ کے شیشے لگے کیبن سے باہر آیا اور بوتھ کے مالک کو بل ادا کرنے لگا۔ دلّو نے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا کہ نوجوان کے بٹوے میں کسی لڑکی کی مسکراتی ہوئی رنگین تصویر تھی۔

نوجوان کودتا پھاندتا سڑک پار کرکے اپنے دوسرے باوردی ساتھی کے پاس پہنچا اور دفعتاً اسے کمر سے اٹھا کر واپس زمین پر رکھتے ہوئے اس کا منھ چوم لیا۔ اس کے ساتھی نے ہنستے ہوئے اپنا آپ چھڑایا اور اٹینشن میں کھڑا ہوگیا کہ سامنے سے سرکاری جھنڈے لگی تین موٹر گاڑیاں گزر رہی تھیں جن کے آگے پیچھے حفاظتی عملے کی دو بڑی بڑی گاڑیاں اور آخر میں اچانک حادثے کی صورت میں کام آنے کے لیے لمبی سی ایمبولینس تھی۔ اس کا ساتھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھِلے کھِلے چہرے کے ساتھ دوسری سمت کو جارہا تھا۔

ٹھہرے ہوئے بندوق بردار کے سامنے سے پہلی گاڑی کے گزرتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس میں آگ لگ گئی۔ پیچھے کی گاڑیاں توازن کھو کر ادھر ادھر بکھرنے لگیں۔ ان کے حفاظتی عملے نے چند لمحوں کے اندر اندر چاروں طرف اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کردیں۔

ٹیلیفون بوتھ والے نے اندر سے دکان کا شٹر گرادیا تھا۔ دلّو کے علاوہ دو اور لوگ بھی دکان کے اندر رہ گئے تھے۔

اب شاید کرفیو لگ چکا ہوگا۔

دکان کے اندر گھٹن سی ہورہی تھی۔

وہ گھر میں تالا لگا کر آئی تھی۔

کچھ دیر بعد باہر سناٹا چھا گیا تھا۔ پھر گاڑیوں کی آمدورفت بحال ہوگئی کہ ہارن اور انجن کی آوازیں دکان کے اندر صاف سنائی دے رہی تھیں۔ دکاندار نے شٹر ذرا سا سرکا کر باہر جھانکا اور پورا شٹر کھول دیا۔

دِلّو تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف مڑی تو اس نے دیکھا کہ جائے حادثہ کا پتھروں سے احاطہ کردیا گیا تھا۔ ادھر ادھر زمین پر سیاہی مائل سرخی چھا گئی تھی۔

گھر کے موڑ پر مڑتے وقت دلّو نے یہ بھی دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کے ادھ جلے فوجی جوتے کے پاس ایک والٹ کھلا پڑا تھا اور اس میں ایک مسکراتی ہوئی لڑکی کی تصویر پتلے سے بے رنگ پلاسٹک کے پیچھے سے چپ چاپ جھانک رہی تھی۔

دلّو کے سینے میں ایک چیخ گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کچھ لمحوں بعد کھول دیں۔

اب وہ نہایت دھیمی رفتار سے گھر کے راستے پر چل رہی تھی۔ ساری سڑک سنسان تھی۔ دور ایک شخص داہنا بازو جھلاتا اور بایاں ہاتھ ہر دوسرے قدم کے ساتھ گھٹنے پر دھرتا لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا، مگر دِلّو کی رفتار پھر بھی تیز نہیں ہوئی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ چابیاں اس آدمی کی نہیں خود اسی کی جیب میں ہیں اور وہ گھر میں تالا لگا کر آئی ہے۔

کشتی

محمد فیصل کسانہ

افسانہ ''کشتی'' ترنم ریاض کا ایک اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اُن کے افسانوی مجموعے ''یمبر زل'' میں شامل ہے جو 2004ء میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں اُن تمام لوازمات کا خیال رکھا گیا ہے جو کہ ایک کہانی کو افسانے کا درجہ دیتے ہیں۔ ویسے تو آج کل کہانیوں کو بھی افسانے کا نام دیا جاتا ہے مگر افسانہ ''کشتی'' خالص افسانے کے ہی زمرے میں آتا ہے۔

افسانہ ''کشتی'' کا موضوع وادیٔ کشمیر کی عوام اور اُن پر ہو رہے مظالم ہیں۔ لیکن ساتھ میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن کی طرف آج تک ہمارا دھیان نہیں گیا ہے۔ اگر ایک طرف ہندوستانی فوج کشمیریوں پر ظلم کے رہی ہے تو دوسری طرف یہاں کے دہشت گرد فرض شناس فوجیوں پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔ کشمیری عوام پر ہو رہے ظلم کی پاسدار صرف ہندوستانی فوج ہی نہیں بلکہ یہاں کے مقامی سپاہی بھی ہیں جو اپنا دبدبہ جمانے کے لیے یہاں کی غیور عوام پر طرح طرح کے مظالم روا رکھتے ہیں۔ اگر ایک طرف کشمیری عوام اپنی زندگی کی لڑائی لڑ رہی ہے تو دوسری طرف فوج بھی اپنی زندگی کی جنگ میں برابر کی شریک ہے۔ عوام اور فوج دونوں اپنی زندگی سے بیزار اپنی جان بچانے کی کوشش میں کوشاں ہیں۔ آئے دن روز افزوں ان ہلاکتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن

کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو اٹھ کر سامنے آئے اور ان ظالم طاقتوں کے خلاف بول سکے۔ اس بڑے موضوع کے علاوہ افسانہ ''کشتی'' میں چھوٹے چھوٹے بہت سارے موضوعات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ لیکن اس افسانے کی تکنیک نے اس کے اندر ایک ایسی رمز چھپا دی ہے جو ہر کس و ناکس کی پکڑ میں نہیں آسکتی۔ اس افسانے کی بنت میں مصنفہ نے بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ جیسا افسانے کا موضوع ہے ویسا ہی افسانہ نگار نے تکنیک اور زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک کو عمل میں لاتے ہوئے مصنفہ نے موضوع کو اتنا خوبصورت بنا دیا ہے کہ اگر قاری ایک طرف سے پڑھنا شروع کرے تو جب تک ختم نہ کر لے تب تک چین و آرام کی سانس نہیں لے سکتا۔ ہر لمحہ ہر جملہ قاری کے دل و دماغ میں ایک نئی چنگاری پیدا کرتا ہے۔

ان تمام باتوں میں سب سے اہم اور بنیادی مقصد یہاں کے حالات سے پیدا شدہ واقعات کی منظر کشی اور اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی عکاسی ہے لیکن ان تمام پہلوؤں میں افسانے کے مرکزی کردار دلشاد بانو کے واقعات سب سے اہم ہیں۔ دلشاد ایک عام سے گھرانے کی اکلوتی بیٹی ہے جس کا باپ مچھلی پکڑنے کا کام کرتا ہے۔ اس کا بچپن بھی باقی لڑکیوں کی طرح عام سا گزرتا ہے لیکن اصل موڑ اس کی زندگی میں تب آتا ہے جب ایک دن مشتاک اور اس کا باپ مجید بٹ اپنی بوسیدہ کشتی لے کر مچھلی پکڑنے چلے جاتے ہیں۔ جب واپس لوٹتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ دلشاد ایک طرف پڑی رو رہی ہے اور اس کی ماں نے بھی رو رو کر اپنا برا حال بنا رکھا ہے۔ جب مشتاک اور مجید بٹ اُن کی اس حالت کے بارے میں پوچھتے ہیں تو غصے میں اُن کا منہ لال ہو جاتا ہے اور مشتاک اسی وقت اسی حالت میں گھر سے نکل جاتا ہے اور کچھ دن بعد جب خبر ملتی ہے کہ رشید ڈار کا منجھلا لڑکا نہر کے پانی پر مردہ تیرتا ہوا ملا ہے تو مشتاک بھی گھر واپس لوٹتا ہے۔ لیکن اب اس کی چال ڈھال بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے اور جوتے میں پستول چھپائی ہوتی ہے۔ اسی طرح کے کئی حالات دلشاد کو ٹیلیفون بوتھ پر کھڑے کھڑے یاد آتے ہیں۔

ان تمام باتوں کے ساتھ سب سے زیادہ دھیان دہشت گردی کی وجہ سے ہو رہے عورت پر مظالم پر دیا گیا ہے چاہے پھر وہ عورت کشمیری ہو یا ہندوستانی۔ اگر کوئی فوجی مارا جاتا ہے تو بھی ایک عورت ہی اپنے بھائی، بیٹے، خاوند سے محروم ہو جاتی ہے یا چاہے ایک دہشت گرد ہی کیوں نہ مارا جائے وہ بھی کسی کا بھائی، کسی کا بیٹا، کسی کا خاوند ہوتا ہے۔ یعنی کے کچھ بھی ہو ظلم کی چکی میں عورت ہی پس رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانے کے ذریعے یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سبھی فوجی جو بیرونِ ریاست سے یہاں آئے ہوئے ہیں، ظالم نہیں ہوتے۔ اس کی منظر کشی ٹیلیفون بوتھ کے پاس کی گئی ہے۔ ٹیلیفون بوتھ کے پاس ایک زخمی بچے کو رکھے ہوئے کچھ لوگ اس کو ہسپتال لے جانے کے لئے گاڑی کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن بچے کی ٹانگ سے لگاتار خون بہہ رہا ہوتا ہے۔ جب دلو اسے دیکھتی ہے تو اپنا دوپٹہ پھاڑ کر اس کی ٹانگ کو باندنے لگتی ہے، جب اس واقعے کو با ہتھیار فوجی دیکھتا ہے تو وہ بھی پاس آجاتا ہے اور دلشاد کے ہاتھ سے پٹی لے کر خود باندھنے لگتا ہے اور اتنی اچھی طرح سے باندھتا ہے کہ اب خون رسنا بند ہو جاتا ہے۔

دوسری جانب کچھ ایسے مقامی فوجی بھی ہیں جو جان بوجھ کر یہاں کے لوگوں پر ظلم روا رکھتے ہیں۔ اس واقعے کا ذکر ترنم ریاض کے الفاظ میں کچھ اس طرح سے ہے:

''جانے کدھر سے ایک باریش، باوردی پولیس والا نمودار ہوا اور ہاتھ میں پکڑا کین لہسن کی ڈھیری پر دے مارا۔ لہسن کی کئی پتھیاں زمین پر گر گئیں۔ بوڑھا جلدی جلدی اُٹھانے لگا۔

''باپ کی سڑک ہے کیا۔ ریڑھی لگانا منع نہیں ہے ادھر؟''

پولیس والا علاقائی زبان میں دھاڑا اور کین لڑکے کی پیٹھ میں چبھو دیا۔

''جناب۔ جناب۔ ابھی ابھی خریدا ہے۔ گھر ہی جا رہے ہیں حضور۔'' بوڑھا دونوں ہتھیلیوں کو جوڑ کر اُن میں لہسن جمع کر کے جلدی جلدی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑکے کے کین چبھتے دیکھ کر اس نے ہاتھوں

میں پکڑا لہسن زمین پر گرا دیا اور سپاہی کے جوتے پکڑ کر گڑ گڑانے لگا۔

"اوتو تو سکھا رہا ہے اسے بے ایمانی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
میں نے تجھے لہسن بیچتے ہوئے۔ پیسے بٹورتے ہوئے۔ سمجھا؟"

باریش سپاہی نے لہسن کی ڈھیری کے نیچے بچھے بوریے کا کونہ الٹ
دیا اور دس روپے کا اکلوتا نوٹ اور پانچ کے تمام سکے اٹھا کر جیب میں
ڈالے اور جھٹکے سے پاؤں چھڑا لیے۔ بوڑھا لڑھک گیا۔ اگر زمین پر نہ
بیٹھا ہوتا زور سے گرتا۔ پھر جلدی سے سنبھلا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔"

اس واقعے میں مزید لکھتی ہیں کہ:

"یہ گوری رنگت اور ستواں ناک والا باریش محافظ۔ اس کا ہم مذہب،
ہم زبان، اسی کی مٹی کی پیداوار۔"

جہاں عورت پر بالواسطہ طور پر ظلم ہو رہا ہے وہیں پر بلاواسطہ طور پر بھی ہو رہا ہے۔ عورتوں کو گھروں میں گھس کر، بندوق کی نوک پر زبردستی ہوس کا شکار بنایا جاتا ہے۔ کھلے عام اُن کی عزت نیلام کی جاتی ہے۔ کہیں بھی اُن کو بے پردہ ہونے کا حکم دیا جاتا تھا۔ ان حاکموں میں پکی رنگت اور صاف رنگ والے سبھی شامل ہیں۔ صرف ان کو موقع ملنا چاہیے۔ ترنم ریاض نے ان تمام واقعات کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

"اور وہ جو کل زچہ بچہ ہسپتال کے پھاٹک کے پاس۔ وہ کالے
سانولے موٹی چوڑی ناکوں والے۔ ہر برقع پوش عورت کا نقاب یہ کہہ کر
اُلٹتے تھے کہ اس کے اندر دہشت گرد ہو سکتا ہے۔ نازک ڈیل ڈول میں
نرم کلائیوں اور چھوٹے پیروں والے برقع پوش دہشت گرد، جو میٹرنٹی،
ہسپتال میں آتے ہیں۔ جن کے چہروں سے عمداً انگلیوں کو مس کرتے
ہوئے انہیں بے نقاب کر کے بھوکی نظروں سے گھورا جاتا ہے۔"

ان تمام واقعات کے ساتھ آخر میں افسانے کا اختتام اس واقعے پر ہوتا ہے جب

ٹیلیفون بوتھ والے فوجی کی مسلسل کوشش کے بعد کہیں فون ملتا ہے اور بڑا خوش ہو کر ٹیلیفون بوتھ سے باہر آتا ہے اور فون کا بل ادا کر کے اپنے دوسرے ساتھی کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جہاں پر دونوں کچھ دیر کے لئے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں اور اتنے میں ہندوستانی جھنڈے والی تین گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور وہ دونوں الگ الگ ہو کر گاڑی میں بیٹھے افسران کو سلامی پیش کرنے لگتے ہیں۔ جیسے ہی پہلی گاڑی اُن کے پاس پہنچتی ہے اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوتا ہے اور وہاں پر کرفیو نافذ ہو جاتا ہے اور دلشاد بھی دوکان کے اندر بند ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب گاڑیوں کے چلنے کی آواز آتی ہے تو دوکاندار شٹر کھولتا ہے اور دلوا پنے گھر واپس چلنے لگتی ہے۔ دوکان سے باہر نکلتے ہی چاروں طرف دیکھتی ہے اور آگے بڑھنے لگتی ہے۔ تھوڑی دور پہنچ کر دیکھتی ہے کہ جو پرس کچھ دیر پہلے اس نے ٹیلیفون کرنے والے فوجی کے ہاتھ میں دیکھا تھا، گرد پر پڑا ہوا ہے اور اس میں ایک مسکراتی ہوئی لڑکی کی تصویر چسپاں ہے۔ یہاں تمام تر واقعات سے انسانی مجبوری، دہشت گردی سے ہو رہے ظلم و استہزاء کی مذمت کی گئی ہے۔

افسانے کا عنوان ''کشتی'' اپنے اندر بہت سارے رمز و کنایات لیے ہوئے ہے۔ ایک طرف یہ کشتی کشمیر کے اُن لوگوں کا استعارہ بنا کر پیش کی گئی ہے جو پانی سے اپنے گھر چلاتے ہیں۔ دو وقت کی روزی روٹی وہیں سے کماتے ہیں اور اپنے گھر کا چولہا جلاتے ہیں۔ لیکن دو وقت کے کھانے کے لئے بھی بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ نہروں سے، دریاؤں سے پانی بھی دن بہ دن کم ہوتا چلا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مچھلیوں کی مقدار میں لگاتار کمی آتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ عنوان اُن تمام لوگوں کی عکاسی کرتا ہے جو یہاں پر ہو رہے ظلم و جبر کے شکار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی اور کشمیری سب ایک کشتی کے سوار نظر آتے ہیں کیونکہ جہاں بھی آپسی جھڑپیں ہوتی ہیں وہاں پر عام کشمیری ہو یا باوردی ہندوستانی سب کو ہی اس ظلم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

موضوع اور عنوان کے علاوہ افسانہ ''کشتی'' میں زبان و بیان پر بھی ترنم ریاض

کے فن کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ آسان و سلیس الفاظ کے استعمال نے جملوں کی بناوٹ کافی خوبصورت بنا دی ہے۔ لمبے جملوں سے پرہیز کیا گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے مگر پر اثر جملوں کو عمل میں لایا گیا ہے۔ ایک ایک جملہ کئی کئی معنی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ زبان و بیان کے ساتھ منظر کشی نے افسانے کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ منظر کشی کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ''دلو کی آنکھیں نافے کی ٹکیاں ایسی تھیں۔ اس کے بال دیودار کی اس سلگتی ہوئی روغنی لکڑی ایسے سیاہ تھے جو روشنی کرنے کے لئے جلی جاتی ہے۔ اور اس کی جلد سماوار کے بار ہا منجھے پیتل کے دستے کی رنگت لیے ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ رنگ کا ایک پھیرن تھا جس کے گریبان پر اس کی نانی کی یادگار، پانچ چاندی کے روپیوں کے ساتھ ٹانکا لگی گھنگھریوں والا ایک ہار رہتا تھا جو وہ بچپن سے پہنے ہوئے تھی۔''

ان تمام حصول کے علاوہ کردار نگاری کا بھی عمدہ نقش نظر آتا ہے۔ افسانے میں چھوٹے بڑے کافی سارے کردار ہیں لیکن سب سے متاثر کن کردار دلشاد اور ٹیلیفون بوتھ والے فوجی کے ہیں۔ ان میں سے بھی جتنا دلشاد کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے اتنا کوئی بھی کردار نمایاں نہیں ہے۔ مجید بٹ، مشتاکہ، ماسٹر جی وغیرہ کے کردار بھی افسانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

سب سے آخر پر اور افسانے کا سب سے اہم جز وحدتِ تاثر قائم رہتا ہے۔ ہر جملے کے بعد قاری کے ذہن میں ایک نئی سوچ بیدار ہوتی ہے۔ اور یہ سوچ، یہ تجسّس قاری کو پورا افسانہ پڑھنے پر آمادہ کرتی ہے اور آخر پر ایک ایسا نقش چھوڑ جاتا ہے جس سے ہر عام و خاص قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

☆☆☆
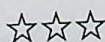
یمبرزل

اس انجام کا خدشہ سب کو تھا مگر اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ ماں اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ باپ اسے قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ یا ور ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور انیقہ۔۔۔

''نِکی باجی۔۔۔ یہ الجیبرا مجھے ضرور فیل کریگا۔۔۔'' یوسف نے پھرن کے اندر سے آگ بھری کانگڑی باہر نکال کر سبز گل بوٹوں والے سرخ قالین کے عین درمیان رکھ دی۔

''ہم سے تو یہ نہ ہوگا۔۔۔ نہ ہم پاس ہوں گے۔'' وہ لانبی لانبی انگلیوں سے آڑھی مانگ کے دونوں اطراف کنگھا کرنے لگا اور گردن اچکا کر دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے گنگنانے لگا۔

''چوپ۔۔۔ چوپ۔۔۔'' نِکی کی خاص کوشش کے بعد بھاری بنائی ہوئی آواز گونجی۔

'چپ چاپ بیٹھے رہو۔۔۔ کانگڑی اٹھا کر کنارے نہیں رکھ سکتے تم یوسف، کسی کی ٹھوکر لگ گئی۔۔۔ تو۔۔۔؟''

''نکی باجی۔ یوسف بھائی تو خوامخواہ کانگڑی گود میں اٹھائے پھرتے ہیں۔۔۔ اب ایسی سردی تو ہے نہیں۔ ابو نے اس کمرے میں اسی لیے بخاری نہیں لگائی کہ ہم سب چست رہیں گے اور پڑھنے میں مصروف رہیں گے۔۔۔ خوب سارے کپڑے پہن کر کہاں

لگتی ہے سردی۔۔۔ کانگڑی پھرن کے اندر ٹھونس کر جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔۔۔ جب دیکھو۔۔۔خاک پڑھیں گے۔۔۔؟"

یاور نے کتاب پر جھکا سر اٹھا کر نکی کے چہرے پر اپنی طرف سے بڑی اہم بات کہہ کر ردعمل جانچنے کی کوشش کی اور ایک نظر آئینے میں یوسف کے عکس کو دیکھ کر نتھنے سکیڑے پھر ابرُ واوپر کو کھینچے اور دانت نکوس کر بغیر آواز ہنسا اور کتاب پر ایسی عجلت سے جھکا جیسے بہت ضروری سبق ادھورا چھوڑنا پڑا ہو۔

"آپ سے کِس نے رائے مانگی تھی۔۔۔" نکی نے آواز میں بھرا ہوا رعب ذرا کم کر کے کہا۔

"آپ اپنا کام کیجئے۔۔۔" وہ بولی۔

"ادھر لاؤ کتاب یوسف۔۔۔ابھی تو سمجھایا تھا یہ سوال تم کو۔۔۔"

نکی نے لمبا سا رجسٹر اور کتاب اپنی طرف سرکائے تو یوسف فرش پر کہنیوں کے بل لیٹ گیا اور رجسٹر پر نظریں گاڑھ دیں۔

"اوپر اٹھو یوسف۔۔۔ سونے کی تیاری مت کرو نا۔۔۔ میرا بھی کل پیپر ہے۔۔۔پلیز۔۔۔"

نکی فوراً دبلی پتلی سی باریک آواز والی لڑکی بن گئی۔ اور یوسف جیسے کہ ہوش میں آ گیا۔

"اوہ۔۔۔Sorry نکی باجی۔۔۔ایک بار اور کوشش کرتا ہوں۔۔۔"

یوسف نے رجسٹر اور کتاب اپنی طرف سرکائے۔ کچھ لمحے نکی کی طرف دیکھتا رہا۔ گلابی جلد والا کتابی چہرہ۔ لمبی سی آنکھوں پر چھوٹا سا بغیر فریم کا چشمہ۔ رخسار پر کان کے پیچھے سے آنے والے بالوں کی ایک پتلی سی لٹ اور کان میں چھوٹی سی سنہری بالی۔ دوسری بالی اس زاویئے سے نظر نہیں آتی تھی۔ باقی بال سر کے پیچھے کی طرف موٹے سے سیاہ ہیر بینڈ میں پھنسے تھے۔ دودھ ایسی سفید گردن پر دو ایک لاجوردی نسیں۔ اور گردن کے ساتھ لگا سیاہ

رنگ کے سویڈ کے موٹے سے کپڑے پر بغیر کڑھائی کے کالر والے پھرن کا بند زپ۔ کلائی تک آتی ہوئی آستین میں سے جھانکتے نازک ہاتھ میں قلم۔ سامنے کئی کتابیں اور کاپیاں بکھری ہوئیں۔

''کیا سوچ رہے ہو اب۔۔۔ تم۔'' نکی نے اسے کچھ پل لگاتار دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ کچھ نہیں نکی باجی۔۔۔'' وہ جلدی سے بولا اور کتاب پر جھک گیا۔ نکی نے دیوار سے ٹیک لگا دی اور تلوے فرش پر رکھ کر موڑے ہوئے گھٹنوں پر کتاب پھیلا دی۔

تینوں سر کتابوں پر جھک گئے۔

نکی یاور کی بڑی خالہ تبسم بیگم کی اکلوتی اولاد تھی۔ یاور کی ماں تنویر بیگم کی لاڈلی بھانجی، جو کچھ دن اپنی خالہ کے یہاں رہنے آئی تھی۔ بلکہ اس کی موجودگی میں اس کا خالہ زاد بھائی یاور بھی پڑھنے کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جایا کرتا تھا۔ وہ جماعت ششم کا طالب علم تھا۔ نکی گیارہویں درجے کی طالبہ تھی۔ کچھ مہینوں پہلے تنویر بیگم اپنے جیٹھ کے بیٹے یوسف کو بھی اپنے یہاں لے آئی تھیں کہ وہ کچھ شرارتی واقع ہوا تھا اور تنویر چچی سے بہ نسبت اپنے والدین کے زیادہ مانوس تھا۔

''نکی باجی آپ خود تو پڑھ نہیں رہیں۔۔۔'' یوسف نے سر ذرا اونچا کر کے نکی کی نوٹ بک دیکھنے کی کوشش کی۔

''شاعری کر رہی ہوں گی نکی باجی۔'' یاور نے بغیر سر اٹھائے کہا۔

''تم لوگ میرے استاد ہو یا میں تمہاری۔ چپ چاپ اپنا کام کرو۔۔۔ ورنہ ایک ایک تھپڑ۔۔۔''

''آج تو آپ یوسف بھائی کے ایک تھپڑ جڑ۔۔۔''

''چپ بے ایک تھپڑ کے بچے۔۔۔ نکی باجی صرف دھمکاتی ہیں۔۔۔ ماریں گی تھوڑے ہی۔۔۔''

''اب جس نے بات کی نا۔۔۔ تو ساری دھمکیاں سچ ہو جائیں گی۔ سمجھے تم

لوگ۔۔۔اتنا اچھا شعر ہوا ہے۔۔۔مگر تم لوگ سوچنے کی مہلت دو تو نا۔۔۔''

''تو سنا دیجئے نا نکی باجی۔۔۔پلیز۔۔۔ورنہ یوسف بھائی بڑے خالو سے کہہ دیں گے۔۔۔''

یاور اپنا چھوٹا سا گورا ہاتھ ہونٹوں پہ رکھ کر ہنسا۔نکی نے اس کی طرف نتھنے پھلا کر اور آنکھیں سکیڑ کر دیکھا پھر دانت بھینچے۔شہادت کی انگلی ناک پر رکھی اور آواز بھاری کر کے کھنکھارا کی۔

''خاموش۔۔۔''اس نے سر جھٹک کر کہا اور تینوں کھِلکھلا کر ہنس پڑے۔

نکی نے تازہ ترین شعر سنایا اور یاور نے ہاتھ لہرا لہرا کر داد دی:

چھوڑ جانے سے پہلے، تصور ترا

ہے مجھے بھی بتانا کہاں چھوڑنا

''واہ نکی باجی۔یہ اسی غزل کا شعر ہے نا۔۔۔جو آپ نے کل سنائی تھی۔۔۔''

''ہاں اسی کا۔۔۔اور سنائی نہیں پڑھی، کہا جاتا ہے۔'' نکی نے یاور کو سمجھایا۔

یوسف نے نکی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں۔۔۔

اس سے پہلے، پڑے یہ جہاں چھوڑنا

وقت کی ریت پر کچھ نشاں چھوڑنا''

اور ترنم سے شعر پڑھا۔

''تم سمجھدار ہو۔۔۔ورنہ لوگ تو شعر کا تماشا بنا دیتے ہیں۔''

نکی نے ترچھی نظر سے یوسف کو دیکھا اور یاور کا گال تھپتھپا کر کہا۔

''اللہ۔۔۔اتنی سنجیدگی سے داد دی۔۔۔'' یوسف نے چہرے پر خفگی کے آثار طاری کرنے کی کوشش کی۔

یاور اور یوسف دونوں چچازاد بھائی تھے اس لیے صورتوں میں مشابہت ممکن تھی مگر

ان دونوں کے چہرے کافی حد تک ایک سے تھے۔ سیاہ گھنگھریالے بال، سرخ وسفید رنگت، متناسب دانت اور نیلی نیلی پتلیاں۔ دو چیزیں البتہ الگ تھیں کہ یوسف کا قد یاور سے کوئی دوفٹ زیادہ تھا بلکہ وہ تو نکی سے بھی فٹ بھر لمبا تھا اور دوسرے اُس کی مونچھیں اگ آئی تھیں اور کہیں کہیں داڑھی بھی۔

اس دن شہر کے سب سے بڑے چوک میں بم پھٹا تھا۔ کچھ فوجی جوان زخمی ہوئے تھے۔ کچھ عمارتیں جلی تھیں۔ ہر روز اسی طرح کا کچھ نہ کچھ ہوا کرتا تھا۔ سکون کی لے پر بہتے وقت میں کچھ ایسا انتشار اُٹھا کہ آٹھوں پہر اتھل پتھل ہو گئے۔

یوسف نکی کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس کے گھر کو مُڑنے والے موڑ پر دھواں اڑتا دکھائی دیا۔ لوگ بے تحاشا ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چوڑی سڑک کی دوسری جانب بستی تھی اور اس طرف قبرستان۔ دور سے بکتر بند گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ تیزی سے سڑک پر سے غائب ہو رہے تھے۔ گولیوں کی آوازیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔

بھاگتے ہوئے لوگوں میں سے ایک معلوم نہیں کیسے گر گیا۔ اس کے پیچھے سے آ رہی فوجی گاڑی میں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ یوسف نے ایک لمحے کے کسی حصے میں دیکھا کہ گرے ہوئے آدمی کے بالکل قریب کوندا سا لپکا تھا اور گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ پھر سڑک پر گرا آدمی کوئی فٹ بھر اُچھلا اور دوبارہ سڑک پر آ رہا۔ یوسف سڑک کے کنارے کی طرف بھاگا۔

اس نے مضبوطی سے نکی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

یہ سب نکی نے بھی دیکھا تھا۔

سڑک کا کنارہ ختم ہوتے ہی ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں چند قدم اور نیچے کو بھاگے اور منڈیر کے ساتھ لگ گئے۔ نکی نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ ہچکیاں اس کے سینے میں گھٹ رہی تھیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ یوسف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے بٹھا دیا۔

کئی منٹوں تک وہ دونوں ہانپتے رہے۔ پھر ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔
نکی نے آنکھیں بند کرلیں اور سر پیچھے کو ڈھکا دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی سانسیں معمول پر آ گئیں۔ یوسف نے دیکھا کہ سامنے وسیع و عریض قبرستان کے احاطے میں کچھ قبریں ہیں اور بیشمار نرگس کے پھول کھلے ہیں۔

''نکی باجی۔۔۔ آپ کی رنگت بالکل یمبرزل جیسی ہے۔ یمبرزل کے پھولوں جیسی ہے۔ اگر آپ کا نام یمبرزل ہوتا تو بہت اچھا لگتا۔ جسے یہ لفظ سمجھ میں نہ آتا وہ آپ کو نرگس بلا سکتا تھا۔۔۔ ہے نا۔۔؟'' یوسف ساکت بیٹھا سامنے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔
نکی نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بائیں جانب گردن موڑ کر اسے حیرت اور اداسی سے دیکھا۔
''تمھیں موت کے سناٹے میں زندگی کی باتیں کیسے سوجھتی ہیں یوسف؟'' وہ بیبس سی ہو کر بولی۔

''کتنے قریب تو ہیں دونوں۔۔۔ زندگی اور موت۔۔۔ دیکھا نہیں آپ نے۔۔۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔ منڈیر کی اس طرف سڑک پر کوئی آہٹ ہوئی تو یوسف نے سر ذرا سا اوپر اچکا کر دیکھا۔۔۔ سڑک پر گرا آدمی اٹھ گیا تھا اور لنگڑاتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دوسرا کندھا تھام رکھا تھا۔
''وہ دیکھئے۔۔۔ وہ دیکھئے نکی باجی۔۔۔ میں نے سچ کہا تھا نا۔۔۔'' یوسف بولا تو نکی نے جھانک کر دیکھا۔
''اللہ۔۔۔ تیرا شکر۔۔۔ تو پھر وہ۔۔۔ یہ۔۔۔ وہ گولی؟'' وہ اپنے گلے کے قریب ہاتھ رکھ کر بولی۔
''اس کے بازو میں لگی ہوگی۔۔۔ شانے میں۔۔۔'' وہ بولا۔
دونوں منڈیر سے لگے بیٹھے رہے۔
''نکی باجی۔۔۔ ایسا نہیں لگتا جیسے موت کا سکون سے کوئی گہرا رشتہ ہو۔ جیسے

موت ہی سکون کا دوسرا نام ہو۔۔۔زندگی، موت اور سکون۔۔۔سب کا مفہوم ایک ہو گیا ہو۔۔۔اس وقت ایسا نہیں لگ رہا۔'' اس نے نکی کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

''ہاں۔۔۔شاید۔۔۔'' نکی نے کچھ توقف سے کہا اور سامنے دیکھتی رہی۔

''نکی باجی۔۔۔'' اس نے کہیں دور سے پکارا حالانکہ وہ دونوں ساتھ لگے بیٹھے تھے۔

''ہوں۔۔۔'' وہ بغیر لب وا کیے بولی۔

''اگر اس وقت کوئی ہم پر بندوق تان دے تو۔۔۔؟''

''تو۔۔۔؟ کیا؟'' اس نے گردن موڑ کر یوسف کے چہرے کو دیکھا۔

''تو ہمیں جان بچانے کے لیے بھاگنا چاہئے کیا۔؟'' یوسف نے پرسکون لہجے میں کہا۔

کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

''نہیں۔۔۔'' کچھ دیر بعد نکی نے اسی لہجے میں جواب دیا اور کچھ اور پل اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک لمبی سانس بھر کر سر پیچھے ٹکا دیا۔ دونوں کے ہونٹوں پر ایک ابدی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب آگے پیچھے نتیجہ آیا تو نکی چوری چھپے شعر کہنے کے باوجود بہت اچھے نمبر لائی۔ یاور کے بھی اچھے نمبر تھے۔ یوسف بس پاس ہو گیا۔

''اچھی طرح تو حل کر لیتے تھے تم سارے سوالات پھر حساب میں کم Marks کیوں آئے۔۔۔اسی لیے ڈویژن اچھی نہیں آئی۔ اب تمھیں تمہاری پسند کے مضامین نہیں ملیں گے۔ اب پڑھنا۔۔۔سمجھے۔'' نکی نے اس کا کان دھیرے سے پکڑا اور چھوڑ دیا۔

مطالعے کا کمرہ دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔

''Maths کے پرچے کے دوران آپ کی بہت یاد آئی نکی باجی۔۔۔وہ آخری پرچہ تھا نا۔۔۔آپ اس سے پچھلی شام کو گھر جا چکی تھیں تو میں۔۔۔میں۔۔۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ الٹے ہاتھ پر ٹپ سے ایک آنسو گرا۔

تین چار سال سے لگا تار چلتا آ رہا تناؤ۔ اس سال بھی زوروں پر تھا۔ ہر خطۂ زمیں کی طرح اس وادی نے بھی اپنے حصے کے اتار چڑھاؤ جھیلے تھے۔

چاہے ہزاروں برس راج کرنے والے ہندو راجاؤں کے دور میں یا طلوعِ اسلام کے بعد ایک ہی خاندان کے سلاطین کشمیر کی سینکڑوں برس کی حکومت میں، یا پھر سلطان زین العابدین کے بعد خانہ جنگیوں سے نجات دلانے والے چک بادشاہوں کے دور میں، ہر بدلتے منظر نامے نے تاریخ کے پنوں پر سرخ حاشیے کھینچے۔ مگر اس بار ایک عجیب سی بےچینی تھی جو کسی طرح قرار نہیں پا رہی تھی۔۔۔ اور زندگی پھر بھی رواں تھی۔

''اس بار سب محنت کریں گے۔۔۔ خود میرا بارہویں کا Exam ہے۔۔۔ اور وہ بھی سائنس۔۔۔ ماماں سنتی ہی نہیں میری بات۔۔۔ مجھے بھی محنت کرنا ہے بہت۔۔۔''

نکی نے ناک سکیڑ کر گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔

''آپ ڈاکٹر بنیں گی۔۔۔ نکی باجی۔۔۔؟ یوسف دھیمی آواز میں بولا۔

''اور کیا۔۔۔ سب ہی پیچھے پڑے ہیں میرے۔۔۔ میں تو آرٹس پڑھنا چاہتی ہوں۔۔۔ چاہتی تھی۔۔۔''

''اور؟ میں۔۔ کیا کروں گا نکی باجی۔۔۔؟'' اُس کی آواز میں افسردگی سی تھی۔

اس نے بال پوائنٹ کا پچھلا حصّہ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور جھکے ہوئے سر اور اٹھی ہوئی نظروں سے نکی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''تم کچھ اچھے مارکس لاتے تو تمھارا ایڈمیشن کامرس میں تو ہو ہی جاتا۔۔۔ اب بھی اگر تم محنت کرو اور اگلے سال بارہویں میں اچھے نمبرات لے آؤ تو کالج میں تم کامرس لے سکتے ہو۔ پھر MBA وغیرہ کر کے تمھارا کریئر۔۔۔''

''میں ویسے بھی ابو کا سارا کاروبار سنبھالنے والا ہوں۔۔۔'' وہ جیسے بے خیالی میں بولا۔

''مگر Qualified ہو کر سنبھالو گے تو پڑھے لکھے کہلاؤ گے۔۔۔ سب کی نظروں

میں۔۔۔تم محنت کرنا نا۔۔۔"

نکی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر قلم اس کے منھ سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ورنہ پھر۔۔۔جانے نکی باجی کہاں ہوں۔۔۔اور آپ کہاں ہوں۔"

یاور نے پریشان سے لہجے میں دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا۔۔۔دونوں اسے خاموش دیکھتے رہ گئے۔ وہ دوبارہ اپنی نوٹ بک پر جھک گیا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کچھ سیکنڈ یا کچھ منٹ یوں ہی گزر گئے۔ پھر نکی سر جھکا کر اپنی کتاب کو دیکھنے لگی۔ میں محنت کروں گا۔۔۔نکی باجی۔۔۔"

یوسف نے خالی خالی سی آواز میں کہا۔

"یوسف بھائی بول تو ایسے رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں میں محنت کیسے کروں نکی باجی۔۔۔میرے پاس اچھے کاموں کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔"

باہر شور مچاتی ہوئی ہوا چلنے لگی۔ برآمدے کی طرف کھلنے والے بھورے رنگ کے دروازے پر ٹیپسٹری کا سفید اور بھوری بیلوں والا پردہ پھول کر کپا ہو گیا۔

"کیوں نہیں کریں گے۔۔۔محنت۔۔۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اور کیا۔ جانے ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہیں۔۔۔ جانتی ہیں نکی باجی۔۔۔ پچھلے سال Exam کے دنوں میں بغیر پڑھے پاس ہوئے ہیں یہ۔۔۔آپ تو سونے چلی جاتی تھیں۔۔۔یہ میرے ساتھ یہیں پڑھتے تھے نا۔ پڑھتے کیا تھے بس۔۔۔یوں ہی۔۔۔ ایک دن آدھی رات تک آپ کا PoseSide بنانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔۔۔نہیں بنا پائے تو کاغذ پھاڑ کر تھوڑا سا روئے۔ اس کے بعد کتاب ہاتھ میں لی۔ اسے غور سے دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ۔۔۔سو گئے۔۔۔ہاہا۔۔۔ہی ہی ہی۔۔۔"

اس دوران نکی چپ چاپ نوٹ بک کی ورق پلٹتی رہی۔ اس نے دفعتاً بالکنی کی طرف دیکھا۔

''آج برف گرے گی۔۔یاور۔۔۔یہ دونوں تکیے دروازے کے ساتھ لگا دو۔۔۔
اف کتنی زوروں کی ہوا چل رہی ہے۔''

''پردہ پھولتا ہے تو الہ دین کا جن لگتا ہے۔ہے نا۔۔۔یوسف بھائی۔''

اس رات جھیل ڈل میں واقع دو جزیروں میں سے ایک جزیرے کے بیچ ایستادہ چار چناروں کے درمیان دیودار کی لکڑی کے خوبصورت ریستوراں میں کسی نے آگ لگا دی تھی۔سڑک کے اس پار سرکاری مڈل سکول کی عمارت بھی جل رہی تھی۔

''کرفیو لگا رہا تو کہیں ہمارے Exams اب Postpone ہی نہ ہو جائیں۔''
یوسف نے کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یوسف بھائی، آپ کی آواز سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ آپ کو تشویش ہو رہی ہے یا آپ امید کر رہے ہیں۔۔۔''یاور نے بغیر سر اوپر کیے کہا۔یوسف ہلکے سے مسکرا دیا تھا اور نکی کچھ اونچی آواز میں ہنسی تو اس کی یوسف کے زاویئے سے نظر آنے والے کان کی بالی جھِل مِل کرتی ہلنے لگی۔پھر اس نے سر جھکا لیا۔

''ایسے تو وقت ضائع ہوگا۔۔۔''نکی نے کہا اور کچھ فکر مند سی نظر آنے لگی۔

''کچھ دن اور پڑھ لیں گے نا۔۔۔''یوسف نے آہستہ سے کہا۔

باہر ایک زور کا دھماکہ ہوا اور اوپر ٹین کی چھت کے نیچے، پتے ہوئے فرش پر مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے دو شیشے چھناک سے ٹوٹ کر گرے۔نیچے کمرے میں تینوں طالب علموں نے بیک وقت اوپر سیلنگ کی طرف دیکھا۔لکڑی کے یکساں جسامت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جوڑ کر بنائے گئے بے شمار دائروں والی ہشت پہلو ختم بند سیلنگ پر بھورے رنگ کا وارنش ہلکا سا چمک رہا تھا۔

''چھت پر شیشہ ٹوٹا ہے کوئی۔۔۔''یاور سیلنگ کی طرف دیکھتا رہا۔

''کسی نے کھڑکی کھلی رکھ چھوڑی ہوگی۔۔۔''اس نے یوسف کی طرف دیکھا۔

''بتا دوں کیا۔۔۔یوسف بھائی۔۔۔نکی باجی کو۔۔۔''یاور نے کہا تو یوسف کے

چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا۔ اور پھر اس نے واپس اپنے چہرے پر نارمل سے تاثرات لاتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نظر جما دیں۔ جہاں سفیدے کے درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں، جنھوں نے ہریالی جھٹک کر برف اوڑھ لی تھی۔

''درخت ایسے نہیں نظر آ رہے جیسے مردے کفن اوڑھ کر کھڑے ہو گئے ہوں۔''

یوسف نے قہقہہ لگایا۔

''بات کیوں ٹال رہے ہیں یوسف بھائی۔۔۔ چھت کی پچھلی کھڑکی کے پاس ابھی بھی کرسی پڑی ہے۔۔۔ جس پر بیٹھ کر جناب چاند کو دیکھ دیکھ کر۔۔۔ سگریٹ۔۔۔''

یاور نے نکی کی طرف دیکھا۔

''سگریٹ۔۔۔'' نکی کانپ سی گئی۔ یوسف نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا اور ہاتھ میں پین لیے کتاب کے چھپے ہوئے حصے کے اطراف سکیچ بناتا رہا۔ کناروں کے قریب ابھی کافی جگہ بچی ہوئی تھی جہاں وہ مزید کچھ چیزیں بنا سکتا تھا۔

''پرابلم کیا ہے تمہاری۔۔۔ یوسف۔۔۔؟'' نکی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ اس کے لہجے میں غصے سے زیادہ حیرت اور بیچارگی عیاں تھی۔

''اگر آپ مجھ سے چھوٹی ہوتیں نکی باجی تو کیا ڈانٹتیں مجھ کو۔۔۔؟ یہ بھی تو ایک پرابلم ہے۔ میں اگر آپ سے بڑا ہوتا تو میرا Future پہلے طے ہو جاتا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔'' یوسف کی بات ادھوری رہ گئی کہ نئے آئے ملازم نے ہتھیلی سے زور زور سے کواڑ کھٹکھٹایا۔

''بی بی جی کھانے کے لیے بلاتا۔۔۔'' وہ بڑی بشاشت سے ٹوٹی پھوٹی اردو بولا۔

''تو کیا ہوتا مستقبل کا پتہ چل جانے سے۔۔۔'' نکی نے گردن خم کی۔

''اصل میں نکی باجی، ان کو لگ رہا ہے کہ آپ آگے آگے بھاگ رہی ہیں اور یہ پیچھے بھاگتے ہوئے گر گر کر اٹھ رہے ہیں۔۔۔ آپ Distinction لا رہی ہیں اور یہ بمشکل پاس ہو پاتے ہیں۔۔۔ خدانخواستہ کہیں فیل ہو گئے۔۔۔ تو۔۔۔ پھر۔۔۔''

''تو پھر۔۔۔ اور چھوٹا ہو جاؤں گا آپ سے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ میرا دل۔۔۔ ہی نہیں لگتا۔۔۔ پڑھنے میں۔۔۔''

''اب زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔۔۔ پچھلے سال 10th تک تو اوّل آتے تھے۔۔ اصل میں مجھے ہی پڑھانا نہیں آتا۔۔۔ میں اب تم لوگوں کو۔۔۔ آج کے بعد۔۔۔'' یاور نے جھٹ سے کتاب بند کی۔

''نہیں نہیں نکی باجی۔۔۔ یوسف بھائی کی غلطی کی سزا مجھے کیوں۔۔۔ میں تو نہایت شریف آدمی ہوں۔۔۔ محنتی بچہ ہوں۔۔۔ اچھا بچہ۔۔۔''

''بالکل، بالکل اس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں۔'' یوسف نے ہاتھ بڑھا کہ اس کا پہلو گدگدایا تو انگڑائی کے لیے اٹھی ہوئی باہیں ،گرا کر وہ زور سے ہنسا۔

امتحان ختم ہوئے تو نکی نے بے شمار صفحے سیاہ کر دیئے۔

کالی کالی یہ تقدیر نیلی نیلی وہ آنکھیں

یا

خواب میرے ہیں کتنے ہر جائی
تیری آنکھوں میں جا کے رہنے لگے

وغیرہ قسم کے۔۔۔ اور نہ جانے اور کیا کیا۔

اس دن سورج کی کرنیں چمکیلے آسمان سے ہوتی ہوئی باغیچے میں گر رہی تھیں۔ ٹین کی، ڈھلوان ساخت کی چھت سے برف پگھل پگھل کر بوندیں بن ٹپکتی رہی۔ ہوا کچھ تیز چلنے لگتی تو یہ بوندیں زمین پر گرنے سے پہلے جم جم جاتیں اور فقط کوئی مہین سا قطرہ گرتا، باقی پانی کی مخروطی نلیوں کی صورت رہ جاتیں۔

اونچی دیوار کے باہر سرکاری مکانوں کی قطاروں کے درمیان بنے چھوٹے سے راستے پر بچے سائیکل چلا رہے تھے۔ آج کرفیو نہیں تھا۔ نکی دھوپ میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں تبسم بیگم بھی آئی ہوئی تھیں اور تنویر خالہ کے ساتھ بیٹھی ساگ چن رہی تھیں۔

گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''ڈرائیور آ گیا۔۔۔بازار ہو آئیں ذرا۔۔۔ابھی تین گھنٹے کرفیو نہیں لگیگا۔''

تنویر بیگم گیٹ کی طرف پلٹ کر بولیں۔ جہاں ڈرائیور نہیں یوسف ہاتھ میں چابی لیے اندر داخل ہوا۔

''ارے۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ اٹھارہ کا تو ہو جا پہلے۔۔۔'' تنویر بیگم کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''اتنی اچھی تو چلاتا ہوں چچی۔۔۔ پھر میں نے تو کالونی کے اندر ہی ڈرائیو کیا نا۔۔۔'' وہ مؤدبانہ بولا۔

''اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔۔۔ تمھیں۔۔۔'' وہ دوبارہ ساگ چننے لگیں۔

''پھر میں اٹھارہ سے کم لگتا ہوں کیا۔۔۔'' اس نے نکی کے قریب جا کر اخبار اٹھاتے ہوئے تنویر بیگم کے پاس بیٹھ کر کہا۔

''نہیں۔۔۔ ماشاء اللہ وہ بات نہیں بیٹا۔۔۔مگر پھر بھی تمھیں۔۔۔'' تنویر بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جو بات غلط ہے۔۔۔ وہ غلط ہے۔ٹھیک کہتی ہیں تنویر۔۔۔'' نکی کی ماں نے ساگ کے بڑے سے ہرے ہرے پتے پر سے ہرے رنگ کا چھوٹا سا رینگنے والا کیڑا اٹھا کر باغیچے کی سوکھی گھاس والی بھیگی زمین پر پھینکا۔ دیوار پر سے ایک مینا نیچے اڑ آئی اور کیڑے کو چگ کر پھر اوپر کی طرف اڑ گئی۔

''اوئی۔۔۔ ماماں۔۔۔'' نکی نے جھرجھری سی لے کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

''مطلب۔۔۔؟'' تبسم بیگم کی تیوری چڑھ گئی۔

''ڈرتی ہو۔۔۔؟ کیڑوں سے۔۔۔؟'' تبسم بیگم نے حیرت، حقارت اور تشویش کو نہایت کمال سے اپنے لہجے میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے نتھنے پھول گئے تھے۔

''تم Frog کو Dissect کرتی ہو Lab میں۔۔۔؟'' انھوں نے آنکھیں

پھیلا کر منھ ادھ کھلا چھوڑ دیا۔

''کل کو Human Body کو کیسے Dissect کرو گی تم۔۔۔ بولو۔۔۔؟''

انہوں نے سر پکڑ لیا۔

''میری امیدوں پر پانی پھیر دو گی۔۔۔ میرا ادھورا خواب پورا نہیں کرے گی یہ لڑکی۔۔۔ یہ ڈرپوک لڑکی۔۔۔ مجھے پہلے ہی خدشہ تھا اس کی طرف سے۔۔۔'' انھوں نے تنویر بیگم کی طرف دیکھ کر آواز میں دکھ بھر کر کہا اور جلدی جلدی پلکیں جھپکنا شروع کیں، گویا آنسو پی رہی ہوں۔ پھر سر کو مزید جھکا کر ساگ بیننے لگیں۔ سب انہیں خاموش دیکھتے رہے۔

''نہیں۔۔۔ ماماں۔۔۔ جو آپ کہیں گی۔۔۔ میں وہی کروں گی۔'' نکی روہانسی ہو کر بولی۔ یوسف نے اخبار کا صفحہ پلٹا۔

اگلے برس جس دن برفانی طوفان نے بہت سے درختوں اور کئی مکانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اُس دن تک اور بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

امتحانوں کے نتائج آ چکے تھے۔ یاور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر نئی جماعت میں آدھا برس گذار چکا تھا۔ یوسف فیل ہو گیا تھا اور اس کے گھر والے اس سے نالاں تھے۔ نکی ماماں کی نگرانی میں Entrance کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

پڑھنے کے کمرے میں یوسف اور یاور رہ گئے تھے۔

''نکی باجی کو یہاں بیٹھ کر کتنا اچھا لگتا ہو گا۔'' یاور نکی کی جگہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''تم اپنی جگہ بیٹھو نا۔۔۔ بڑوں کی جگہ نہیں بیٹھتے۔۔۔ اگر اس وقت نکی باجی آ گئیں تو کیا سوچیں گی کہ میری جگہ بیٹھ گیا ہے یاور۔۔۔ شاید نہیں چاہتا کہ میں کبھی آ کر پھر اس جگہ بیٹھوں۔'' یوسف نے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا تو یاور اچھل کر اپنی نشست پر پہنچ گیا جیسے اس کی نکی باجی آ ہی گئی ہوں۔

''ارے باپ رے۔۔۔ Sorry یوسف بھائی۔۔۔''

یوسف لمبے سے رجسٹر پر جھک گیا۔

نکی کے بائیں کان کی بالی جھل مل کرنے لگی۔

بالوں کی لٹ نے آدھا رخسار چھپالیا۔

نکی دانتوں میں قلم دبائے، پھولوں والے ہیئر بینڈ میں بال سمیٹ رہی ہے۔

رجسٹر کے تین صفحوں پر حساب کا ایک ہی سوال حل کیا گیا ہے۔ایک سیاہ روشنائی سے۔۔۔نکی کے ہاتھوں۔ دوسرے دو صفحوں پر یہ ہی سوال یوسف نے حل کرنے کی کوشش کی ہے جس پر نکی نے سرخ قلم سے تصحیح کی ہے۔ صفحے کے کنارے پہ دو آنکھیں بنی ہیں۔ ابھی ابھی یوسف نے پنسل سے بنائی ہیں۔کالی کالی پتلیوں والی دو آنکھیں۔

نیلی آنکھوں میں پانی تیر رہا ہے۔۔۔اگر پلک جھپک دی گئی تو۔۔۔آنسو چہرے پر اگی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں سے ہوتا ہوا گردن پر بہہ نکلیگا۔۔۔اور کہیں یاور دیکھ لے تو۔۔۔اس کا دل اُداس ہوجائیگا۔

لیکن یاور نے یوسف بھائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔

مختصر سی غلام گردش میں یاور کی باتوں کی آواز گونجی تو زینے پر نکی کے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی آواز اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر آتی ہوئی ماں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔"MaamaSorry"

"ابھی چوٹ لگ جاتی تو؟ کل آخری پرچے کے دن تم۔۔۔"

"تو Rest کر لیتی ماماں۔۔۔میری ساری Preparation تو ہو چکی ہے آج تو میں کئی گھنٹے کی نیند بھی Afford کر سکتی ہوں۔۔۔ یہ جناب کدھر سے راستہ بھول گئے۔۔۔" وہ مسکراتی ہوئی بولتی چلی گئی۔

"اللہ نے میری سن لی۔۔۔خالہ۔۔۔" یاور نے تبسم بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ نکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ابروؤں کے درمیان ایک لکیر کھنچی تھی۔تبسم بیگم اس کی طرف پلٹیں تو وہ نکی باجی کو دیکھنے لگا۔

''اسلام وعلیکم نکی باجی۔۔۔آنکھوں کے گرد کے گڈّھے بتا رہے ہیں کہ خوب پڑھائیاں ہورہی ہیں۔۔۔ بلکہ ہوچکی ہیں۔۔۔کچھ اپنا یہ چھوٹا سا بھائی بھی یاد ہے۔۔۔کل میرا Maths کا Exam ہے۔۔۔'' وہ فکرمند نظر آنے لگا۔

''صرف ایک گھنٹہ چاہیئے آپ کا نکی باجی۔۔۔آپ اپنی books لے چلیئے۔۔ وہیں Revise کر لیجیئے گا۔۔۔'' وہ تبسم بیگم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''خالہ آج نکی باجی کو بھیج دیں میرے ساتھ۔۔۔قسم سے بالکل کچھ نہیں آتا مجھے۔۔۔فیل ہوجاؤں گا خالہ۔۔۔رہی سہی عزت خاک میں مل جائیگی۔''

''چپ۔۔۔بدمعاش کہیں کا۔۔۔تو تو ماشاءاللہ خود قابل لڑکا ہے۔اس کا تو بیٹا Last۔۔۔''

''خالہ آپ یقین کریں یہ آٹھویں درجے کا Maths اس قدر مشکل ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور پھر نکی باجی بے چاری جیسے قید بامشقت کاٹ رہی ہیں۔ان کی بھی کچھ Outing ہوجائیگی۔۔۔امّی نے تاکید کی تھی خالہ۔۔۔کہ نکی باجی کو کچھ روز کے لیے ساتھ لے آؤں۔۔۔امی نے انھیں خواب میں دیکھا تھا۔۔۔یاد کر کے تڑپ رہیں تھیں۔۔۔ آپ کو میرے سر کی قسم خالہ۔۔۔''

یاور نے تبسم بیگم کا ہاتھ جھٹ اپنے سر پر رکھ لیا۔

تنویر بیگم نے نکی کو گلے سے لگایا تو وہ ان کی باہوں میں جیسے غائب سی ہوگئی۔

''میری بچی۔۔۔میری جان۔۔۔ یہ کیا مصیبت ہے یہ Entrance۔اف ننھی سی جان۔۔۔''

نکی ان کے سینے سے لگی رہی۔تنویر خالہ کے پیچھے کوئی چھ قدم کے فاصلے پر ادھ کھلے دروازے کی دہلیز میں کھڑے یوسف کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔خالہ کے کندھے کے اوپر سے ہوکر نکی کی نگاہیں جب اس سے ملیں تو وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔پھر دبیز سرخ قالین پر دو قلابازیاں کھائیں اور نکی کی نشست کے تکیے کا غلاف درست کرنے لگا۔

اس رات ساتویں کے چاند کی پھیکی چاندنی میں ٹین کی چھت والا مکان ہلکی ہلکی چمک بکھیرتا پرسکون سو رہا تھا۔

صرف پڑھنے کا کمرہ روشن تھا۔

یاور پڑھتے پڑھتے حساب کی کاپی پر رخسار رکھ کر سو گیا۔

''صرف دس منٹ تک آرام کر سکتے ہو۔۔۔تم؟ نکی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔اس نے دھیرے سے آنکھیں نیم وا کیں اور پھر موند لیں۔''پھر دو آخری سوال۔۔۔ اور چھٹی۔۔۔تمہاری تیاری مکمل ہے۔۔۔''وہ بولی۔یاور نیند کے جھونکوں کے درمیان ایک پل کو ہلکے سے مسکرایا اور دوسرے پل کمرے میں اُس کے چھوٹے چھوٹے خراٹے گونجنے لگے۔

وہ دونوں اسے چپ چاپ دیکھتے رہے ان کے چہروں پر بھی ایک پرسکون سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''اب۔۔۔کیا کرو گے۔۔۔یوسف۔۔۔''نکی کا چہرہ اداس ہو گیا۔

''اب کیا ہوگا۔۔۔نکی باجی۔۔۔۔اب کیا ہو سکتا ہے۔۔۔۔آپ۔۔۔۔ آپ۔۔۔''دور کہیں مشین گن نے لگاتار کئی گولیاں برسائیں۔

باغیچے میں ایستادہ سفیدے کے درختوں میں کوّے یہاں وہاں اُڑ کر کائیں کائیں کرنے لگے۔کچھ دیر بعد ماحول پر دوبارہ سکوت چھا گیا۔

''میں اور پیچھے رہ گیا نکی باجی۔۔۔ہم ساتھ نہیں چل سکیں گے نا۔۔۔اب۔۔۔ اور کوئی راستہ نہیں نا۔۔۔اب اور کچھ نہیں ہو سکتا نا۔۔۔۔ہے نا۔۔۔نکی باجی۔۔۔''

یوسف کی آواز کا کرب واضح ہو گیا تھا۔نکی نے سر بہت زیادہ جھکا لیا تھا۔وہ سوئے ہوئے یاور کے بالوں میں انگلیاں پروتی رہی۔آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کے حلق کے قریب دوپٹے میں جذب ہوتے گئے۔

''آپ کچھ نہ بولیں گی نکی باجی۔۔۔میں جانتا ہوں۔۔۔''اس کی تھکی ہوئی آواز میں شکوہ ہی شکوہ تھا۔

''مگر میں بھی۔۔نہیں رہوں گا۔۔۔نکی باجی۔۔'' اُس کی آواز یکایک تیز ہوگئی۔

''چلا جاؤں گا۔۔۔میں۔۔۔'' آواز پھر مدھم ہوگئی تھی۔نکی نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پریشان پریشان سے چہرے پر ویران ویران سی آنکھیں۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ داڑھی کچھ گھنی ہوگئی تھی۔ اتنی کہ سرخ وسفید چہرے پر ایک سیاہ حاشیہ بنا کر اسے مزید خوش شکل بنا رہی تھی۔

آنسو بہہ نکلے تھے۔

''چلا جاؤں گا۔۔۔دور۔۔۔آپ سے۔۔۔اتنا دور کہ۔۔۔کہ۔۔۔'' اس نے دبی دبی سی ہچکی لی۔نکی نے بے اختیار اپنے گلے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے اس کا دم گھٹنے لگا ہو۔

''نہیں۔'' وہ آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

''نکی باجی میں۔۔۔ملِٹنٹ بن جاؤں گا۔۔۔دنیا چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں۔۔۔پاگل ہوگئے ہو کیا۔۔۔یہ سب کیا کہہ رہے ہو۔'' نکی تڑپ کر بولی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم تنویر خالہ سے۔۔۔اگر بات کرو۔۔۔تو۔۔۔وہ ہم دونوں کو کتنا عزیز رکھتی ہیں۔'' نکی نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''ماماں کو سمجھا سکتی ہیں۔۔۔ہیں نا؟''

''ہاں۔۔۔شاید۔۔۔شاید۔۔۔'' بجھی بجھی آنکھوں میں امید کی قندیل سی روشن ہوئی۔

جس دن نکی کی ماں نکی کی کامیابی کی خوشیاں منا رہی تھی۔اُس دن نکی پتھر کی طرح خاموش ہوگئی تھی۔

اسی دن یوسف نے تنویر خالہ سے بات کی تھی۔اور تنویر خالہ کچھ لمحوں تک کچھ بھی نہ بولی تھیں۔ یوسف کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھیں کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی کہ تنویر بیگم خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگیں۔لیکن پھر اس

کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکرائیں۔

''وہ تو تمھاری بڑی بہن ہے بیٹا۔۔۔ مذاق کرتے ہو اپنی چچی سے۔؟ وہ بھی ایک بیجوڑسی بات کے لیے۔ اس کی ماں۔ میری زبان سے کہیں ایسا سن لے۔ تو مجھے زندگی بھر معاف نہ کرے۔ جانتے ہو تم ان کا مزاج۔۔۔'' انھوں نے چولہے پر چڑھی نمک والی چائے سے بھرے تانبے کے گول پیندے والے پتیلے میں ذرا سا جھانکا۔ اور چائے کا رنگ جانچنے کے لیے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں گھمانے کے بعد اس میں چائے بھر بھر کر واپس ڈالتی رہیں۔ جالی والے دستے کے اندر پڑی کنکریاں، اوپر نیچے ہونے سے چھن چھن بجنے لگیں۔ کفگیر پتیلی کے کناروں پر ٹکا کر تبسم بیگم ریفریجریٹر کی طرف دودھ لینے کو بڑھیں۔ اس دوران انھوں نے یوسف کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ ''جانتی ہوں میرا بیٹا مجھے ایسے امتحان میں کبھی نہیں ڈالیگا۔'' انھوں نے دودھ کے ساتھ چائے کی پیالیوں میں ڈالنے کے لیے بالائی کی کٹوری نکالی اور یوسف کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ دیوار سے لگا انھیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو میں چائے لا رہی ہوں۔۔۔۔۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔ اور ملازم کو دسترخوان بچھانے کے لیے آواز لگائی جو گھر کے پچھواڑے باڑی میں پتہ گوبھی کے لمبے پتے توڑ توڑ کر رات کے کھانے میں بننے والے کسی سالن کے لیے بید کی ٹوکری میں جمع کر رہا تھا۔

تنویر بیگم جب ملازم کو آواز لگا کر کھڑکی سے پلٹیں تو دیکھا کہ یوسف جا چکا ہے۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔ اندرونِ شہر، ہر گھر میں چھاپے پڑے تھے۔

خطا وار دھماکے کر کے غائب ہو گئے تھے اور بے گناہوں کو غالباً غلط مخبری کی وجہ سے دھڑ ادھڑ پکڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ہوسٹل سے چھٹیوں میں گھر لوٹے دو بھائیوں کو ان کے والدین کے سامنے دہشت گردی کے الزام میں گولیاں ماردی گئی تھیں۔ غصے یا غلط فہمی یا کسی اور انجانی وجہ سے۔

''مگر میں بھی۔۔نہیں رہوں گا۔۔۔نکی باجی۔۔''اُس کی آواز یکا یک تیز ہوگئی۔
''چلا جاؤں گا۔۔۔ میں۔۔۔'' آواز پھر مدھم ہوگئی تھی۔ نکی نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پریشان پریشان سے چہرے پر ویران ویران سی آنکھیں۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ داڑھی کچھ گھنی ہوگئی تھی۔ اتنی کہ سرخ وسفید چہرے پر ایک سیاہ حاشیہ بنا کر اسے مزید خوش شکل بنا رہی تھی۔

آنسو بہہ نکلے تھے۔

''چلا جاؤں گا۔۔۔دور۔۔۔آپ سے۔۔۔اتنا دور کہ۔۔۔کہ۔۔۔''اس نے دبی دبی سی ہچکی لی۔ نکی نے بے اختیار اپنے گلے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے اس کا دم گھٹنے لگا ہو۔

''نہیں۔'' وہ آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

''نکی باجی میں۔۔۔ملِٹنٹ بن جاؤں گا۔۔۔دنیا چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں۔۔۔ پاگل ہوگئے ہو کیا۔۔۔ یہ سب کیا کہہ رہے ہو۔'' نکی تڑپ کر بولی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم تنویر خالہ سے۔۔۔اگر بات کرو۔۔۔تو۔۔۔وہ ہم دونوں کو کتنا عزیز رکھتی ہیں۔'' نکی نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔ اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''ماماں کو سمجھا سکتی ہیں۔۔۔ ہیں نا؟''

''ہاں۔۔۔شاید۔۔۔شاید۔۔۔'' بجھی بجھی آنکھوں میں امید کی قندیل سی روشن ہوئی۔

جس دن نکی کی ماں نکی کی کامیابی کی خوشیاں منا رہی تھی۔ اُس دن نکی پتھر کی طرح خاموش ہوگئی تھی۔

اسی دن یوسف نے تنویر خالہ سے بات کی تھی۔ اور تنویر خالہ کچھ لمحوں تک کچھ بھی نہ بولی تھیں۔ یوسف کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھیں کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی کہ تنویر بیگم خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگیں۔ لیکن پھر اس

کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکرائیں۔

''وہ تو تمہاری بڑی بہن ہے بیٹا۔۔۔ مذاق کرتے ہو اپنی چچی سے۔؟ وہ بھی ایک بیجوڑ سی بات کے لیے۔ اس کی ماں۔ میری زبان سے کہیں ایسا سن لے۔ تو مجھے زندگی بھر معاف نہ کرے۔ جانتے ہو تم ان کا مزاج۔۔۔'' انھوں نے چولہے پر چڑھی نمک والی چائے سے بھرے تانبے کے گول پیندے والے پتیلے میں ذرا سا جھانکا۔ اور چائے کا رنگ جانچنے کے لیے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں گھمانے کے بعد اس میں چائے بھر بھر کر واپس ڈالتی رہیں۔ جالی والے دستے کے اندر پڑی کنکریاں، اوپر نیچے ہونے سے چھن چھن بجنے لگیں۔ کفگیر پتیلی کے کناروں پر ٹکا کر تبسم بیگم ریفریجریٹر کی طرف دودھ لینے کو بڑھیں۔ اس دوران انھوں نے یوسف کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ ''جانتی ہوں میرا بیٹا مجھے ایسے امتحان میں کبھی نہیں ڈالیگا۔'' انھوں نے دودھ کے ساتھ چائے کی پیالیوں میں ڈالنے کے لیے بالائی کی کٹوری نکالی اور یوسف کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ دیوار سے لگا انھیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو میں چائے لا رہی ہوں۔۔۔۔۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔ اور ملازم کو دسترخوان بچھانے کے لیے آواز لگائی جو گھر کے پچھواڑے باڑی میں پتہ گوبھی کے لمبے پتے توڑ توڑ کر رات کے کھانے میں بننے والے کسی سالن کے لیے بید کی ٹوکری میں جمع کر رہا تھا۔

تنویر بیگم جب ملازم کو آواز لگا کر کھڑکی سے پلٹیں تو دیکھا کہ یوسف جا چکا ہے۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔ اندرونِ شہر، ہر گھر میں چھاپے پڑے تھے۔

خطاوار دھماکے کر کے غائب ہو گئے تھے اور بے گناہوں کو غالباً غلط مخبری کی وجہ سے دھڑا دھڑ پکڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ہوسٹل سے چھٹیوں میں گھر لوٹے دو بھائیوں کو ان کے والدین کے سامنے دہشت گردی کے الزام میں گولیاں ماردی گئی تھیں۔ غصے یا غلط فہمی یا کسی اور انجانی وجہ سے۔

رہ رہ کر انسانی چیخیں کانوں میں پڑتیں تھیں۔اس رات شہر میں شاید ہی کوئی سویا تھا کہ موت کے آنے کے ڈر کے ساتھ ساتھ عزت کے جانے کا خوف بھی تھا۔

تنویر بیگم کے وہاں سے نکل کر یوسف اسی سڑک پر چل رہا تھا جہاں چوراہے کا ایک راستہ جھیل کی طرف جاتا تھا۔ایک پہاڑی کی طرف۔ایک شہر کے اندر والے علاقے کی طرف اور ایک نکی کے گھر کی طرف۔

اس سڑک سے گزرتے ہوئے اس کی رفتار غیر ارادی طور پر دھیمی ہوگئی۔

بیاختیار نگاہیں داہنی جانب ڈھلان کی طرف اٹھ گئیں۔بغیر گونجے ایک آواز سماعت تک آ گئی۔

تمھیں موت کے سناٹے میں زندگی کی باتیں کیسے سوجھتی ہیں یوسف۔

آج سے زندگی کی بات نہیں کروں گا نکی باجی۔۔۔

کاش اس دن کوئی بندوق تان دیتا۔۔۔ہم پر۔۔۔کتنی پرسکون۔۔۔کتنی حیات بخش موت ہوتی۔۔۔میں یوں۔۔۔زندگی سے بھاگ۔۔۔نہ رہا ہوتا۔۔۔مگر اب مجھے بھاگنا چاہیے یہاں سے۔۔۔مجھے۔۔۔بھاگنا۔۔۔چاہیے۔۔۔نکی باجی۔۔۔میں دور جا رہا ہوں آپ سے۔۔۔بہت دور نکی باجی۔۔۔بہت دور۔۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔۔۔ڈھلان کے اس طرف کنارے پر اُگی گھاس سوکھ کر بیرنگ ہوگئی تھی۔

وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا طویل سڑک پر چلا جا رہا تھا۔راستے میں کہیں کہیں دوکانیں تھیں جو بند ہو رہی تھی۔

ابھی تو اندھیرا ابھی نہیں ہوا۔۔۔تو پھر۔۔۔دکانیں کیوں بند۔۔۔

ہوا کریں۔اسے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔اس نے کچھ اور قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ سائرن کی تیز آواز کانوں سے ٹکرائی۔اس نے دائیں بائیں دیکھا بس یوں ہی بے خیالی میں شاید۔سڑک ویران تھی اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔سائرن کے بعد لاؤڈ

سپیکر پر کوئی اعلان ہوا۔ آواز دور سے آ رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سڑک ایک موڑ پر مڑ گئی۔ کچھ فاصلے سے بکتر بند گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ وہ ویسے ہی چلا جا رہا تھا۔

میں۔۔۔ جا رہا۔۔۔ ہوں۔۔۔ نکی باجی۔۔۔ میں۔

دفعتاً موڑ پر بائیں جانب کو بستی کے اندر جاتی ہوئی کچی سڑک پر کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر گلی میں کھینچ لیا۔

''کہاں جا رہے ہو۔۔۔ کرفیو میں۔۔۔ پاگل ہو گیا۔۔۔؟'' ایک داڑھی والا نوجوان تھا۔ اُس کے ساتھ تقریباً یوسف کی عمر کا ایک لڑکا تھا جس نے دونوں ہاتھوں میں گیندیں سی تھام رکھی تھیں۔ داڑھی والے نوجوان کے پاس ایک تھیلا تھا۔ جس میں کچھ سامان تھا۔ اس نے وہ تھیلا اُسی زینے پر رکھا تھا جہاں اس نے یوسف کو کھینچ کر بٹھا دیا تھا۔ زینہ کسی مکان کے پچھواڑے سے ملحقہ تھا جو ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ اس سے پہلے کہ یوسف کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتا، اس نے دیکھا کہ موڑ کے قریب پہنچنے سے بہت پہلے، اس کا ہم عمر لڑکا گاڑیوں کی طرف دوڑا اور دو گاڑیوں کو اپنی گیندوں کا نشانہ بنا کر ایک اور گلی کی طرف بھاگا۔۔۔ داڑھی والے نوجوان نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ فلک شگاف دھماکہ ہوا۔

''اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔'' نوجوان زیرِ لب بولا۔

''کک۔۔۔ کک۔۔۔ کیا ہوا؟'' یوسف بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''شاہباز شہید ہو گیا۔۔۔ وطن پر۔۔۔ قربان ہوا۔۔۔ دین پر قربان ہوا۔۔۔''

نوجوان نے بارعب سی آواز میں کہا۔ اور آسماں کی طرف اڑ رہے سیاہ دبیز دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

''آقا'' شاہباز اسی لمحہ گلی میں نمودار ہوا تھا۔

''تم۔۔۔ تم۔۔۔ شہید نہیں ہوئے۔۔۔؟'' وہ تعجب اور تاسف سے بولا۔

''نہیں۔۔۔ آقا۔۔۔'' شاہباز نے سر جھکا دیا۔

''کیوں بدنصیب۔۔۔'' اس نے داہنا ہاتھ ہوا میں اوپر سے نیچے کو لہرایا۔

''باقی کی Convoy بہت دور تھی۔۔۔میں کس پر کودتا۔۔۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''آہ بد بخت۔۔۔کیا اسی دن کے لیے ہم نے تمھیں شاہ باز کا خطاب دیا تھا۔ جب تک گاڑیاں سامنے آتیں خود دوڑ کر قریب چلے جاتے۔۔۔اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ فدا ہونے کے لیے دستی بم ایسے با اثر نہ ہوں گے۔ دوسرے ہوتے تو ہم خود ریموٹ سے کنٹرول کرتے۔۔۔اور اب تک تم جنّت میں ہوتے اور ان کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ تمہارے بعد جب تمہارے والدین انتقال کرتے تو وہ بھی جنت میں جاتے۔ کم سے کم اتنا تو سوچتے۔ وہیں ڈٹ جاتے گاڑیاں تو آ ہی جاتیں۔ دیکھو اس کے بعد کانوائی نے رخ موڑ دیا۔''

نو جوان نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اگر کوئی شہید ہوتا ہے تو کیا اس کے والدین جنت میں جاتے ہیں؟'' یوسف نے نو جوان کو خاموش ہوتے دیکھ کر فوراً سوال کیا۔

''ہاں۔۔۔بالکل۔۔۔ایسا ہی ہوتا ہے۔۔'' نو جوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''مگر میں نے تو ایسا کہیں نہیں پڑھا۔ حافظ کی ماں جنت میں جاتی ہے۔ وہ بھی اگر اُس نے خود اپنی اولاد کو حفظِ کلام اللہ کرایا ہو۔۔۔ورنہ میں نے کسی حدیث میں یہ نہیں پڑھا کہ۔۔۔'' یوسف نے تجسس سے کہا۔

''نادان ہو تم۔۔۔ جہاد کے راستے میں۔۔۔'' وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر خاصی گھمبیر آواز میں کچھ کہتے کہتے رُکا۔

''یہاں کریک ڈاؤن ہو گا۔ بھاگو۔ جلدی۔۔۔'' اُس کی آواز دفعتاً خوف سے بھر گئی۔ شاہباز پھرن کے اندر پہنی ہوئی واسکٹ کی جیبوں میں بھرے بم نکال نکال کر زینے پر رکھے تھیلے میں ڈال رہا تھا۔

''رہنے دو۔۔۔بعد میں نکال لینا۔۔۔پکڑے جائیں گے ورنہ۔۔۔'' نو جوان جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''راستے میں۔۔۔کہیں پھٹ گیا آقا۔۔۔تو؟''

''تم اتنے خوش نصیب کہاں ہو۔۔۔''نوجوان نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

''آقا میرا۔۔۔میرا مطلب تھا اگر غلط جگہ کہیں پھٹ گیا۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔خدانخواستہ آپ کو۔۔۔کہیں آپ۔''وہ ہکلایا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔تھیلا میں سنبھال لوں۔''یوسف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

نوجوان مسکرادیا۔

''مبارک۔صد مبارک۔''اس نے یوسف کو بغور دیکھا اور گلی کے اندر مڑ گیا۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔

وادی کے حالات ابتر ہوتے گئے۔کس نے اس سکون پر شب خوں مارا۔کوئی اپنے گھر میں تو ایسا نہیں کرتا۔کوئی باہر کا ہوگا۔مگر باہر کے بھی سب لوگ تو ایسی سوچ نہیں رکھ سکتے۔کچھ منفی سوچ والے افراد نادانی،غرور اور غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں گے کہ صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے اور کبھی بھی،کہیں بھی ہوسکتا ہے۔

اس خطے کے ساتھ سولہویں صدی سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔چندر گپت موریہ اور پھر اشوک کے مہان ہندوستان کو افغانستان اور نیپال کی آخری سرحدوں تک وسیع کرنے والی عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ کے شہنشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا،جب شاعر؟ معروف ومقبول اور ہر دل عزیز ملک کشمیر زون،یعنی چودھویں کا چاند''ملقب''حبہ خاتون کے شاعر بادشاہ یوسف شاہِ چک کو اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کرلیا تھا۔شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کر گیا۔وطن کی مٹی بھی اسے نصیب نہ ہوئی۔۔۔اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہوگئی۔ہجر کے نغموں سے بیاضیں سیاہ کردیں اور آخر کار اپنے یوسف کو پکارتے پکارتے حبہ خاتون نے بھی اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔وادی میں اس کے نغمے گونجتے رہے۔

'نادلائے،میانہِ یُوسُوفو ولوٗ'

(پکارتی ہوں میں تجھ کو مرے یوسف آجا)

اور گونجتے رہیں گے۔

پھر افغانستان سے افغان آئے۔

شامتِ اعمال سے افغان حاکم ہو گئے

آئے وہ اور طالع بیدار اپنے سو گئے

کسی شاعر نے احتجاجاً شعر کہا تھا۔ پھر پنجاب سے سکھ، کیا کیا ٹیکس لگائے گئے تھے۔ ان کے دور میں۔ اور پھر سات سمندر پار سے انگریزوں نے آ کر وادی جموں کے ڈوگروں کو فروخت کر دی۔ ایک 'native' کو دوسرے 'native' کا آقا بنا دیا۔ وہ بھی ایک تکلیف دہ دور تھا۔ کشمیریوں کو تو مطلق العنان مہاراجہ سے آزادی چاہئے تھی۔۔۔ سب نے جی بھر کے ظلم ڈھائے۔۔۔

نکی نے کتابوں میں یہ سب پڑھا تھا۔

کشمیری۔۔۔ محکوم ہی رہے۔۔۔ صدیوں۔۔۔

اب کہیں آدھی صدی بھر پہلے جمہوریت آئی۔۔۔ تو۔۔۔ کچھ سکون کے بعد پھر یہ بے سکون شب و روز۔ کیوں ہو رہا ہے یہ سب۔ کیوں۔۔۔

جانے کیوں آج اسے بالکل ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی وہ آج۔ کبھی کبھی اچانک گھبرا اٹھتی تھی۔ نہیں اچانک نہیں۔ جب کہیں سے کسی دھماکے کی آواز آتی۔ اور آواز تھی کہ بار بار آ جاتی۔

ادھر رات تھی کہ طویل ہوئی جاتی تھی۔ اگر صبح ہو جاتی تو وہ تنویر خالہ کے وہاں فون کر کے خیریت معلوم کرتی ان کی۔۔۔ سب کی۔۔۔ سب کی خیریت۔ اسے رہ رہ کر جانے کیسی محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سے خالی پن کا۔ ایک جان لیوا سی فکر کا۔ کون سی فکر تھی یہ۔ اسے ٹھیک سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ یاور سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ یا شاید۔۔۔ اگر یوسف سے کوئی بات۔۔۔ کوئی بات ہو پاتی۔۔۔ اگر۔۔۔ یاور سے بھی کوئی رابطہ نہ ہوا تھا کل سے۔۔۔ شاید یوسف نے تنویر خالہ سے کوئی بات کی ہو۔ کوئی پر امید بات

ہوتی تو اب تک۔۔۔

صبح تنویر بیگم کو معلوم ہوا کہ یوسف کل رات اپنے گھر نہیں گیا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے دو ایک جگہ اور فون کرنے کے بعد نکی کے یہاں فون کیا تھا کہ شاید کسی کو معلوم ہو۔۔۔ تو نکی کا سر زور سے چکرایا تھا۔۔۔

چلا جاؤں گا نکی باجی۔۔۔ دور چلا جاؤں گا۔۔۔ اتنا دور ہو جاؤں گا کہ۔۔۔ آپ۔۔۔ یوسف نے دبی دبی ہچکی لی تھی۔

نکی بے ہوش ہو چکی تھی۔

کئی روز ہو گئے تھے۔ یوسف کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کے والد کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس کی فربہ اندام ماں کا وزن آدھا ہو گیا تھا۔ اور اس کی تنویر چچی اپنی بھابی سے نظر نہ ملاتی تھی۔ اور یوسف کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی۔

نکی پتھر کی مورت سی طبی کالج جایا کرتی۔

جب دن مہینوں میں بدلے اور تین مہینے ہو گئے تب ایک دن یاور کو اپنے سکول کے باہر یوسف کھڑا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے یوسف بھائی۔۔۔" وہ رو پڑا۔ یوسف کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیوں چلے گئے تھے یوسف بھائی۔۔۔ اب تو نہیں جائیں گے نا۔ سب کو دکھی کر دیا آپ نے۔۔۔ ہم سب مر جائیں گے آپ کے بغیر۔ مت جائیے گا اب کبھی بھی۔"

وہ یوسف کی درمیانی پسلی تک آتا تھا۔ اس کے سینے کے ساتھ سر ٹکائے کمر میں باہیں ڈالے بولتا رہا۔ اور یوسف جو اُسے جانے کیا

کیا کہنے آیا تھا، ایک ہاتھ سے اسے لپٹائے اور دوسرے سے اس کا سر سہلاتا رہا۔

"میں گھر سے ہی آ رہا ہوں۔ صبح آیا تھا۔۔۔ سب خیریت ہے نا۔۔۔ ادھر۔"

"ہاں۔۔۔ ادھر۔۔۔ بڑی خالہ کے وہاں نا؟" اس نے یوسف کی آنکھوں سے مشابہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا، تو یوسف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نکی باجی بالکل ادھ موئی سی ہوگئی ہیں۔ان کا Face پیلا ہو گیا ہے۔۔۔وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتیں اب تو۔۔۔''

مسہری پر اوندھی، اپنی بیاض پر جھکی نکی کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب یاور آ کر اس کے پلنگ کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔

رستہ بھول گئیں خوشیاں ڈھونڈوں جا کر کس رستے

یاور نے ایک صفحے پر نظر ڈالی۔ بیچاری نکی باجی۔۔۔

تیری دو آنکھوں کی راحت جو گئی

زندگی میری مصیبت ہو گئی

''نکی باجی۔۔۔''

نیلی نیلی دو آنکھیں پلنگ کے بان پر ناک ٹکائے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''کیسی ہیں نکی باجی؟'' یاور نے چہرہ اوپر کیا۔ پل بھر کو نکی کا دل جیسے حلق میں اچھل آیا تھا۔ سال بھر پہلے تک یوسف ایسا ہی لگا کرتا تھا۔ اس نے گلے کے قریب ہاتھ رکھ کر گویا زخمی طائر سے پھڑکتے دل کو سنبھالا۔

''کیسا ہے میرا پیارا سا چھوٹا سا دوست۔میرا بھیا؟'' اس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور یاور کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''بہت خوش ہوں نکی باجی۔۔۔میں۔۔۔'' خوشی اُس کی معصوم سی آواز سے چھلکی پڑتی تھی۔ نکی بیقرار آنکھوں سے اس کے چہرے کے تاثرات میں اپنے سوالات کا جواب مانگنے لگی تو اس نے کتابوں کے بیگ میں رکھے پینسل باکس میں سے ایک پرچی نکال کر نکی کے حوالے کی۔

وہ دونوں پہاڑی کے دامن میں کئی بارہ دریوں پر مشتمل باغ کے بالائی باغیچے کے کونے میں بیٹھے تھے۔ صدیوں پہلے مغل شہزادے دارا شکوہ نے ستاروں کی گردش جاننے کے لیے جھیل ڈل کے کنارے کوہِ زبرون پر یہ مشاہدہ گاہ بنوائی تھی کہ اُسے علم نجوم سے خاصا

شغف تھا۔ باغ کا نام پری محل رکھا گیا تھا۔

بیشمار پھولوں سے سجے ان باغیچوں سے جھیل کا منظر نہایت دل فریب معلوم ہوتا تھا۔ جھیل کے کنارے واقع مغل باغات کی سیر کرنے والوں کی تعداد شام کو بڑھ جایا کرتی تھی، لیکن ادھر اب ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کرتا۔ نیچے کنارے پر رنگ برنگی چھوٹی کشتیوں کی قطاریں سونی تھیں۔ یہ کشتیاں شکارے کہلاتی تھیں اور وادی کے اچھے دنوں میں سیاحت کی مصروف ترین آماجگاہ ہوتیں۔ بڑے بڑے گل بوٹوں والی نشست گاہوں اور خوش رنگ ریشمی پردوں والی ان کشتیوں کو کنارے باندھ، ناخدا جانے کہاں چلے گئے تھے۔ حالانکہ بہار شباب پر تھی۔ دور بیچ جھیل کے ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی کشتی جس کی لکڑی کا سارا رنگ پانی نے پی لیا تھا، دوسرے کنارے کی طرف آہستہ خرامی سے رواں تھی۔ ''کہاں تھے۔۔۔تم؟'' نکی نے اسے کئی لمحوں تک بغور دیکھا۔ وہ ایک دم بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ اس نے داڑھی بڑھا رکھی تھی۔ گھٹنوں سے نیچے تک لمبے کرتے کے اوپری کھلے بٹن میں سے سینے میں اُگے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور گھنگھریالے بال پہلے کی ہی طرح داہنے ابرو تک آتے تھے، جن کے پیچھے نیلی نیلی آنکھیں جیسے دو جہاں کی فکر میں غلطاں تھیں۔

''تم میرے ساتھ چلو گی انیقہ۔۔۔؟'' یوسف کی آنکھیں یکا یک جیسے باغی ہو گئیں تھیں۔ اس کے طرزِ تخاطب پر نکی چونکی نہیں تھی۔

''کہاں۔۔۔؟'' چھوٹے سے پھاٹک کے قریب لگے سونف کے پودے ہوا کے جھونکے سے لہرائے۔ ایک دلربا سی مہک پھیل گئی۔

''یہ ہی ایک راستہ ہے۔۔۔ ورنہ۔۔۔ کوئی آپ کو کیوں مجھے سونپے گا۔۔۔ ہاں نہیں کریں گی نکی باجی تو۔۔۔ تو خدا کی قسم۔۔۔ خدا کی قسم۔۔۔'' وہ پل بھر میں پہلے کی طرح اداس اور مجبور سا ہو گیا۔ آنسو بھر آئے۔

''نہیں یوسف۔۔نہیں۔۔'' اس کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ نکی اسے دیکھتی رہی۔

''ایسا مت کرو۔۔۔ایسا نہ کہو۔۔۔یہ کیسے ممکن ہوگا۔۔۔یہ کیونکر ہوگا۔۔۔؟''

''کیوں نہیں ہوگا نکی باجی۔۔۔'' اس نے نکی کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دیا۔

لمبی سفید دم والی ایک سیاہ چڑیا سامنے زرد گلابوں کی کیاری پر آ بیٹھی اور منقار آسمان کی جانب اٹھا کر زور سے چہچہائی۔ یوسف نے نظر دوڑا کر چڑیا کی طرف دیکھا۔نکی نے بھی چونک کر اُدھر دیکھا تھا۔دونوں مسکرا دیئے۔

''ہم ایسے ہی ہمیشہ ساتھ ہنس سکتے ہیں نکی باجی۔۔۔ مان جائیے نا۔۔۔ میں آپ کی تعلیم ضایع نہیں ہونے دوں گا۔خود بھی کوئی اچھا کام

کروں گا۔۔۔ اب بھی وقت ہے نکی باجی۔۔۔ میرے دوستوں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔۔۔ہم نکاح کر لیں گے۔پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیگا۔۔۔ورنہ بعد میں کبھی ایسا موقع نہیں آئیگا۔۔۔ابھی بھی ہاں کر دیجیے نکی باجی۔۔۔''

نکی اپنے گھٹنوں کو باہوں کے حلقے میں لیے بیٹھی اپنے پاؤں دیکھتی رہی۔

''میں تمھیں دنیا کی ہر خوشی دوں گا۔اپنا سب کچھ تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا۔۔۔ہمارا چھوٹا سا۔۔۔گھر ہوگا۔۔۔تم ہمیشہ

مسکراتی رہوگی۔۔۔کوئی تمہاری ماں کی طرح تم پر بندشیں نہیں ڈالیگا۔۔۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ اور سر جھکا کر نکی کے پیروں کو دیکھتا رہا۔ پرندے چہچہاتے رہے۔سونف کی خوشبو ہواؤں میں گھلتی رہی۔نکی چپکے چپکے روتی رہی۔دو ایک آنسو اس کے پاؤں پر گرے۔یوسف نے انھیں ہاتھ سے پونچھ لیا۔

''کیا ہوا۔۔۔نکی باجی۔۔۔'' وہ تھکی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''میں۔۔۔ جانتا تھا۔۔۔ آپ میرا ساتھ۔۔۔ میرا ساتھ۔۔۔نہیں دیں گی۔۔۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔وہ آواز کی لرزش قابو میں رکھ کر بولتا ہوا موٹر سائیکل تک آ گیا۔ سامنے جھیل میں سورج نے غوطہ لگایا اور ڈوب گیا۔آسمان کا وہ کنارہ اُس وقت تک دہکتے انگارے سا سرخ رہا جب تک موٹر سائیکل نیچے سڑک کے موڑ تک آ گئی کہ یوسف

سامنے دیکھ رہا تھا اور نکی کی نظروں کے سامنے سڑک ختم ہونے تک آسمان ویسا ہی سلگتا سلگتا سارہا۔ کبھی کبھی منظر دھندلا جاتا مگر آنسو ٹپک جاتے تو سب صاف نظر آنے لگتا۔

نکی کے گھر کو مڑنے والی گلی کے موڑ پر یوسف نے لبِ سڑک موٹر سائیکل روک دی اور دونوں پاؤں زمین پر ٹکائے موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا۔ ''آنکھوں سے۔۔۔اوجھل مت ہونا۔۔۔یوسف۔۔۔'' نکی کی آواز کانپتی رہی۔ ہچکیاں گھٹتی رہیں۔

''اپنے فیصلے پر آپ تمام عمر پچھتائیں گی نکی باجی۔'' اس کی آنکھوں میں موت کی سی سردمہری تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کردی۔ نکی نے ہنڈل پکڑے ہوئے اُس کے ہاتھ پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کی آنکھوں کو خوفزدہ سی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھوں کی گرفت اس کے ہاتھ پر مضبوط کردی۔

''ایسا مت کرنا۔''

وہ سراپا التجا بن گئی۔

یوسف اسے کچھ لمحوں تک چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک رنجیدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔۔۔اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔ نکی موڑ پر پتھر کی مورت سی کھڑی اسے دور ہوتا دیکھتی رہی۔

''پکارتی ہوں میں تجھ کو مرے یوسف آجا''

رخساروں پر دو تازہ آنسو ڈھلک آئے۔ دو آنکھیں سڑک کے موڑ پر رکھ کر وہ گھر کی جانب مڑ گئی۔

ان دنوں حالات اور بکھر گئے تھے۔ وادی اور اداس ہوگئی تھی۔ گھروں میں افراد کم ہو گئے تھے۔ دل رنجیدہ رہا کرتے تھے۔ گھروں سے کام کی خاطر نکلنے والوں کے شام کو لوٹنے تک گھر میں رہنے والے وسوسوں میں گھرے رہتے۔

سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ یوسف کی کوئی خبر نہ تھی۔ اس کی ماں کا دل کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی پُر اُمید۔ یہ دل اُسے دن میں کئی کئی بار مارتا اور زندہ کرتا تھا۔

اُس کے باپ کو دل کا دوسرا دورہ پڑ چکا تھا۔

جس دن پڑوس کے کسی لڑکے کی پہچان کے ایک آدمی نے بتایا کہ یوسف زندہ ہے مگر دور سرحد کے اس پار۔۔۔اس دن اس کی ماں سارا دن صرف روتی رہی تھی۔

''میرا بیٹا زندہ ہے۔۔۔مگر موت کی ٹریننگ لے رہا ہے۔''

جانے کتنی دفع اس نے یہ جملہ اپنے آپ سے دہرایا تھا۔ مگر دل کے مریض شوہر کے سامنے صرف آہیں بھر کر رہ جاتی۔

'ہم سے دور ہی سہی۔۔۔ زندہ تو ہے۔۔۔کبھی نہ کبھی لوٹ آئیگا ہمارے پاس۔۔۔آخر ہمارا بچہ ہے۔۔۔ہمارا خون ہے۔۔۔'' وہ شوہر کو تسلی دیا کرتی۔

خزاں کی آمد نے چناروں میں آگ لگا رکھی تھی۔

نکی کے گھر کے پچھواڑے باہری دیوار کے اس پار کنجڑوں کی کھیتیاں تھیں جن میں کئی طرح کی سبزیاں لہلہایا کرتی تھیں، مگر ان دنوں وہاں صرف کڑم کا لمبی ڈنڈیوں والا ساگ اُگا ہوا تھا جس کے بڑے بڑے پتے چنار کے درخت کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اکتوبر کے چاند کی بھیگی ہوئی چاندنی میں نکھرے نکھرے سے نظر آرہے تھے۔

چاندنی کو اپنی مسہری کے کنارے تک آتا دیکھ نکی اٹھ کر کھڑکی تک چلی آئی۔ کچھ لمحے وہاں کھڑی رہ کر واپس بستر پر لیٹ گئی۔ وہ آج بھی سو نہیں پا رہی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ تاریکی میں آنکھیں کھولے چھت کو ٹکٹکی باندھ دیکھتی رہی۔ آنسو اس کے کانوں میں جمع ہوتے رہے۔ اس کی اکثر راتیں آدھی سے بھی زیادہ بے خواب گزر جاتیں۔

پاس کی تپائی پر پڑے فون کی گھنٹی بجی۔ لمبی دوری سے بجنے والی لمبی گھنٹی۔ نکی نے لپک کر ریسور اٹھایا کہ گھر میں کسی کی نیند نہ خراب ہو۔

کون ہوگا اتنی رات گئے۔۔۔

''نکی باجی۔۔۔۔'' اس کی باریک سی ہیلو کے جواب میں آواز آئی۔ دل سینے میں ایسے دھڑکا جیسے مردہ بدن میں کسی نے اسی لمحے روح پھونک دی ہو۔۔۔۔۔۔اس کا ہاتھ

بے اختیار حلق پر چلا گیا۔

''یوسف۔۔۔''اس کی آواز کانپی۔''کہاں ہو یوسف؟''وہ رو پڑی۔

''مجھے جیتے جی مار کر تم۔۔۔تم کہاں چھپ گئے یوسف۔۔۔کب آؤ گے۔۔۔ کہاں سے بول۔۔۔''وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''میں مرا نہیں نکی باجی۔۔۔زخمی ہو کر نامراد پڑا رہا۔۔۔مرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اس وقت سمندر پار ہوں۔۔۔''

''تم آجاؤ یوسف۔۔۔میں بھی نیم مردہ ہوں۔۔۔ساتھ مریں گے دونوں۔''

''میرا وہاں آنا۔۔۔ناممکن ہے۔۔۔میرے پاس پاسپورٹ کہاں ہے وہاں کا۔ جہاں کے پاسپورٹ سے یہاں آیا ہوں۔۔۔وہ بھی مجھے کہاں چھوڑیں گے۔۔۔''

''کیوں کیا تم نے ایسا یوسف۔۔۔تم مجھے کس قصور کی سزا دے رہے ہو۔۔۔ اپنے والدین کو کیوں دکھ دے رہے ہو۔۔۔لوٹ آؤ یوسف۔۔۔''

''نہیں نکی باجی۔۔۔ برف باری کے وقت آنے میں پکڑا نہ گیا تو روپوش تو رہنا پڑیگا۔۔۔سب کی زندگی خطرے میں کیسے ڈال دوں۔۔۔یہ ممکن ہی نہیں ہوگا۔''

''آ کر Surrender کرلو یوسف۔۔۔یہ غلط راستہ کیوں کرچن لیا تم۔۔۔''

''چپ۔۔۔ یہ لفظ دوبارہ کبھی مت دہرائیگا۔۔۔یہیں پر ختم کر دیا جاؤں گا۔۔۔شہادت کا موقع نہیں ملیگا مجھے۔۔۔آپ نہیں جانتیں۔۔۔''

''یہ کوئی شہادت ہے یوسف۔۔۔تم تو اتنے ذہین تھے۔۔۔ اتنے سمجھدار تھے۔۔۔یہ تمھیں کیا ہو گیا۔۔۔ہے۔۔۔تم۔۔۔''

''بس کیجیے نکی باجی۔۔۔ہمیشہ آپ مجھے اپنے Student کی طرح اپنی مرضی کی باتیں سمجھاتی آرہی ہیں۔۔۔اب میں۔۔۔''

''میری مرضی۔۔۔میری۔۔۔مرضی۔۔۔میری کون سی مرضی رہی ہے۔۔۔ کیسی مرضی۔۔۔''آنکھوں میں نئے نئے آنسو بھر آنے سے اُس کی ناک بندسی ہو گئی تو

آواز بھیگ گئی۔

"sorry نکی باجی۔۔۔دل نہیں دُکھانا چاہتا تھا آپ کا۔۔۔معاف کر دیجئے مجھے۔۔۔معاف کر دیجئے۔۔۔" اس کی آواز بھی رندھ گئی۔ اور فون بند ہو گیا۔

نکی نے فون کان سے ہٹا کر رخسار سے لگا لیا۔

کتنے عرصے کے بعد اس نے یوسف کی آواز سنی تھی۔

فون رکھ کر وہ کھڑکی کے قریب آ گئی چوکھٹ پر ہاتھ دھر کر چاند کو دیکھتی رہی اور پھر کہیں کہیں دور دور نظر آتے تاروں کو۔

شاید فون کٹ گیا ہو۔۔۔اور پھر گھنٹی بج جائے۔۔۔اس انتظار میں وہ رات بھر نہیں سوئی۔ سحر تک بھی نہیں۔

کچھ مہینے اور گزر گئے۔ نکی اس کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ گھر کے راستے میں آنے والے قبرستان میں نرگس کے پودے کئی بار زمیں سے اونچے ہوئے، پھولے اور مرجھائے۔ فون نہیں آیا۔ راتوں کو برہا کے گیت لکھ لکھ کر اُس نے بیاضیں بھر دیں۔

ہر روز کالج سے لوٹتے وقت قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس کی رفتار سست ہو جایا کرتی۔ نظریں اس طرف اٹھ جاتیں۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ قبرستان کی دیوار کے چھوٹے سے دروازے کی جگہ بڑا سا پھاٹک لگایا گیا ہے۔

"اِنا للہ وانا الیہ راجعون"

پھاٹک کی ہری محراب پر سیاہ رنگ کی عبارت نے اس کی نظریں جکڑ لیں۔ کچھ لمحے وہ عبارت کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے قدم پھاٹک کے درمیان لگے چھوٹے سے کواڑ کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ ڈھلان اتر کر منڈیر سے جا لگی۔ سامنے دور تک پھیلے ہوئے قبرستان میں بے شمار قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ نئے کتبے کھڑے تھے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

اگراس وقت ۔۔۔کوئی ہم پر بندوق تان دے ۔۔۔تو کیا ہمیں بھاگنا چاہیے نکی باجی ۔۔۔کسی نے دھیرے سے کہا۔

بند آنکھوں سے نکل کر آنسو نکی کے رخساروں پر پھسل گئے۔

نہیں ۔۔۔نہیں یوسف ۔۔۔تم مجھ سے دور بھاگ گئے ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں کہاں بھاگ سکتی ہوں ۔۔۔میں کہاں جاسکتی ہو۔۔۔میں کہاں جاؤں ۔۔۔یوسف ۔۔۔

نکی چپکے چپکے سسکنے لگی۔خوب رو لینے کے بعد جب جی کچھ ہلکا ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔نرگس کے پھولوں میں ایستادہ کتبوں پر نام اور تاریخِ پیدائش کے ساتھ تاریخِ انتقال درج تھے۔

نصیر احمد ملک: تاریخِ پیدائش:۹ستمبر ۱۹۷۰ء

وفات:۶ فروری ۱۹۹۲ء

محمد راشد میر: تاریخ پیدائش:۵ جون ۱۹۷۲ء

وفات: یکم جولائی ۱۹۹۳ء

وہ دہشت زدہ سی منڈیر سے لگی بیٹھی دور دیوار تک پھیلے کتبے پڑھتی رہی۔اس کے چہرے پر کرب اتر آیا۔ہونٹ دانتوں میں بھینچے سسکیاں لیتے ہوئے اس نے منہ دوسری جانب موڑا تو ایک بالکل تازہ تربت پر سیاہ سنگ مرمر سے تراشی لوحِ مزار نئی بہار کی نکھری ہوئی ٹھنڈی دھوپ میں چمک رہی تھی۔قبرستان کے کناروں پر لگے بید کے درخت اُس پر بار بار سایہ کیے دیتے تھے۔

یوسف احمد خان پیدائش:۱۱مارچ ۱۹۷۳ء

وفات:۲جون ۱۹۹۳ء

''نہیں ۔۔۔''اس کا ہاتھ بیاختیار اس کے ہونٹوں پر چلا گیا۔دوسرا ہاتھ اس نے اپنے حلق پر رکھ دیا۔۔۔دبی دبی سی چیخ اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر

لیں۔ اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گلے کو اُس نے انگلیوں سے ایسے تھام رکھا تھا جیسے اُس کی جان اُسی راستے نکل بھاگنے والی ہو۔

یہ نہیں ہوگا۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔ یہ نہیں ہوگا۔۔۔اس نے تڑپ کر آسمان کی جانب نگاہیں اٹھائیں اور سر پیچھے منڈیر پر اگی ہری ہری نم گھاس سے ٹکا دیا۔ نیلا نیلا آسمان بے داغ نظر آرہا تھا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر چہرہ بھگوتے رہے۔ دیوار سے ملحقہ مسجد میں بجلی نہ ہونے کے باعث بغیر لاؤڈ سپیکر کی پر دردسی اذان گونجا کی۔

بید کی ٹہنیوں میں لوٹ آنے والی چڑیوں نے جب چہک چہک کر آسمان سر پر اٹھا لیا تو نکی نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر تھکے ہوئے پپوٹوں سے لگے آنسو جذب کر لیے۔ اور کھڑا ہونے سے پہلے ایک نظر پھر بائیں جانب دیکھا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ اس کے گلے کے قریب چلا گیا۔ وہاں کوئی تازہ قبر تھی نہ کتبہ۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اُسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

پھر۔۔۔۔ مہینے سالوں میں بدلنے لگے ایک دن کسی نے یوسف کی والدہ کو فون کر کے بتایا کہ آج شب کے ایک بجے یوسف ان سے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ رابطہ قائم کرے گا۔

''ہمارا بیٹا زندہ ہے سلامت ہے۔۔۔'' اس کی ماں نے یہ خوش خبری گھر میں سب کو فرداً فرداً سنائی۔ اس دن وہ سارا وقت لوریاں گاتی رہی، اور رہ رہ کر اس کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔

کمپیوٹر کے مانیٹر پر اس کے بیٹے کی تصویر ابھری تو وہ پہچان ہی نہ پائی۔ اس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ داڑھی گریبان تک بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں نیم واسی تھیں اور جب اس نے والدین کو مخاطب کیا تو اس کی آواز بھی تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی۔

''آجاؤ۔۔۔ چاند۔۔۔ گھر آجاؤ۔۔۔'' ماں نے مانیٹر پر نظر آرہے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور رو پڑی۔

''تمہاری ماں۔۔۔مرجائے گی بیٹا۔۔۔'' باپ کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ابو امی بیمار ہیں یوسف۔۔۔تمہارے بغیر گھر بالکل تباہ ہو گیا ہے۔۔۔ تمہارے بغیر کسی کا جی نہیں لگتا۔۔۔'' بہن سسکیاں لینے لگی۔

''اس طرح کی باتوں سے میرا ایمان کمزور کرنے کی کوشش نہ کریں آپ لوگ۔۔۔بس دعا کریں کہ میں جام شہادت نوش کروں۔۔۔اور آپ سب کے لیے جنت کے دروازے وا کروں۔۔۔''

اس کی آواز میں عزم جھلک رہا تھا مگر چہرے پر غم کے سائے سے لہرا جاتے۔

''کسی طرح کچھ دن کے لیے آ جاؤ۔۔۔یہ سب صحیح نہیں میرے لعل۔۔۔میں تمھیں سمجھا دوں گی۔کچھ دن کے لیے آ جاؤ۔۔۔تمھیں سینے سے لگانے کے لیے میرا۔۔۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔۔۔'' ماں روتی رہی۔

''میرے جنازے کو کندھا دینے۔۔۔کندھا دینے ہی آ جا۔۔۔میرے بچے۔۔۔'' باپ بے بسی سے بولا۔

''اب جنت میں ملاقات ہونے کی دعا مانگئے ابو۔۔۔امّی بزدلوں والی باتیں مت کیجئے۔۔۔'' یوسف کی آواز میں یاسیت شامل ہوگئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔کس نے بھٹکا دیا تم کو۔۔۔میرے بیٹے۔۔۔ہمارے پاس کبھی جی بھر کے بیٹھتے۔۔۔بات کرتے ہمارے ساتھ۔۔۔تو ہم تمھیں سمجھاتے تو۔''

''اف ابو۔۔۔پھر وہی نصیحتیں۔۔۔پھر آپ۔۔۔میری بات کبھی سمجھیں گے۔ کبھی آپ ابو۔۔۔کبھی نہیں۔۔۔اچھا کچھ دن بعد پھر Contact کروں گا میں۔۔۔''

اس کے چہرے پر کرب اتر آیا تھا۔مانٹیر کا Screen کورا ہو گیا۔

کاش وہ ایک جھلک دیکھ پاتی۔یاور سے ویڈیو کانفرنسنگ کی بات سن کر نکی کے دل میں حسرت جاگی اور سو گئی۔

کچھ دن بعد یہ بات بھی پرانی ہو گئی اور ہوتی چلی گئی۔یوسف کی کوئی خبر نہ آئی۔

ایک برس اور بیت گیا۔

یاور نے آ کر نکی کو بتایا کہ یوسف کے والد اب زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ اور کچھ بہتر ہوتے ہی یوسف کی ماں انھیں حج پر لے جائیگی۔

یوسف کے والدین فریض حج ادا کرنے کے بعد کسی دوسرے شہر چلے گئے اور کوئی دو ماہ بعد لوٹے۔

انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ برسوں کی عمر جی کر لوٹے ہوں۔ نہایت ضعیف اور۔۔۔ بیمار۔۔۔ اور دوسرے ہی دن، دل کا تیسرا دورہ پڑنے سے یوسف کے والد انتقال کر گئے۔

یوسف کی ماں کے آنسو نہیں بہے تھے۔

وہ اب اکثر اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

اب وہ ٹیلیفون کی گھنٹی پر چونکتی بھی نہیں تھی۔

بہت پہلے جب یوسف زخمی ہوا تھا تو اس کی ناک سے کئی دن خون بہتا رہا تھا۔ وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کسی دھماکے کے دوران کہیں سے کوئی چیز اس کے ابرو پر آ لگی تھی۔ جب سے ہی اس کے سر میں شدید درد رہتا تھا۔ ساتھی اس کے سر پر کس کے گمچھا باندھ دیتے۔ درد دور کرنے کی گولیاں بے شمار کھانا پڑتیں۔ پہلے پہل درد اٹھنے کے درمیانی وقفے طویل ہوا کرتے جو رفتہ رفتہ مختصر ہونے لگے اور اب یہ عالم تھا کہ آدھ پون گھنٹے کے وقفے سے درد اٹھتا اور چھ، آٹھ گھنٹے رہا کرتا۔

حج کے دوران یوسف نے اپنے والدین سے رابطہ قائم کیا تھا۔

دوسرے شہر میں ملاقات طے ہوئی اور برسوں بعد انھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا جو بیحد کمزور لگ رہا تھا۔ مگر والدین کو دیکھ کر مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

دوسرے دن سمندر کے اوپر بہت سے بادل ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔

جیسے بادلوں کا پہاڑ راستہ بھٹک گیا ہو۔ جزیرے پر تعمیر ہوٹل کی کثیر منزلہ عمارت کے کسی اوپری سویٹ کی بالکنی میں وہ تینوں بیٹھے تھے۔ یوسف کو ہفتے بھر بعد ٹھکانے پر لوٹ جانا تھا۔ والدین کا ویزا ابھی ختم ہونے والا تھا۔

اس دن یوسف کے والد بے حد پرسکون لگ رہے تھے۔ ان کی نظریں بیٹے کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ بیٹا ان کی بات مان لیگا اور وہ اسے واپس لے آنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے کیونکہ اس نے ماں باپ کی کسی بات کے جواب میں کوئی ضد نہیں کی تھی۔ خاموش سنتا رہا تھا۔

یہ باتیں یوسف کی بہن نے یاور کو بتائیں تھیں۔۔۔ مگر بہت دن بعد۔

جب خود اسے اس کی ماں نے بتایا تھا۔۔۔

بہت دن بعد۔ جب اُس کی ماں کے سپاٹ چہرے پر کچھ تاثرات ابھرنے لگے تھے۔۔۔

بہت دن بعد۔ جب اس کی ماں رونے اور بات کرنے لگی تھی۔

اس دن ماں کی گود میں سر رکھے بادلوں کو دیکھتے ہوئے اس کے سر میں درد اٹھا تھا۔ جو کسی طرح کم ہونے میں نہ آیا اور پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہوتا چلا گیا۔

ایکسرے سے نظر آیا کہ اس کے دماغ کی باہری جانب کے سیّال مادے میں بائیں آنکھ کے بالکل سیدھ میں کوئی انچ بھر لمبی اور آدھ انچ نصف قطر کی کوئی چیز پڑی ہے۔ .IR..M سے پتہ چلا کہ وہ ایک گولی ہے جو بہت پہلے آنکھ کے اندرونی کونے سے گھس کر نہ جانے کس طرح بغیر آنکھ کی پتلی سے لگے، سر میں بیٹھ گئی تھی۔ اب سرجری کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی۔۔۔ مگر یوسف کو ہوش نہ آیا۔

کچھ دن 'کوما' میں رہ کر یوسف موت سے ہم آغوش ہو گیا۔

دیارِ غیر میں اسے سپردِ خاک کر کے اس کے والدین لوٹ آئے تھے۔ نکی کے گھر

کے راستے میں پڑنے والے قبرستان میں کسی نئی میت کے لیے اب کوئی جگہ نہیں بچی ہے۔
اس کی دیواریں خستہ ہوکر کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ بہار کی آمد پر سڑک پر
چلتے وقت بغیر منڈیر تک جائے۔نرگس کے پھول آسانی سے نظر آجاتے ہیں۔۔۔
وہاں سے گزرتے وقت نکی کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ جاتی ہے۔اس کی نظریں بید
کے درختوں سے ہوتی ہوئی قبرستان کے سارے
احاطے میں بھٹکتی رہتی ہیں۔گو کہ یوسف کی تربت ادھر نہیں ہے۔۔۔ پھر
بھی۔۔۔۔

یمبر زل

عرفان رشید

ترنم ریاض کا کینوس موضوع کے لحاظ سے ریاست کے باقی قلمکاروں سے قدرے مختلف ہیں انہوں نے ریاست کے مقامی موضوعات کے ساتھ ساتھ برصغیر میں آئے روز حالات و واقعات کو اپنے افسانوں کی زینت بنانے کی عمیق کوشش کی ہے۔ ریاست کے تعلق سے ان کا بہترین افسانہ ''یمبر زل'' افسانوی مجموعہ ''میرا رخت سفر'' (۲۰۰۸ء) میں شامل ہیں۔حالانکہ افسانہ طویل ہے لیکن انہوں نے اسے ایک بہترین ڈکشن اور اسلوب کے تحت بوریت سے بچائے رکھا اور قاری کے تسلسل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو اس افسانے کی سب سے عمدہ خصوصیت ہے۔افسانہ ۳۴ صفحات پر شامل ہے۔ نکی باجی، یوسف اور یا ور اس افسانے کے بنیادی کردار یعنی Main Characters کے طور پر سامنے آجاتے ہیں۔افسانے کا موضوع ''یمبر زل'' اپنے آپ میں ایک علامت ایک استعارہ ہے۔لفظ یمبر زل اصل میں کشمیری لفظ ہے جسے اردو میں ''نرگس'' کے مترادف ٹھہراتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ''نرگس'' قبرستان کی زینت ہے جسے مرنے والے کی روح کو آرام پہنچتا ہے یہاں پر لفظ ''نرگس'' کثیر المعنویت میں لیا جا سکتا ہے ''نرگس'' خوشی اور غم کی علامت ہے، ''نرگس''، معصوموں کا استعارہ ہے، ''نرگس'' ماتم اور موت کی علامت ہے یعنی یہاں پر ہم اسے کسی مخصوص معنی یا مفہوم میں قید نہیں کر سکتے ہیں۔

''یمبرزل'' افسانے کا محور و مرکز کشمیر ہے یہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات و واقعات کا برملا اظہار پہلی ہی قراءت میں سامنے آجاتی ہے۔ بظاہر کہانی تین بچوں کی اسکولی زندگی کے اردگرد رقصاں ہیں لیکن اس کے پس پشت میں ایک تاریخ رقم کی گئی ہیں۔ ترنم ریاض نے کشمیر کے دورِ عطیق کے سیاسی پس منظر کو نہایت ہی عمیق انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کی قرات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ کو کشمیر ہسٹری پر گہری نظر ہے۔ انہوں نے یہاں کے سیاسی ادوار کو اس واضح اور پر کیف پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاری کے سامنے کشمیر پولیٹکس کا نقشہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

''اس خطے کے ساتھ سولہویں صدی سے ہی یہ سلسلہ ہو گیا تھا۔ چندر گپت موریہ اور پھر اشوک کے مہان ہندوستان کو افغانستان اور نیپال کی آخری سرحدوں تک وسیع کرنے والی عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ کے شہنشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا، جس شاعرہ معروف و مقبول اور ہر دل عزیز ملکۂ کشمیر زُون، یعنی چودھویں کا چاند ملقب حبہ خاتون کے شوہر بادشاہ یوسف شاہِ چک کو اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کر لیا تھا۔ شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کر گیا۔ وطن کی مٹی بھی اسے نصیب نہیں ہوئی۔۔ اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہو گئی۔۔۔ پھر افغان سے افغان آئے۔۔۔ کشمیری۔۔۔ محکوم ہی رہے۔۔ صدیوں سے۔۔ اب کہیں آدھی صدی بھر پہلے جمہوریت آئی۔۔۔ تو۔۔۔ کچھ سکون کے بعد پھر یہ بے سکون شب و روز۔ کیوں۔ کیوں ہو رہا ہے یہ سب۔ کیوں۔۔''

(ص ۲۶۶۔۲۶۷)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مصنفہ نے بلیغ انداز میں کشمیر کے سیاسی ادوار کی عکاسی کی ہے اور کس طرح سے مختلف ممالک سے آئے ہوئے حکمرانوں نے یہاں کی معصوم اور مظلوم قوم کا استحصال کیا اور عصر حاضر میں بھی یہ اس قوم پر مظالم پر مظالم

برسائے جارہے ہیں اور یہ بیچاری اف تک بھی نہیں کرپارہی ہے۔یعنی روایت میں جس نویت کی سیاست یہاں جلوہ گرتھیں آج تک اسی کی بازگشت ہورہی ہے،صرف چنگیز بدل گئے قوائد وہی رہے۔

افسانے میں افسانہ نگار نے یہاں کے موجودہ منظرنامے کو پیش کیا ہے حالانکہ کہیں کہیں انہوں نے اس حسین وادی کے آبشاروں، لالہ زاروں ،ندی نالوں، پہاڑوں، عمارتوں، یہاں کے کلچر سے وابستہ نادر چیزوں کوایک نئے اور دلکش پیرائے اظہار کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن عصر حاضر کی بدلتی رخ کا منظرنامہ غالب موضوع بن جاتا ہے۔حالانکہ قاری پہلے صفحات پڑھنے کے بعد ایک الگ موضوع کی سیر کو نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا ذہن نئے معنی اخذ کرنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے یہ بھی اس افسانے کی کامیابی کا راز ہے۔یہاں کے تعلیمی نظام پر بھی اس افسانے میں طنز کے تیر برسائے گئے ہیں کہ کس طرح سے یہاں کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے جس میں سب سے زیادہ نقصان تعلیمی نظام کو اُٹھانا پڑتا ہے:

”کرفیولگا رہا تو کہیں ہمارے Exams اب Postpone ہی نہ ہوجائیں“۔

اس میں ایک ٹرم ”کرفیو“ کا استعمال ہوا ہے جس کی کشمیر کے یہاں اپنی ایک معنویت ہے۔یعنی اب بچوں کی نفسیات پر بھی اس ٹرم کا گہرا اثر ہو چکا ہے اور اب انہیں اس بات کا علم بخوبی ہے کہ ہڑتال، کرفیو، اور کشمیر بند کیا بلا ہیں۔اس وجہ سے ہمارے تعلیمی نظام پر کس نویت کا اثر پڑھ چکا ہے اور افسانہ نگار لوگوں کو باور کرانا چاہتی ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام دن بہ دن خراب ہوتا جارہا ہے اور کرفیو کا دوسرا رخ:

”ڈرائیور آگیا۔بازار ہوآئیں ذرا۔۔ابھی تین گھنٹے کرفیو نہیں لگے گا۔“(ص۲۵۶)

اس اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہاں کے مکین کن حالات سے گزر رہے

ہیں۔کرفیو کے سخت نظام میں لوگ کس طرح سے اپنی ضروریات پورا کرتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں ایک اہم مسلے کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کس طرح سے یہاں کے طلاب ان حالات میں امتحانات میں حصہ لیتے ہیں ان کے ذہنوں میں ایک عجیب وغریب ذہنی تناو ہمیشہ رقصاں رہتا ہے اور ان سب کے باوجود یہ بچے ہر امتحان میں حصہ بھی لیتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔سلیمان اطہر جاوید افسانہ ''یمبر زل'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض نے اپنے اردگرد کے حالات کی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔اس خصوص میں افسانہ ''یمبر زل'' غیر معمولی ہے۔دہشت گردی اور موت کی آہٹوں کے پس منظر میں۔امتحانات۔بچوں کے امتحانات کے لیے تیاری۔رشتے ناطے،امتحانات کے نتائج،مزید تعلیم کے منصابے، ترنم ریاض نے اس افسانے میں غیر معمولی فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترنم ریاض کے افسانے،افسانے نہیں لگتے۔معاشرے کی منہ بولتی تصویریں بن جاتے ہیں۔ان ہی تصویروں کے البم کے نام ہیں: ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گے''، ''یمبر زل'' اور دوسرے افسانے!۔''

(ص ۲۸۱)

ترنم ریاض نے اس افسانے میں جہاں ایک طرف کشمیر کی سیاسی حالات و واقعات کو بروئے کار لایا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے یہاں ہورہے ظلم و جبر کی نوحہ خوانی بھی کی ہے۔عجیب معاملہ یہ ہے کہ یہاں کے حالات کی زد میں یہاں کے شاپنگ مال اور بازار اب سویرے ہی بند ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں خدشہ رہتا ہے کہ کہیں دکانوں کی وجہ سے ان کی جان کو نقصان نہ پہنچے۔اسی طرح کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا طویل سڑک پر چلا جارہا تھا۔

راستے میں کہیں کہیں دکانیں تھیں جو بند ہو رہی تھی۔ابھی تو اندھیرا ابھی
نہیں ہوا۔تو پھر۔۔دُکانیں کیوں بند۔۔'' (ص۲۶۳)

حقیقت میں جس وادی کو فردوس کے لقب سے نوازا گیا تھا وہاں اب سانس لینا دشوار بن گیا ہے۔uncertainty نے اپنے بال و پر پھیلائے ہیں انسان خود کو بے یار و مدد گار تصور کرنے لگا۔موت کا سوداگر ہر وقت اور ہر دن کسی نہ کسی گلِ لالہ میں رقصاں نظر آتا ہے۔شام ہوتے ہوئے یہاں ہر طرف ماتمی ہوائیں چلتی ہیں ہر دن گولیوں اور ٹیر گیسوں کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔کسی کو مخبری اور کسی کو دہشت گردی کی لیبل لگائی جاتی ہیں اور کبھی شک کی بنیاد پر یہاں معصوموں کا قتل کیا جاتا ہے:

''کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔اندرون شہر، ہر گھر میں
چھاپے پڑتے تھے۔خطاوار دھماکے کر کے غائب ہو گئے تھے اور بے
گناہوں کو غالباً غلط مخبری کی وجہ سے دھڑ ادھڑ پکڑ کر کسی نامعلوم منزل کی
طرف لے جایا جا رہا تھا۔ہوسٹل سے چھٹیوں میں گھر لوٹے دو بھائیوں کو
ان کے والدین کے سامنے دہشت گردی کے الزام میں گولیاں ماردی گئی
تھیں۔غصے یا غلط فہمی یا کسی اور انجانی وجہ سے۔'' (ص۲۶۲)

کشمیر میں جن فنکاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے ان میں موصوفہ کا ڈکشن منفرد اور نرالا ہے۔موقعے اور محل کے اعتبار سے افسانے میں تشبیہات، استعارات، اور علامات کا استعمال کرتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریر ان کے ہم عصر تخلیق کاروں سے قدرے مختلف ہو جاتی ہے۔انہیں زبان و بیان پر ایک گہری نظر ہے، منظر نگاری، کردار نگاری اور پلاٹ پر انہیں قدرت حاصل ہے۔

☆☆☆

TARANNUM RIYAZ KE AFSANON KA TAJZIYATI MUTALA

Edited by

ZAHID ZAFAR

[illegible] کی شخصیت اور ان کی خلق کردہ ادبی کائینات دونوں ہی شعورِ تقدیس ہنر کا استعارہ تھیں۔ اس ہنرمندی کا [illegible] کی شاعری تک محدود کیا جا سکتا ہے، نہ صرف قصہ گوئی تک اور نہ ہی صرف دیدہ وری نقد تک۔ درد و داغ و [illegible] کی تمہید سے لے کر محاکمہ تک کا سفر ہی ان کا اختصاص تھا۔

پیشِ نظر کتاب ''ترنم ریاض کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' کی پیش کش وہ کارہائے مستحسن ہے کہ جس کے افادی پہلوؤں کو فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

کتاب کے مرتب زاہد ظفر کی خوش بختی ہے کہ یہ کام ان کے ادبی کارنامے کا حصہ بنا۔ زاہد ظفر [illegible] شاگرد اور ریسرچ اسکالر ہیں لیکن مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ انہوں نے ادب کی صالح قدر [illegible] ری کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے بغیر کسی احساس سود و زیاں کے پوری خودسپردگی کے ساتھ اپنے آپ کو وقفِ خدمتِ ادب [illegible] ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ انہیں قدم قدم فتح یابی اور سرافرازی عطا فرمائے۔

پروفیسر سید زین رامش

ترنم ریاض (مرحومہ) کے افسانے ایک گلشن کی مانند ہیں جہاں مختلف رنگ اور خوشبو کے پھول ہمیشہ کھلتے نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں محبت کی چاشنی ہے اور طنز و مزاح کے نشتر بھی ہیں۔

زاہد ظفر ایک قلم کار کی بحیثیت سے جموں و کشمیر کے ادبی نقشے پر نمودار ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی صلاحتیں ان کی تحریروں میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ (مرحومہ) ترنم ریاض کے تعلق سے ان کی مرتب کی گئی کتاب ''ترنم ریاض کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' ان کی ادبی پرواز کی عکاسی کرنے میں ایک نمایاں کردار نبھائے گی اور زاہد ظفر کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کا احساس بھی دلائے گی۔

نور شاہ

مجھے امید ہے کہ زاہد ظفر کی کتاب ''ترنم ریاض کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' ترنم ریاض کے افسانوں کی اہمیت دلانے میں ایک اہم کردار نبھانے میں کامیابی کی منزل کو چھوئے گی۔ زاہد ظفر ایک نوجوان تخلیق کار ہیں۔ وہ جس خلوص، لگن اور محبت سے اردو کے ادبی منظر پر اپنے فکر و فن کا احساس دلا رہے ہیں وہ ان کے روشن مستقبل کی جانب ایک واضح اشارہ ہے۔

وحشی سعید

GNK PUBLICATIONS

www.gnkpublications.com

Email : gnkpublications@gmail.com

Mob : 7006738304 Ph : 01951-295207

ISBN 978-93-91606-64-0

₹ 460.00